اردو (لازمی)

(بک ٹو)

کوڈ نمبر: ۳۶۴ | انٹرمیڈیٹ | یونٹ: ۱۔۹

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

کورس کوڈ 364

ایڈیشن اول 1989ء

اشاعت کا سال 2019ء

تعداد اشاعت 35000

قیمت .... =/175 روپے

نگران طباعت .... مینجمنٹ کمیٹی فار پی پی یو

طابع .... نیلاب پرنٹرز، راولپنڈی

ناشر .... علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

فہرست

صفحہ نمبر

کورس ٹیم

چیئرمین: .... ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر [انچارج شعبہ اردو]

تحریر:

.... ڈاکٹر صلاح الدین درویش [ایف جی کالج برائے طلبہ، ایچ۔۹، اسلام آباد]

.... شیراز بن عطا [ریسرچ اسکالر، شعبہ انگریزی، اسلامک انٹرنیشنل یونی ورسٹی، اسلام آباد]

.... امجد اقبال [شعبہ اردو، اسلام آباد ماڈل کالج، جی۔۱۰/۴، اسلام آباد]

.... ڈاکٹر نثار ترابی [شعبہ اردو، گورنمنٹ کامرس کالج، راول پنڈی]

.... گوہر رحمٰن نوید [شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، مردان]

.... ڈاکٹر عبداللہ ہاشمی [سابق ماہر مضمون، گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول، حسن ابدال]

فاصلاتی تشکیل/تدوین: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

رابطہ کار: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

پیش گفتار

اردو ہماری قومی اور تہذیبی زبان ہے۔ برِ صغیر پاک و ہند میں، یہ ہمارے ماضی کی نقیب بھی ہے اور ہمارے حال اور مستقبل کی علم بردار بھی۔ اس میں ہمارا دینی ادب بھی موجود ہے اور علمی و ادبی سرمایہ بھی۔ یہ زبان تحریکِ پاکستان کی منادبھی رہی ہے اور تخلیقِ پاکستان میں بھی اس کا کردار روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

آج یہ زبان ہمارے مابین رابطے کی ترجمان ہے؛ یہ محبت، رواداری اور یگانگت کی علامت ہے۔ اسے بولنا، پڑھنا اور سیکھنا اور اس میں لکھنا ہماری قومی اور تہذیبی امنگوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس کا احترام اور اس سے محبت دراصل نظریۂ پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلق اور رشتے کی مضبوطی کا استعارہ ہے۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو زبان اور ادب کی تدریس بھی درحقیقت انھیں احساسات اور جذبات کی ترجمانی سے عبارت ہے۔

کوئی بھی طالب علم چاہے وہ کسی بھی ڈسپلن سے متعلق ہو، اسے اپنی قومی زبان اور اس کے ادب سے آشنائی لازم ہے۔ سائنس کا شعبہ ہو یا آرٹس کا...... ادب ہمارے باطن میں انسانی جذبوں اور رویوں کی آبیاری کرتا ہے؛ یہ ہمیں زندگی کے مشکل اور نامساعد حالات میں جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ زندگی کے ادب آداب اور انسانی رویوں کو نکھارنے اور انھیں شائستگی سے ہم کنار کرنے میں ادب کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے عہد کو ادب آشنائی اور ادب دوستی کی جتنی ضرورت آج ہے، شاید ہی اس سے قبل رہی ہو، کیوں کہ دنیا کے بدلتے ہوئے منظرنامے میں محبت، امن اور رواداری کے ساتھ زندہ رہنے اور انسانوں کے درمیان آسانیاں بانٹنے ہی میں نوعِ انسان کی بقا پوشیدہ ہے اور اس پیغام کی ترسیل میں ادب بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

پیشِ نظر نصاب میں کلاسیکی اور جدید ادبیات سے مختلف اصنافِ ادب کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب جہاں ایک طرف امتحانی ضرورتیں پوری کرنے میں مدد و معاون ہے، وہیں اس کا مقصد آپ کو ادب کے بنیادی نقطۂ نظر سے بھی آگاہ کرنا ہے، غزلیں، نظمیں، افسانے، طنز و مزاح، شخصیت نگاری...... مختلف اصناف سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ایک اکائی میں

بندھے ہوئے ہیں اور وہ اکائی ہے: ادب......ادب اپنی ترسیل اور ابلاغ کے لیے کسی زبان ہی کا مرہونِ منت، ہوتا ہے......
اس کتاب میں شامل ادب کو آپ اردو زبان کی وساطت سے پڑھیں گے۔ اردو زبان اس وقت دنیا کی بڑی زبانوں میں سے
ایک ہے، اس کا ادب جہاں، اس کے شان دار ماضی کا گواہ ہے، وہاں یہ اس کے روشن اور تابناک مستقبل کا امین بھی ہے۔

پیش لفظ

اردو ہماری قومی اور تہذیبی، تدریسی اور دفتری زبان ہے۔ مختلف تعلیمی سطحوں پر اس کی تدریس قومی یک جہتی اور تہذیبی روایت کی پاسداری کی علامت ہے۔ تدریسی حوالے سے اردو زبان و ادب سے ہماری وابستگی نہ صرف ہمارے خیال کی تطہیر اور ترسیل کا ذریعہ ہے، بلکہ ہمارے شعور کی بیداری اور اس میں تنظیم و ترتیب کا باعث بھی ہے۔ تدریسی نظام میں، دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ زبان اور ادب کی تدریس اپنے اندر انسانی، تہذیبی اور قومی حوالے سے متنوع امکانات کی حامل ہوتی ہے، کیوں کہ اس (زبان) کے بغیر ہم کسی بھی علم اور فن کی تدریس اور تحصیل سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کے ادب کے بغیر ہمارے شخصی اور اجتماعی رویے خوبصورتی اور توازن سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو زبان و ادب کا یہ نصاب حکومتِ پاکستان کی نئی تعلیمی پالیسی (۲۰۰۶ء) کے عین مطابق ہے۔ یہ نصاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ بک ون اور دوسرا حصہ بک ٹو کے نام سے موسوم ہے۔ اس نصاب میں کلاسیکی ادب بھی شامل ہے اور جدید اور معاصر ادب کے انتخاب سے بھی اغماض نہیں برتا گیا۔ ادب کے ساتھ ساتھ قواعدِ زبان اور انشاء پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے، تاکہ طلبہ و طالبات:

۱۔ زبان کے بنیادی فکری و معنوی رویوں سے آگاہ ہو سکیں۔

۲۔ زبان کے ذریعے اپنے جذبات' خیالات اور تصورات کا خوبصورت اظہار کر سکیں۔

۳۔ زبان شناسی کا شعور حاصل کر سکیں۔

۴۔ زبان کے ذریعے ادب کی تفہیم کو ممکن بنا سکیں۔

۵۔ مختلف نثری اور شعری اصناف اور ان کے ادب کا مطالعہ کر سکیں۔

یہ نصاب فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت تین اجزاء پر مشتمل ہے:

۱۔ درسی کتاب

۲۔ ریڈیو پروگرام

۳۔ مطالعاتی مرکز

ان تینوں اجزاء کی باہمی یک جائی سے یہ نصاب اپنی تکمیلی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔ اس سے ان بنیادی مقاصد کے حصول میں آسانی ممکن ہوگی' جو اردو زبان اور اس کے ادب کی تدریس میں اساسی اہمیت اور افادیت کے حامل ہیں۔ طلبہ و طالبات کو چاہیے کہ جہاں وہ درسی کتاب کو محنت اور توجہ سے پڑھیں' وہیں ریڈیو پروگرام کو بھی باقاعدگی سے سنیں' تاکہ پڑھنے کے دوران میں اٹھنے والے سوالات' ریڈیو پروگرام کی سماعت سے حل ہو سکیں اور اگر ان دونوں اجزاء سے سوال کی تفہیم نہ ہو جائے تو پھر مطالعاتی مرکز میں استاد کی موجودگی یقیناً اس الجھن کی گرہ کشائی

میں مدد و معاون ہوگی......ان شاء اللہ یہ نصاب طلبہ و طالبات کی امتحانی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور فکری کشادگی میں اہم کردار ادا کرے گا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

رابطہ کار

یونٹ نمبر......۱۔۲

مضامین

تحریر: ڈاکٹر صلاح الدین درویش
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

فہرستِ مضامین

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس یونٹ میں آپ چھے مضامین کا مطالعہ کریں گے۔ یہ مضامین: مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر وزیر آغا کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان مضامین کا فکری اور علمی دائرۂ کار مختلف موضوعات کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے۔ بعض مضامین فکری، سماجی اور معاشرتی مسائل کو محیط ہیں اور بعض تاریخی شخصیات کے شخصی اور فکری رویوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کا مضمون خاص طور پر ہمارے نظریاتی اور فکری جذبوں کا اظہاریہ ہے۔ مولانا نے جس خوب صورت انداز میں فکرِ اقبال کے تناظر میں ملت اور وطنیت کے تصور کو اُجاگر کیا ہے، وہ قیام پاکستان کے بنیادی فلسفے کا ترجمان ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ اس کورس میں شامل مضمون نگاروں کے سوانحی کوائف اور ان کے ادبی مقام اور مرتبے سے متعارف ہوسکیں۔

۲۔ مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھے گئے ان مضامین کے بنیادی مفہوم سے روشناس ہوسکیں۔

۳۔ ان مضمون نگاروں کے اسلوبِ بیان سے آگاہ ہوسکیں۔

۱۔ مولانا محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۳۰ء میں دتی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی کا نام مولوی باقر علی تھا۔ معروف شاعر محمد ابراہیم ذوق ان کے دوست تھے۔ محمد حسین آزاد نے ابتدائی تعلیم اور شعر گوئی کا ذوق انھیں کے فیض سے پایا۔ بعد ازاں دہلی کالج سے تعلیم مکمل کی۔ ۱۸۵۷ء میں ان کے والد پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا اور انھیں پھانسی دے دی گئی۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر وہ لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد ۱۸۶۴ء میں لاہور چلے آئے اور سر رشتۂ تعلیم میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔ اسی دوران: کابل، بخارا اور ایران کا سفر بھی کیا۔ اپنے محکمے کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائیڈ کی سرکردگی میں انجمنِ پنجاب کے زیرِ اہتمام مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔۔ ان دنوں نیچرل شاعری کا بڑا غلغلہ تھا۔ چنانچہ ان مشاعروں میں نیچرل نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان خدمات کے صلے میں ۱۸۸۷ء میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی بے وقت موت نے ان کے ہوش وحواس چھین لیے اور دیوانگی کے عالم میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء میں خالقِ حقیقی سے جاملے۔ ان کی تصانیف میں 'آب حیات' کو اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ 'دربارِ اکبری'، 'سخندانِ فارس'، 'نیرنگِ خیال' اور 'قصص ہند' بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کے اسلوب کی خوبی الفاظ کا شکوہ اور جلال ہے۔ زبان کی لطافت اور شیرینی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ نثر میں شاعرانہ خیال آفرینی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا لفظ لفظ اپنے قاری سے ہمکلام دکھائی دیتا ہے۔ مرقع نگاری میں ان کا جواب نہیں۔ نثر میں تشبیہات اور استعارے استعمال کرنے کا حسن اور سلیقہ کوئی ان سے سیکھے۔ شاملِ نصاب مضمون ان کی کتاب "نیرنگِ خیال" سے لیا گیا ہے۔

۱.۱ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ (متن):

عہدِ قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے: شہسواری، تیراندازی، راست بازی۔ شہسواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوں گی، مگر کیا اچھی بات ہوتی، اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغِ دیوزاد آ

کران کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا، تو یہ اِس چوٹ سے اُس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ دنیا بُری جگہ ہے۔ چندروزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں، جو اس مشتِ خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہوتا ہے کہ اگر قبول کر لے، تو مرنا پڑتا ہے؛ ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکرو دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں، جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے، جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہردم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضرور ہیں، کیونکہ خوشامد، جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں، اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے، جو اس کی قید کا زنجیری نہیں؟ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار، امید کا بھوکا، آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست، محبت کا بندہ ہے، اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک ہیں۔ انھیں باتوں ہی باتوں میں خوش کر دینے کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمود یے گدھوں کے دعوے، بل ڈاگ کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں، جنھیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت ہے۔ غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عمل داری دور دور تک پھیل گئی ہے، بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مردار سے متنفر ہیں، وہ بھی اس کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شے پر دل آجاتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے، تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرتِ انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا، اس کو جاننا بھی نہیں چاہتے؛ جو بات پسند نہیں آتی، اس کا ذکر بھی نہیں سنتے: اس کان سنتے ہیں، اس کان سے نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع واقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں، تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکۂ صداقت زمانی سلطانِ آسمانی کی بیٹی تھی، جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکۂ موصوف نے ہوش سنبھالا، تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا، تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب

نے صدقِ دل سے تعریف کی۔ عزت ودوام کا تاجِ مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ: "جاؤ اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔" عالمِ سفلی میں دروغِ دیوزاد ایک سفلۂ نابکار تھا کہ احمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس وہواپرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے، تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوسِ خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطانِ آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر ومنزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے، تو چونکہ بزرگانِ آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی، سب کی آنکھیں اُدھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور اور طاقت کو کون نہیں جانتا؟ چنانچہ ملکۂ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی، اسی واسطے بلند اٹھی۔ اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح واقبال: نور کا غبار اڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پرِ پرواز تھا، مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے، شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی، مگر استقلال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا، تو انسان کیا، فرشتے سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغِ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا، تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا وہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا، اسی لالچ کا مارا، کمزور، تابعداروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں ان کی بے معنی تھیں اور کام بھی الٹ پلٹ؛ بے اوسان تھے، کیونکہ استقلال اُدھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا، مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا وہوس اس کے یارِ وفادار تھے، اور اگر کچھ تھے، تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اس وقت دروغِ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف وگزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا وہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی، بات کی پیچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا، تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اس کے

ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا، مگر وہ بھی بادِ ہوائی؛ اٹکل پچو؛ بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا؛ دم بدم جگہ بدلتا تھا، کیونکہ حق کمان سے جب تیرِ نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا، تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک، بجلی کی تلوار نہ تھی، مگر چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعبِ خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی، تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک، بے حیائی کی ڈھال منہ پر لے، ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشانِ لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکۂ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی، مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا، تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔

دروغِ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں، اس لیے دھوکہ بازی اور شعبدہ کاری کا حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو، مگر اس طرح کہ اینچ پیچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہِ صداقت، جو خطِ مستقیم میں ہے، اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا ،تو اسی راستے سے جدھر چاہتا تھا، نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا تھا، پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اس نے ساری دنیا پر حملے کرنے شروع کر دیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا، ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا، تو گھاتوں سے مقابلہ کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی، سب اپنی کمریں اس میں جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے، مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے ہٹتے تھے، پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا، اُدھر باغی ہو گئے۔

ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی، تو سمجھی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے۔ جو بات سنیں گے، اسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی، مگر یہاں دیکھ کر کہ گزارا بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی، مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بد عملی ہو گئی، کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا، دشمن کے زیرِ علم جا موجود ہوتی تھی۔

ہر چند ملکۂ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی، کیونکہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے پاجی کو اپنے مقابلے پر دیکھتی تھی اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری اور بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی

، تو گھٹتی تھی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے نا امید ہوئی، تو غصے ہو کر اپنے باپ سلطانِ آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں، انھی میں رہا کریں، اپنے کیے کی سزا آپ پالیں گے۔ سلطانِ آسمانی اگر چہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا، مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا، تو تمام عالم تہہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرضی نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بد اصولوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اسی وقت عالمِ بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی، ان میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے: (۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں روائی دنیا میں ہر دلعزیز نہیں؟ (۲) کیا تدبیر ہے کہ جس سے اس کے آئینِ حکومت کو جلد اہلِ عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو؟

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدرِ انجمن نے اتفاقِ رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعوؤں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے، جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں، کبھی ایسے فساد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاحِ وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اسے چاہیے کہ جس طرح ہو سکے، اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہو گا، لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے، کیونکہ دیوِ دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے برخلاف ہے۔ اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں، انھیں سوائے عیش و آرام کے، دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیا ہے، جو صورت سب کو بھائے وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ اہلِ انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کے طرزِ لباس کو بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا، جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو جل دیا کرتا تھا۔ اس جامے کا "مصلحتِ زمانہ" نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیبِ بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو راستہ مانگتی، ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ اِدھر اس کا دخل ہوا، اُدھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامے کے اُترتے ہی اس کی اصلی روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چنانچہ اب یہی وقت آ گیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیز کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے، تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے

مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیلِ لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے، تو وہ لفافہ اُتار کر پھینک دیتا ہے، تو پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ [نیرنگِ خیال]

۱.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
عہدِ قدیم	پرانا زمانہ	فارس	ایران	مؤرخ	تاریخ دان
راست بازی	سچائی	سپر	ڈھال	مکرودغا	دھوکا
راستی	سچائی	نمودیے	نمائش کرنے والے	چاروناچار	مجبور ہوکر
بل ڈاگ	کتے کی ایک نسل	متنفر ہونا	نفرت کرنا	انواع	اقسام
صداقت	سچائی	دانش	عقل	دوام	ہمیشہ قائم رہنا
دروغ	جھوٹ	تیرہ دماغ	جاہل	ہوس پرست	لالچی
تمسخر	مذاق	مرصع	آراستہ	صدقِ دل	دل کی سچائی
بھانڈ	نقلیں اتارنے والا	خلعت	شاہی لباس	عداوت	دشمنی
ادراک	فہم،شعور	اٹکل پچو	عجیب وغریب	دانائی	عقل
ایچ پیچ	گھما پھرا کر	فرماں روائی	حکمرانی	متابعت	تابع رہنا
زیرِ علم	جھنڈے تلے	پاجی	گنہگار	کوتاہ اندیش	کم عقل
تنقیح طلب	وضاحت طلب	فارغ البالی	بے فکری	جامہ	لباس
جل دینا	دھوکا دینا	ملک گیری	حکمرانی	مضر	نقصان دہ

۱.۳ خلاصہ:

اس سبق میں محمد حسین آزاد نے سچ اور جھوٹ کے درمیان روزِ اوّل سے جاری جنگ کو موضوع بنایا ہے۔ سچائی کا ساتھ دینا اور ہمیشہ سچ بولنا سب سے مشکل کام ہے۔ انسان چونکہ خطا کا پتلا ہے، اس لیے اسے اکثر جھوٹ بول کر اپنی جان اور

عزت بچانا پڑتی ہے۔ہم سچ سننے کی بجائے خوشامدیوں کی باتوں پر زیادہ کان دھرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر طرف جھوٹ راج کرتا ہے۔

ملکہ صداقت کی ذمہ داری دنیا میں سچائی کا نور پھیلانا تھا، تاکہ دنیا میں جھوٹ کی تاریکی ختم ہو سکے اور صداقت کا اُجالا پھیل جائے، لیکن دروغِ دیوزاد ایسے ایسے روپ بدل کر سامنے آجاتا کہ ملکہ کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ لالچ اور ہوس چونکہ دروغِ دیوزاد کے دوست تھے، اس لیے میدانِ جنگ میں ملکہ کو منہ کی کھانی پڑتی۔ اس لڑائی میں ملکہ کو زخم بھی آتے۔ ملکہ کی دانائی سے دروغ دیوزاد اگرچہ بہت ڈرتا تھا، لیکن اسے اپنی مکاری اور شعبدہ بازی پر بہت ناز تھا اور وہ دانائی کی ایک نہ چلنے دیتا۔ وہ بار بار اس میدان میں ملکہ سے شکست کھاتا، لیکن بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پھر سامنے آموجود ہوتا۔

ملکہ کا زیادہ بس نہ چلتا تھا۔ دروغِ دیوزاد کہ جس کی سلطنت اب وسعت اختیار کرتی چلی جارہی تھی، دنیا میں کامیاب و بامراد تھا اور ملکہ پسپا ہوتی چلی جارہی تھی۔ عالمِ بالا میں جب اس صورتِ حال پر غور کیا گیا، تو یہ پتا چلا کہ ملکہ دانا و بینا تو ہے، لیکن مصلحت سے عاری ہے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ملکہ مصلحت سے کام لے، کیوں کہ یہ وہ لباس ہے کہ جس میں دروغِ دیوزاد بھی ملبوس رہتا تھا، لہٰذا اسی لباس کے باعث ملکہ کی حکمرانی دیکھتے ہی دیکھتے مضبوط اور وسیع ہونے لگی۔ وقت آنے پر جب بھی وہ مصلحت کا لباس اُتارتی تھی، تو سچائی کا نور چاروں طرف پھیل جاتا تھا۔

۱.۴ اہم نکات:

۱۔ سچائی کا ساتھ دینا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے۔

۲۔ دنیا میں سچ سننے والے کم اور خوشامدی زیادہ ہوتے ہیں۔

۳۔ آج کل تو ہر طرف جھوٹ ہی کی حکمرانی ہے۔

۴۔ جھوٹ کے ہزاروں روپ ہیں اور ہر روپ انسانوں کو گمراہ کرتا ہے۔

۵۔ جھوٹ اور سچ کی لڑائی روزِ اول سے جاری ہے، کبھی سچ فتح و کامرانی پاتا ہے اور کبھی جھوٹ۔

۶۔ شیخی، دغابازی اور بے وفائی جھوٹ کے اوصاف ہیں۔

۷۔ سچ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصلحت سے بھی کام لے، کیونکہ مصلحت کے بغیر کسی کے لیے سچائی کو قبول کرنا مشکل ہوتا ہے۔

۱.۵ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''سچ کا عجب حال ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کان سے نکال دیتے ہیں''۔

سبق کا عنوان: سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

مصنف کا نام: محمد حسین آزاد

سیاق وسباق:

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف نے بتایا ہے کہ راست بازی سب سے مشکل کام ہے۔ چندروزہ زندگی میں انسان جھوٹ سے کام نہ لے، تو اسے جگہ جگہ ناکامی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ دور میں تو ہر طرف جھوٹ کی عمل دری ہے۔ تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف نے بتایا ہے کہ دروغِ دیوزاد کی مکروفریب کے باعث ملکۂ صداقت زمانی کی حکمرانی کمزور پڑتی چلی جاتی ہے، لیکن جب اسے مصلحت عطا ہوتی ہے، تو وہ پھر سے دنیا پر حکمرانی کرنے لگتی ہے۔

تشریح:

اس اقتباس میں مصنف نے انسانی زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری کو بیان کیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ دنیا بھر میں سچائی کو بڑی عزت دی جاتی ہے اور سچے انسانوں کی قدر بھی کی جاتی ہے اور اخلاقی زندگی کی تعلیم وتربیت میں سچ اور سچائی کو مینارہ نور کی حیثیت دی جاتی ہے، لیکن افسوس اپنی عملی زندگی میں لوگ عموماً سچ کو کچھ زیادہ اچھا نہیں سمجھتے۔ آدمی اپنے مفادات کے حصول کے لیے اگر ضروری سمجھتا ہے کہ جھوٹ بولے بغیر فائدے کی کوئی صورت نہیں، تو وہ آؤ دیکھتا ہے، نہ تاؤ، سچائی کو پسِ پست ڈال کر جھٹ جھوٹ بول دیتا ہے اور پھر بھول جاتا ہے کہ اس کے فائدے یا کامیابی میں سچائی کی بجائے جھوٹ نے کردار ادا کیا ہے۔ اکثر و بیشتر یوں بھی ہوتا ہے کہ ہمارا بولا ہوا جھوٹ ہمارے لیے نہ تو پشیمانی کی وجہ بن پاتا ہے اور نہ ہی کبھی ہمارے ضمیر پر بوجھ بنتا ہے۔ انسان کو جب اپنے فائدے کی کوئی صورت دکھائی دینے لگتی ہے اور اس فائدے کو پانے کے لیے جھوٹ بولنا گویا شرط قرار دیا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں سچ بھی بُرا دکھائی دینے لگتا ہے۔ سچائی حقیقت ہی کا دوسرا روپ ہے، لیکن حقیقت چونکہ اکثر تلخ ہوتی ہے اور اس کا سامنا کرنا اخلاقی طور پر کمزور انسان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے، اس لیے فرار کی راہ یہی ٹھہرتی ہے کہ حقیقت کو حقیقت اور سچ کو سچ مان لینے کی بجائے جھوٹ سے اپنے دل کو تسلی دے دی جائے۔ مصنف کے خیال میں یہ انسان کا سب سے بُرا روپ ہے۔ ہمیں جو بات پسند نہیں ہوتی، ہم چاہتے ہیں کہ کوئی باتوں باتوں میں اس کا ذکر تک نہ کرے، جبکہ وہی بات خود ہماری شخصیت، ذات یا کردار کا حصہ بھی ہوتی ہے۔ اگر کبھی کوئی ہماری خامی، کوتاہی یا حماقت کی نشاندہی کر دیتا ہے، پھر بھی ہم اس سچائی کو قبول کرنے اور سچ بولنے والے کا

شکریہ ادا کرنے کی بجائے اسے ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے کان سے نکال باہر کرتے ہیں۔

خودآزمائی:

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔

الف۔ فارس کے شرفا اپنے بچوں کو کون کون سی تین باتوں کی تعلیم دیتے تھے ؟

ب۔ خوشامد کون کرتا ہے؟

ج۔ حکیم لوگوں کو جھوٹ سے متنفر کرنے کے لیے کیا تدبیر کرتے ہیں؟

د۔ ملکۂ صداقت زمانی کی ماں کا نام کیا تھا؟

ہ۔ عالم بالا میں ملکۂ صداقت کو کون سا لباس پیش کیا گیا اور کیوں؟

و۔ سبق "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" کس کی تحریر ہے۔

ز۔ جھوٹ کی قلعی کب کھلتی ہے؟

۲۔ سبق "سچ اور جھوٹ رزم نامہ" کے تناظر میں یہ جملے مکمل کریں۔

الف۔ اس میں شک نہیں ہے کہ دنیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جگہ ہے۔

ب۔ ملکۂ صداقت زمانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کی بیٹی تھی۔

ج۔ جاؤ اولادِ آدم میں اپنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھیلاؤ۔

د۔ ملکۂ صداقت کبھی کبھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بھی ہوتی تھی۔

ہ۔ جھوٹ کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دور دور تک پھیل گئی ہے۔

۳۔ درج ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

راست بازی، مشتِ خاک ، عالمِ سفلی ، فتح یاب، صدرِ انجمن۔

۴۔ سبق "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ " کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۵۔ درج ذیل اقتباس کی تشریح بحوالہ سیاق وسباق کریں۔

"دروغِ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آن موجود ہوتا تھا"۔

۶۔ سبق "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" کا خلاصہ تحریر کریں۔

۲۔ علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہوتا تھا۔ عربی، فارسی اور حدیث و فقہ کی تعلیم اپنے عہد کے جید علما سے حاصل کی۔ شبلی عالمِ دین، سیرت نگار، محقق، مقالہ نگار، شاعر، ناقد اور ماہرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے ۱۹ سال کی عمر میں حج کی سعادت حاصل کی اور واپسی پر اعظم گڑھ میں سلسلۂ درس و تدریس شروع کیا۔ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ انھیں سر سید احمد خان اور ان کے تمام رفقا سے رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا درد ان کی روح میں سمایا ہوا تھا۔ ان کی علمی، فکری اور ادبی زندگی کا مقصد مسلمانانِ پاک و ہند کو زوال، مایوسی اور تقلید پرستی کے اندھیروں سے نکالنا تھا۔ ان کی قومی اور ملی شاعری نے مسلمانوں کی غیرت اور حمیت کو جگایا۔ وہ ایک بلند پایہ مکتوب نگار بھی تھے۔ ان کی علمی خدمات کے صلے میں حکومتِ برطانیہ نے انھیں "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا، جبکہ ترکی کی طرف سے انھیں "تمغۂ مجیدیہ" سے سرفراز کیا گیا۔ ان کی تصانیف میں معرکہ آرا تصنیف 'سیرت النبیؐ' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی متنوع موضوعات پر مشتمل کتابوں میں 'شعرالعجم'، 'الفاروق'، 'المامون'، 'الغزالی'، 'علم الکلام'، 'سوانح مولانا روم'، 'موازنۂ انیس و دبیر' اور 'مقالاتِ شبلی' بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کا اندازِ تحریر بہت عالمانہ ہے۔ ان کی تحریر جوش اور تدبر کا بہترین امتزاج ہے۔ وہ چونکہ ایک بلند پایہ سیرت نگار تھے، اس لیے ان کی نثر میں سراپا نگاری، جزئیات نگاری، منظر کشی جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو ان کی تحریر کو دلچسپ اور فکر انگیز بنا دیتی ہیں۔

ان کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اور وہ اعظم گڑھ میں مدفون ہوئے۔

۳۔ مامون الرشید [متن]

مامون الرشید جن ممالک کا فرماں روا تھا وہ حدودِ ہند سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک پھیلے ہوئے تھے۔ اسلامی دنیا کا کوئی حصہ سپین کے سوا اس کی حکومت سے آزاد نہ تھا۔ ہندوستان کے سرحدی شہروں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ شہنشاہِ روم خود سر فرماں روا تھا تاہم اکثر اوقات خراج دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ہارون الرشید کے عہد میں کل ملک کا خراج آج کل کے حساب سے تیس کروڑ پچاس لاکھ روپے تھا۔ مامون کی خلافت نے اس پر بہت کچھ اضافہ کر دیا۔

دولتِ عباسیہ کے امن و انتظام، ترقی و وسعت کے افسانے جو روز ہم سنتے ہیں، سچ پوچھیے تو ہارون و مامون کے

عہدِ حکومت ہی نے خاندان کو یہ ناموری دی ہے۔ تجارتیں تمام آزاد تھیں؛ نئے نئے شہر آباد ہوتے جاتے تھے۔ ایک ایک قصبہ، بلکہ ایک ایک گاؤں میں چشمے اور نہریں جاری تھیں، جو حاکموں اور زمینداروں کے ذاتی مصارف سے ہمیشہ بنتی رہتی تھیں اور جن کی وجہ سے زراعت کو روز افزوں ترقی حاصل تھی۔

مامون نے سلطنت کے بڑے اضلاع کا دورہ کیا اور ہر جگہ دو دو چار چار دن قیام کر کے مناسب انتظامات کے احکامات جاری کیے۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ: جب مامون نے مصر کے علاقے کا دورہ کیا، تو ہر گاؤں میں کم از کم ایک رات ٹھہرتا گیا۔ مصر میں پہنچا، تو معمول کے خلاف وہاں قیام نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس گاؤں کی مالک ایک بڑھیا تھی۔ یہ خبر سن کر مامون کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ: 'یہ محرومی میری ہی قسمت میں کیوں آئی'؟ مامون اس کا مہمان ہوا۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق دعوت کا سامان کیا اور رخصت کے وقت دس تھیلی اشرفیاں ایک ہی سنہ کے سکے کی نذر میں پیش کیں۔ مامون حیران رہ گیا اور کہا کہ دعوت ہی کیا کم تھا، تم نے یہ تکلیف کیوں گوارا کی، جس کا قبول کرنا فیاضی کے خلاف ہے۔ بڑھیا نے کہا کہ سونا تو ہمارے گاؤں کی مٹی سے پیدا ہوتا ہے، میں نے جس قدر حضور کی خدمت میں حاضر کیا، اس سے بہت زیادہ اب بھی میرے پاس ہے۔ اس حکایت سے مامون کے حسنِ انتظام اور ملک کی مرفع الحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ملک کے ہر حصے میں معذور محتاج، اپاہج، بیوہ، یتیم سب کے رزینے مقرر تھے، جو شاہی خزانے سے وقتِ معین پر ان کو ملا کرتے تھے۔ یہ بات سلطنت کے ضروری قوانین میں داخل تھی کہ جو شخص فقر و فاقہ کا شاکی ہو، اس مقام کا حاکم یا تو اس کو کوئی کام دے یا بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دے۔

مامون نے خراساں کے زمانۂ حکومت میں غفلت کی تھی، اس کا خمیازہ مدت تک کھینچنا پڑا تھا، اس لیے بغداد میں آ کر اس کا طرزِ حکومت بدل گیا تھا۔ اب اس کو ایک ایک جزئی واقعے اور عام حالات کی اطلاع کا کچھ ایسا عشق ہو گیا تھا کہ سُن کر تعجب ہوتا ہے۔

سترہ سو عورتیں مقرر تھیں، جو تمام دن شہر میں پھرتی تھیں اور شہر کا کچا چٹھا اس کو پہنچاتی تھیں، لیکن مامون کے سوا اور کسی کو ان کے نام و نشان سے اطلاع نہ تھی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کی کاوش کا جو عام اثر ہوتا ہے، یعنی ہر شخص سے بدگمان ہو جانا، مامون اس سے بالکل بری تھا۔ بخلاف اس کے اس محکمے نے رعایا کے حق میں عجیب و غریب فیاضاں دکھائیں۔

ایک دن کسی سپاہی نے ایک شخص کو بیگار میں پکڑا۔ وہ دردناک آواز میں چلایا: 'ہائے عمر! کہاں ہو'؟ مامون کو اطلاع ہوئی۔ اس شخص کو طلب کیا اور کہا کہ: 'کیا حضرت عمرؓ کا عدل تجھ کو یاد آیا ہے'؟ اس نے کہا: 'ہاں'۔ مامون نے کہا: 'خدا کی قسم! اگر

میری رعیت حضرت عمرؓ کی سی ہوتی، تو میں ان سے بھی زیادہ عادل ہوتا'۔ پھر اس کو انعام دیا اور سپاہی کو موقوف کر دیا۔

ایک بار ایک شخص نے عرضی دی کہ بیت المال سے کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے۔ مامون نے بلا کر پوچھا: 'کتنے بال بچے ہیں'۔ اس نے تعداد بڑھا کر بتائی۔ چونکہ مامون ایک ایک جزئی واقعے کی خبر رکھتا تھا، اس کا جھوٹ نہ چل سکا۔ دوسری بار اس نے پھر عرضی لکھی اور جو تعداد تھی، سچ سچ بتادی۔ مامون نے اب کے عرضی پر لکھ دیا کہ اس کا روزینہ مقرر کیا جائے۔

اتوار کے دن ہمیشہ صبح سے دوپہر تک دربارِ عام کرتا تھا، جس میں خاص و عام کے لیے کچھ روک نہ تھی اور یہاں پہنچ کر ایک کمزور مزدور کو اپنے حقوق میں خاندانِ شاہی کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ ہوتا تھا۔

ایک دن ایک شکستہ حال بڑھیا نے دربار میں زبانی یہ شکایت پیش کی کہ ایک ظالم نے میری جائیداد چھین لی ہے۔ مامون نے کہا: 'کس نے اور کہاں ہے'؟ اس نے اشارے سے بتایا کہ آپ کے پہلو میں ہے۔ مامون نے دیکھا، تو خود اس کا بیٹا عباس تھا۔ وزیر اعظم کو حکم دیا کہ شہزادے کو بڑھیا کے برابر لے جا کر کھڑا کر دے اور دونوں کے اظہار سنے۔ شہزادہ عباس رک رک کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتا تھا، لیکن بڑھیا کی آواز بے باکی کے ساتھ بلند ہوتی جاتی تھی۔ وزیر اعظم نے روکا کہ خلیفہ کے سامنے چلا کر بات کرنا خلافِ ادب ہے۔ مامون نے کہا: 'نہیں! جس طرح چاہے آزادی سے کہنے دو'۔ سچائی نے اس کی زبان تیز کر دی اور عباس کو گونگا بنا دیا ہے۔ آخر مقدمے کا فیصلہ بڑھیا کے حق میں ہوا اور جائیداد واپس دلا دی گئی۔

ایک دفعہ خود مامون پر ایک شخص نے تیس ہزار کا دعویٰ دائر کر دیا، جس کی جواب دہی کے لیے اس کو حاضر ہونا پڑا۔ خدام نے قالین لا کر بچھایا کہ خلیفہ اس پر تشریف فرما ہو، لیکن قاضی نے مامون سے کہا کہ: یہاں آپ اور مدعی دونوں برابر درجہ رکھتے ہیں۔ مامون نے کچھ بُرا نہ منایا، بلکہ اس کے صلے میں قاضی کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

مامون کا دعویٰ تھا کہ بڑے سے بڑا جرم بھی میرے حلم کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ ایک شخص نے جو متعدد نافرمانیاں کر چکا تھا، اس نے کہا کہ تو جس قدر گناہ کرتا جائے گا، میں بخشتا جاؤں گا، یہاں تک کہ خود عفو تجھ کو درست کر دے گا۔ مامون کی اس رحمدلی پر لوگوں کو اس قدر بھروسہ ہو گیا تھا کہ بے تکلف اس کے سامنے اپنی خطاؤں کا اعتراف کر لیتے تھے۔

مامون اگرچہ ملک کے ایک ایک جزئیات کی خبر رکھتا تھا اور اس شوق میں ہزاروں لاکھوں روپے صرف کرتا تھا، مگر غمازوں کا جانی دشمن تھا۔ اس کے سامنے جب غمازوں کا ذکر آتا، تو اکثر کہا کرتا تھا: 'ان لوگوں کی نسبت تم کیا خیال کرتے ہو، خدا نے جن کے سچ کہنے پر بھی لعنت کی ہے'۔ اس کا قول تھا کہ جس شخص نے کسی کی غلط شکایت کر کے اپنی عزت میری آنکھوں میں گھٹا دی، پھر وہ کسی طرح اس کی تلافی نہیں کر سکتا'۔

مامون بڑی عظمت و شان کا بادشاہ تھا، مگر ہمارے خیال میں جو چیز اس کی تاریخی زندگی کو نہایت مزین بناتی ہے، وہ

اس کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی ہے۔ایک شہنشاہ جو تختِ حکومت پر بیٹھ کر کل اسلامی دنیا کا ذمہ دار بن جاتا ہے، کس قدر عجیب بات ہے کہ عام دوستوں سے ملنے جلنے میں شانِ سلطنت کا لحاظ رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔اکثر اہلِ علم راتوں کو اس کے مہمان ہوتے تھے اور اس کے بستر سے بستر لگا کر سوتے تھے، مگر اس کا عام برتاؤ ایسا ہوتا تھا، جیسا کہ سادہ خالص دوست کا دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔

قاضی یحییٰ ایک رات اس کے مہمان تھے۔اتفاقاً آدھی رات کو ان کی آنکھ کھل گئی اور پیاس محسوس ہوئی۔چونکہ چہرے سے بے تابی کا اثر ظاہر تھا۔مامون نے پوچھا: 'خیر ہے'۔قاضی صاحب نے پیاس کی شکایت کی۔مامون خود گیا اور دوسرے کمرے سے پانی کی صراحی اٹھالایا۔قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا: 'حضور نے خدام کو اشارہ کیا ہوتا'۔مامون نے کہا: 'نہیں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے'۔راتوں کو خادم سو جاتے تھے، تو خود اٹھ کر چراغ اور شمعیں درست کر دیا کرتا تھا۔

ایک بار باغ کی سیر کو گیا۔قاضی یحییٰ بھی ساتھ تھے۔مامون ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ٹہلنے لگا۔جانے کے وقت دھوپ کا رخ قاضی صاحب کی طرف تھا۔اُدھر سے واپس آتے وقت مامون کی طرف بدل گیا۔قاضی صاحب نے چاہا کہ وہ پہلو خود لے لیں، تاکہ مامون سائے میں آ جائے، لیکن اس نے گوارا نہ کیا اور کہا: 'یہ انصاف سے بعید ہے، پہلے میں سائے میں تھا، واپسی پر تمھارا حق ہے'۔

بااین ہمہ مامون کی سادہ روی سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ شاہانہ جاہ و حشم یا مسرفانہ مصارف میں کچھ تنزل ہوا تھا۔دس ہزار درہم روزانہ اس کے طعامِ خاصہ کا صرف تھا۔ایک یورپین مصنف نے خلفائے راشدین کی سادہ طرزِ زندگی کا اس عہد سے ایک عجیب صورت میں مقابلہ کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے شام کا سفر کیا، تو ان کا کل ضروری اسباب اور کھانے کا سامان ایک اونٹ پر رکھا گیا اور جب مامون شکار کو نکلا، تو اس کے لیے ضروری اور معمول کے ساز و سامان کے لیے تین سو اونٹ بھی کافی نہ ہوئے۔

عرب کے مورخوں نے مامون کی سخاوت و دریا دلی کا ذکر فخر اور جوش کے ساتھ کیا ہے اور چونکہ مامون کے اصلی کارنامے اس قسم کی حیرت انگیز فیاضیوں سے معمور ہیں، اس لیے ان کو ایشیائی عبارت آرائی کی ضرورت نہیں پڑی۔

بوران کے نکاح میں ایک مفلس آدمی نے نمک کی دو تھیلیاں نذر بھیجیں اور خط لکھا کہ: 'اگرچہ ناداری ہمت کو دبا دیتی ہے، مگر میں نے یہ پسند نہ کیا کہ اہلِ کرم کی فہرست بند کر دی جائے اور میرا نام اس میں نہ ہو۔نمک کی برکت اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان کو حضور کی نذر کے لیے انتخاب کروں'۔مامون نے حکم دیا کہ: دونوں تھیلیاں اشرفیوں سے بھر کر اس کو واپس

کی جائیں۔[المامون]

۲.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

خودسر:	سرکش، مغرور	فرماں روا:	حکمران
مصارف:	خرچ، اخراجات	مرفع الحالی:	خوش حالی
رزینے:	وظیفے	خمیازہ:	نقصان
موقوف کردیا:	ہٹادیا	ہم سری:	برابری
حلم:	قوت، برداشت	عفو:	معاف کرنا
باایں ہمہ:	اس کے باوجود	جاہ وحشم:	شان وشوکت
صیغے:	شعبے		

۲.۳ خلاصہ:

مامون الرشید کی حکومت، حدودِ ہند سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہارون الرشید کے مفتوحہ علاقوں میں مامون الرشید نے بہت اضافہ کیا، جس سے سرکار کے خراج میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ ان دونوں حکمرانوں کے دور ہی میں نئے شہر آباد ہونا شروع ہوئے اور زراعت جیسے پیشے کو ترقی ملی۔

اتنی وسیع سلطنت کا انتظام چلانے کے لیے مامون ہر علاقے میں خود جا کر مناسب احکامات جاری کرتا۔ مصر کے ایک گاؤں کی مالک ایک بڑھیا تھی، جب اسے مامون کی آمد کی خبر ہوئی، اس نے مامون کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ واپسی پر بڑھیا نے مامون کو دس تھیلی اشرفیاں نذر کیں، جس سے اس کی سلطنت کی خوش حالی اور حسنِ انتظام کا اندازہ لگا جا سکتا ہے۔ محتاجوں، ضرورت مندوں، یتیموں اور بیواؤں کی بیت المال سے امداد کی جاتی۔ پوری سلطنت کے معاملات اور حالات و واقعات سے باخبر رہنے کے لیے مامون نے سترہ سو عورتیں مقرر کر رکھی تھیں، جو شہر کے چپے چپے کی خبریں لا کر خلیفہ کو پیش کرتیں۔

ان حالات سے باخبر ہونے کے بعد مامون ضرورت کے مطابق احکامات جاری کرتا اور بعض اوقات سائلین کی فوری حاجت روائی بھی کر دیتا۔ مامون کا معمول تھا کہ اتوار کے دن صبح سے دوپہر تک دربارِ عام کرتا، جس میں امیر غریب عوام

حکمران سب کو مساوی درجہ ملتا۔ ایک دن ایک بڑھیا کی شکایت پر اپنے بیٹے عباس کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے بڑھیا کی جائیداد کی واپسی کا حکم دیا۔ ایک بار کسی مقدمے کے سلسلے میں خود مامون کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ جب قاضی نے خلیفۂ وقت کے ساتھ بھی عام لوگوں جیسا سلوک کیا، تو مامون خوش ہوا اور قاضی کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

مامون کی فطرت میں رحم دلی بھی بدرجۂ اتم موجود تھی، لیکن تمام اچھائیوں کے باوجود مامون کی غمازوں سے نہ لگتی تھی۔ مامون الرشید اتنی وسیع سلطنت کا حکمران ہونے کے باوجود نہایت سادہ مزاجی اور بے تکلفی سے زندگی بسر کرتا تھا۔ دوستوں سے ملنے میں شانِ سلطنت کا لحاظ رکھنا ناپسند کرتا تھا۔ اکثر اہلِ علم اس کے ہاں مہمان ہوتے۔ ایک رات قاضی یحییٰ مہمان تھے، شدید پیاس سے آدھی رات کو ان کی آنکھ کھل گئی، تو مامون الرشید خود جا کر قاضی صاحب کے لیے پانی لے کر آیا۔ اس کے باوجود مامون الرشید شاہی شان کا بھی قائل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک یورپی مؤرخ لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ شام کے سفر پہ روانہ ہوئے، تو زادِ راہ فقط ایک اونٹ پہ پورا آ گیا، لیکن جب مامون شکار کو نکلا، تو تین سو اونٹ بھی سامانِ سفر کے لیے کم پڑ گئے۔

مامون الرشید انتہا درجے کا سخی اور فیاض حکمران تھا۔ ایک موقع پر ایک شخص نے نمک نذر کیا، تو واپسی میں دونوں تھیلیاں اشرفیوں سے بھر کر بھیجیں۔ تمام تر فیاضیوں اور سخاوتوں کے باوجود مامون الرشید کی سلطنت کا انتظام و انصرام نہایت خوش اسلوبی سے چلتا۔ ملک خوش تھا؛ سرکاری خزانے بھرے پڑے تھے، سو مامون الرشید بھی دولت رعایا میں تقسیم کرنے کے حوالے سے سخاوت اور فیاضی کا مظاہرہ کرتا تھا۔

۲.۴ اہم نکات:

۱۔ مامون الرشید عباسی خلیفہ تھا۔ اس سبق میں مامون کے انتظام و انصرامِ حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ مامون الرشید کی سلطنت ہندوستان کی سرحد سے بحرِ اوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع سلطنت کا خراج بھی کروڑوں میں تھا۔

۳۔ مامون الرشید کے دورِ حکومت میں نئے شہر آباد ہوئے اور عوام کی فلاح و بہبود کے متعدد منصوبے شروع کیے گئے۔

۴۔ مامون الرشید نے معذوروں، یتیموں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔

۵۔ شہر کے حالات و واقعات سے باخبر رہنے کے لیے سترہ سو عورتیں ملازم رکھی گئی تھیں، جن کی اطلاع پر بروقت

احکامات صادر کیے جاتے۔

۶۔ مامون الرشید طبعاً سادہ مزاج تھا۔ اہلِ علم اکثر اس کے ہاں رات کو مہمان ہوتے۔ حضورؐ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مامون الرشید راتوں کو اٹھ اٹھ کر مہمانوں کی خبر گیری کرتا۔

۲.۵ اقتباس کی تشریح:

''ایک دن ایک شکستہ حال بڑھیا.......... جائیداد واپس دلا دی گئی''۔

سبق: مامون الرشید

مصنف: علامہ شبلی نعمانی

سیاق و سباق: شبلی نعمانی نے نامور عباسی خلیفہ مامون الرشید کے بارے میں بتایا کہ اس کی سلطنت ہندوستان کی حدود سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر علاقے کے انتظام و انصرام کے لیے مامون خود اس علاقے کا دورہ کرتا۔ پوری سلطنت خوش حال تھی۔ معذوروں، یتیموں، بیواؤں اور اپاہج لوگوں کے لیے وظائف مقرر تھے۔ حکومت کے خلاف واقعات سے باخبر رہنے کے لیے مامون نے سترہ سو عورتیں مقرر کر رکھی تھیں، جو شہر کے چپے چپے کی خبریں لا کر مامون کو دیتیں، جن پر مناسب احکامات صادر کیے جاتے۔ اس کے علاوہ مامون الرشید ہر اتوار کو دربارِ عام بھی لگاتا۔

تشریح: خلیفہ مامون الرشید کا معمول تھا کہ ہر اتوار کو دربارِ عام لگاتا، جس میں انصاف کے تمام تقاضوں کو پورا کیا جاتا اور امیر غریب، حکمران رعایا سب کو مساوی مقام حاصل تھا۔ اس دربار کے دوران ایک بار ایک بوڑھی غریب عورت نے مامون سے شکایت کی کہ اس کے بیٹے عباس نے اس کی جائیداد چھین لی ہے۔ یہ سنتے ہی مامون الرشید نے اپنے بیٹے عباس کو بڑھیا کے برابر کھڑا کر دیا اور دونوں کے بیان سنے۔ اس دوران شہزادہ عباس ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا رہا، تاہم بڑھیا کی آواز خلافِ معمول بلند ہوگئی۔ وزیرِ اعظم نے دربارِ شاہی کے آداب ملحوظِ خاطر رکھنے کو کہا، جس پر مامون نے کہا کہ بڑھیا چوں کہ مظلوم سائل ہے، اس لیے جس طرح چاہے اسے آزادی کے ساتھ بات کرنے کی اجازت ہے۔ سچائی نے بڑھیا کی آواز بلند کر دی، جب کہ عباس گونگا بن گیا۔ آخر میں انصاف کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خلیفہ مامون الرشید نے اپنے بیٹے عباس کے خلاف اور بڑھیا کے حق میں فیصلہ سنا دیا اور بڑھیا کی ساری جائیداد واپس کر دی گئی۔

خود آزمائی:

☆ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیں۔

الف۔ مامون الرشید کی سلطنت کی حدود کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں؟

ب۔ بڑے اضلاع کا انتظام چلانے کے لیے مامون الرشید نے کیا طریقہ اپنایا؟

ج۔ فقر و فاقہ کے شاکی شخص کے لیے سلطنت کے کیا قوانین تھے؟

د۔ سلطنت کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے مامون الرشید نے کیا طریقہ اپنایا؟

ہ۔ مامون الرشید نے دربارِ عام میں اپنے بیٹے عباس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

و۔ بہت زیادہ حلیم ہونے کے باوجود غمازوں کے ساتھ مامون الرشید کسی قسم کا سلوک روا رکھتا تھا؟

ز۔ دوستوں کے ساتھ مامون الرشید کا سلوک کس قسم کا تھا؟

ح۔ مامون الرشید کے دل میں اہلِ علم کا کیا مقام و مرتبہ تھا؟

۲۔ درست جواب کا انتخاب کریں۔

ا۔ ہندوستان کے سرحدی شہروں میں کس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا؟

(الف) مامون الرشید (ب) امین الرشید (ج) ہارون الرشید (د) عمر بن عبد العزیز

۲۔ مامون الرشید کے عہد میں کل خراج وصول ہوتا تھا۔

(الف) اکیس کروڑ (ب) اکیس کروڑ پچاس لاکھ (ج) اکتیس کروڑ (د) اکتیس کروڑ پچاس لاکھ

۳۔ شہری خبر گیری کے لیے کتنی عورتیں مقرر تھیں۔

(الف) پندرہ سو (ب) سولہ سو (ج) سترہ سو (د) اٹھارہ سو

۴۔ مامون الرشید نے مقدمے کا فیصلہ کس کے حق میں سنایا؟

(الف) بڑھیا کے (ب) عباس کے (ج) وزیراعظم کے (د) کسی کے بھی نہیں

۵۔ مامون الرشید کے سامان سفر کے لیے کتنے اونٹ کم پڑ جاتے؟

(الف) دوسو (ب) تین سو (ج) چار سو (د) پانچ سو

۳۔ خالی جگہ پُر کریں۔

الف۔ مامون الرشید کی سلطنت کی حدود ہندوستان سے لے کر.........تک پھیلی ہوئی تھیں۔

ب۔ مامون الرشید کے عہد میں وصول ہونے والا کل خراج.........روپے تھا۔

ج۔ ملک کے ہر حصے میں معذور محتاج، اپاہج، بیوہ، یتیم سب کے.........مقرر تھے۔

د۔ مامون نے.........کے زمانہ حکومت میں غفلت کی تھی۔

ہ۔ مامون کا دعویٰ تھا کہ بڑے سے بڑا جرم بھی میرے.........کو متزلزل نہیں کرسکتا۔

۴۔ غلط اور درست جملوں کی نشاندہی کریں۔

الف۔ اسلامی دنیا کا کوئی خطہ اسپین کے سوا اس کی حکومت سے آزاد نہ تھا۔

ب۔ مامون نے سلطنت کے بڑے اضلاع کا دورہ کبھی نہ کیا۔

ج۔ مامون نے مقدمے کا فیصلہ اپنے بیٹے عباس کے حق میں دیا۔

د۔ مامون بڑی عظمت وشان کا بادشاہ تھا۔

ہ۔ بڑھیا نے کہا: سونا تو ہمارے گاؤں کی کانوں میں پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ مہدی افادی

اصل نام تو مہدی حسن تھا، لیکن ادب و شاعری کی دنیا میں مہدی افادی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ ان کا خاندان اپنی شرافت اور نیک نامی کے باعث گورکھ پور کے لیے باعثِ عزت تھا۔ ان کے والد کا نام شیخ حاجی علی حسن تھا، وہ کورٹ انسپکٹر تھے۔ دستورِ عام کے مطابق گھر میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ علومِ جدیدہ کی تحصیل کے لیے اسکول میں بھی داخل ہوئے اور علی گڑھ میں بھی مقیم رہے۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز تو معمولی نوعیت کی ملازمتوں سے کیا، تاہم بعد ازاں نائب تحصیل دار سے ترقی کرتے کرتے تحصیل دار کے عہدے پر جا پہنچے۔ وہ مزاجاً بڑے نفیس تھے اور صاحبِ طرز اسلوب نگار۔ ان کی جمال دوستی اور نفاست پسندی تحریر ہی سے عیاں نہ تھی، بلکہ آدابِ خورد و نوش، لباس کی تراش خراش، گھر کی آرائش اور وضع قطع میں بھی حسن اور خوب صورتی کو معیار سمجھتے تھے۔

مہدی افادی کا بھی وہی اسلوبِ تحریر ہے، جو سجاد حیدر یلدرم اور محمد حسین آزاد کی تحریروں کا خاصا ہے۔ یہ اسلوب اصطلاحاً "ادبِ لطیف" کہلاتا ہے۔ اردو میں رومانوی تحریک کو جن لوگوں نے پروان چڑھانے کی بھرپور کوشش کی، ان میں ایک نام مہدی افادی کا بھی ہے۔ آزاد کا سا تمثیلی انداز ان کی تحریروں کو بھی دلکش اور توانا بنا دیتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جمالیاتی پہلو بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں بھی غزل جیسا گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ عربی، اردو، فارسی کی خوب صورت تراکیب کا استعمال ان کی تحریر میں جان پیدا کر دیتا ہے۔ نئی نئی تراکیب وضع کرنے میں ان کا جواب نہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے کا نام "افاداتِ مہدی" ہے۔ یہ مجموعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ نے مرتب کر کے شائع کرایا۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ نصاب میں شامل مضمون ان کی کتاب "افاداتِ مہدی" سے لیا گیا ہے۔

مہدی افادی نے ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو وفات پائی۔

۳.۱ سقراط [متن]:

سقراط، یونان کے مشہور اور نامور حکما میں سے تھا، ایتھنس میں پیدا ہوا۔ یہ شہر کسی وقت یونان کا دارالسلطنت تھا، اس میں یونیورسٹی بھی تھی۔ سقراط کا باپ ایک بت تراش تھا۔ آبائی پیشے کی رعایت سے اس وحیدِ عصر نے بھی سنگ تراشی میں مشق بہم پہنچائی، مگر آخر اسے فلسفے کی تحصیل کا شوق ہوا۔ چونکہ طبیعت میں قدرتی طور پر اعلیٰ درجے کی صلاحیت موجود تھی، اس

ہے اس نے نہایت تیزی کے ساتھ فلسفے کا اثر قبول کیا۔

اوائل عمری میں بہ تقاضائے آئینِ ملکی اسے فوج میں داخل ہونا پڑا۔ کئی لڑائیوں میں اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے۔ زنوفن اور ایلسی بائیڈیز کے سے لائق شخصوں کی جان اس نے بچائی۔ اسی وجہ سے ان دونوں کو بھی اس کے ساتھ بہت محبت تھی۔ زنوفن فوج کا ایک سردار ہونے کے علاوہ صاحبِ تصنیف بھی تھا۔ اس کی تصنیفات خاص پائے کی ہیں۔ ایلسی بائیڈیز ایک امیر کا بیٹا تھا، ہر قسم کے اوصاف اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت سونے پر سہاگے کا رتبہ رکھتی تھی۔

لڑائی سے فراغت کے بعد سقراط نے اپنی وضع تبدیل کرلی۔ کھانے کپڑے میں سادگی برتی؛ فلسفیانہ تحریریں شائع کیں؛ ہم وطنوں کو پابندیِ مذہب کی تاکید کی۔ رفتہ رفتہ حکیموں کی ایک کثیر جماعت اس کے خیالات سے فائدہ اٹھانے لگی۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ مختلف باغوں اور دریا کے کنارے پر اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے سمجھایا کرتا۔ یہ طبیعت کا بہت آزاد تھا اور انتہا درجے کا خوش تقریر تھا۔ اس کی [illegible] نکتہ سنجیاں آخر میں اس کے ہم وطنوں کے لیے رشک و حسد کا باعث ہوئیں۔ ایک شاعر نے اس کی [illegible] یہ [illegible] جوانانِ ایتھنس کے اخلاق کو خراب کرتا ہے اور لڑکوں کو سکھلاتا ہے کہ اپنے والدین کی [illegible] عدالت نے اسی بنا پر سقراط کو مجرم ٹھہرایا۔ تحقیقات کی گئیں۔ نتیجتاً اس کو صاف گردن زدنی ثابت کیا گیا [illegible] کیا گیا۔ اس کے احباب نے رہائی کی بہتیری صورتیں نکالیں۔ خود داروغۂ جیل اس کے بھاگ جانے پر راضی ہو گیا [illegible] جس وقت اس ارادے کی خبر دی گئی، اس نے [illegible] کیا اور نہایت استقلال سے یہ بات کی کہ [illegible] سے زہر کا پیالہ دیا گیا۔ اس نے بے تکلف اپنے ہونٹوں سے لگایا اور اپنی جان دے دی۔

سقراط کے خونِ ناحق سے اہلِ ایتھنس کا بعد میں سخت [illegible] ایتھنس کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنی [illegible] کے خمیازے بھگتنے پڑے۔ سقراط کی سوانح عمری زنوفن [illegible] اس کے شاگردوں نے لکھی ہے۔ ان دونوں نے اس کے اقوال کی علیحدہ علیحدہ ترتیب کی ہے، جو دیکھنے کے قابل ہے۔ سقراط نے شادی بھی کی تھی، اس کی بیوی بہت ہی بدمزاج تھی۔ سقراط کے ساتھ اس کے برتاؤ سخت تھے لیکن وہ ہمیشہ [illegible] کے ساتھ پیش آتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی بدمزاجی سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی کج مج سہہ لینے سے یہ [illegible] برداشت کا خوگر ہو گیا۔ ۴۶۸ برس پیشتر حضرت عیسیٰ کے پیدا ہوا اور ۳۹۹ برس قبل وفات پائی۔

سقراط کی رائے میں موجودہ وقت کو کسی آنے [illegible] بڑی غلطی ہے۔ وہ کسی چیز کا یقین

انداز کرنا اسی لیے ایک سرے سے فضول سمجھتا ہے۔ اکتسابِ علم کے لیے اس کے خیال میں کسی وقتِ خاص کی قید نہیں، عمر کا ہر حصہ انسان کی معلومات کو ترقی دے سکتا ہے۔ اس کی رائے میں کتب بینی ہی ایک عیش ہے، جو ہر شخص کا اختیاری امر ہے۔ وہ ایک جاہل کو واجب الرحم سمجھتا ہے، مگر اس سے بھی زیادہ اس شخص کی ہمدردی کرتا ہے، جس کا مربی کوئی بد تہذیب اور تاریک خیال کا آدمی ہو۔ وہ کہتا ہے: عالی ظرف کی پہچان یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی معزز برتاؤ ہو۔ زیادہ سے زیادہ کوششیں اس کی یہیں تک محدود ہوں کہ دشمن کو تکلیف دینے سے محفوظ رہ سکے۔ غیبت کرنے والوں یا ایسے لوگوں کو، جن کو دوسروں کی برائی میں دل چسپی ہوتی ہے، وہ شریف نہیں سمجھتا۔ ان کے ساتھ انتہائی رعایت یہ ہے کہ ان کو کمینہ کہا جائے۔ آخر میں وہ ہر شخص کو اپنی کانشنس (Conscience) کی پیروی کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے زور دے کر یہ بات بتائی کہ صرف اصلیت پر نظر ہونی چاہیے۔ اس سے غرض نہیں، دوسرے کیا سمجھتے ہیں۔ وہ عام مقبولیت کی خواہش کو ایک طرح سے جنون سمجھتا ہے۔

ایک مقام پر اس نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات لکھی ہے۔ کہتا ہے کہ: "میں نہیں سمجھتا، کیونکر لوگ عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں، کسی بات کی صحت پر ان کو یقینِ کامل ہوتا ہے، تاہم وہ اس پر کاربند نہیں ہوتے، شاید کوئی خارجی اثر وجہ مزاحمت ہو، مگر میں سمجھتا ہوں، ان کے ارادے ہی کا یہ نقص ہے۔ مجھے آج تک کوئی بات ایسی نہ ملی جس کی سچائی کا یقین ہو اور نہ کر گزرا ہوں۔ لوگ کچھ ہی سمجھا کریں، مجھے ان کی مخالفت کی قطعی پروا نہیں، اس لیے میں ان کو داخلِ جمادات سمجھتا ہوں۔

[افاداتِ مہدی]

۲.۳ مشکل الفاظ کے معانی:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
رعایت	لحاظ	باقتضائے آئین	دستور کے مطابق	وضع	حالت
نکتہ سنجیاں	نکتہ آفرینیاں	گردن زدنی	قتل کیے جانے کے لائق	خون ناحق	بے جرم قتل
خوگر	پیکر، عادی	رائیگاں کرنا	ضائع کرنا	پس انداز کرنا	بچانا
کتب بینی	مطالعۂ کتب	واجب الرحم	رحم کے قابل	مربی	مہربانی کرنے والا، محسن
تاریک خیال	سطحی خیال	مزاحمت	مقابلہ	جمادات	پتھر

۳.۳ خلاصہ:

اس مضمون میں مہدی افادی نے یونان کے عظیم فلسفی سقراط کی شخصیت اور اس کے بعض افکار وخیالات پر روشنی ڈالی ہے۔ سقراط ایتھنس میں ۴۶۸ ق۔م میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک بت تراش تھا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق: سقراط پہلے پہل فوج میں بھرتی ہوا۔ اس نے لڑائیاں بھی لڑیں۔ ذنوفن اور ایلسی بائیڈیز جیسے صاحبانِ فن کی جان بچائی اور بدلے میں ان کی محبت پائی۔ سقراط مذہب کا مبلغ تھا اور سادگی پسند تھا۔ جب اس کی علمی دسترس بڑھی، تو باغوں اور دریا کے کنارے شاگردوں کو درس دینے لگا، لیکن لوگوں نے حسد کے مارے یہ مشہور کر دیا کہ سقراط نوجوانوں کا اخلاق تباہ کر رہا ہے اور انھیں والدین کی اطاعت سے منحرف کر رہا ہے۔ اسی ناکردہ جرم کی پاداش میں اسے زہر کا پیالہ پینے کی سزا دی گئی۔ سقراط کی سوانح ذنوفن اور افلاطون نے مرتب کی اور اس کے اقوال کو بھی جمع کیا۔ سقراط کی بیوی بدمزاج تھی اور سقراط نرم خو۔ چنانچہ اس بات نے اسے صبر و برداشت کا پیکر بنا دیا۔ اس کے خیال میں علم حاصل کرنے کی کوئی خاص عمر نہیں ہے۔ وہ کتاب کے مطالعہ کو عیش اور جاہل آدمی کو قابلِ رحم سمجھتا تھا۔ وہ غیبت کرنے والے کو شریف نہیں سمجھتا۔ وہ عقل و شعور کی پیروی کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ عقل کی مخالفت کرنے والوں کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ سچائی کا تعلق عمل کے ساتھ ہے۔ انسان جسے سچ سمجھے، اس پر کاربند بھی ہو اور مخالفت کی کوئی پروا نہ کرے۔

۳.۴ اہم نکات:

۱۔ سقراط ایتھنس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک بت تراش تھا۔

۲۔ سقراط نے سب سے زیادہ زور سادگی اور مذہب کی پابندی پر دیا۔

۳۔ وہ ایک آزاد منش انسان تھا اور ایک بہترین مقرر بھی۔

۴۔ ایک غلط الزام پر سقراط کا خونِ ناحق ہوا۔

۵۔ سقراط کی بیوی کی بدمزاجی نے سقراط کو برداشت کا پیکر بنا دیا۔

۶۔ سقراط کا قول ہے: کتب بینی عیش ہے اور جاہل قابلِ رحم۔

۷۔ شریف آدمی غیبت نہیں کرتا۔

۸۔ عام مقبولیت کی خواہش جنون ہے۔

۹۔ سچائی پر یقین ہو، تو اس پر عمل بھی لازمی شرط ہے۔

۵.۳ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: سقراط کی رائے میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تاریک خیال آدمی ہو۔

سبق کا عنوان: سقراط

مصنف کا نام: مہدی افادی

سیاق وسباق:

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف نے سقراط کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ یونان کے شہر ایتھنس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک بت تراش تھا۔ وہ ابتدائے عمر میں فوج میں بھی شامل ہوا، لیکن اس کا اصل میدان فلسفہ اور فلسفے کی تدریس تھا۔ اس پر ایک غلط الزام عائد ہوا اور اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ سقراط کی بدمزاج بیوی نے اسے برداشت کا خوگر بنا دیا تھا۔ تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف نے سقراط کے بعض افکار وخیالات کو پیش کیا ہے۔

تشریح:

تشریح طلب اقتباس میں مصنف نے سقراط کے افکار ونظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان افکار کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سقراط حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی تین سو سال بیشتر ایسے افکار کا مالک تھا کہ جن کی اہمیت آج کے جدید دور میں بھی برقرار ہے۔ سقراط کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں۔ انسان پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے حال کے لمحات کو پوری محنت اور دیانت داری سے استعمال میں لا کر اپنے لیے اور اپنے معاشرے کے لیے مفید بنانے کی کوشش کرے۔ وہ لوگ جو آج کا کام کل پر ٹال دیتے ہیں، ان کا حال تو کیا، مستقبل بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اسی طرح سقراط مستقبل کے خوف سے حال میں بچا بچا کر اور جوڑ جوڑ کر رکھنے اور بچانے کے بھی خلاف ہے اور اسے ایک فضول حرکت سمجھتا ہے۔ سقراط کا یہ خیال کتنی صحت رکھتا ہے کہ علم کے حصول کی نہ کوئی عمر ہے، نہ وقت کی قید۔ انسان اپنی عمر کے جس حصے میں بھی چاہتا ہے کہ اس کی علمی وفکری کوتاہیوں کا ازالہ ہو جائے، تو وہ حصولِ علم کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس پر یہ اعتراض ہرگز نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کی عمر کیا ہے اور یہ وقت حصولِ علم کے لیے موزوں ہے یا نہیں؟ سقراط کے خیال

میں دنیا میں: عیش وعشرت اور حصولِ مسرت کا سب سے بڑا ذریعہ کتابوں کا مطالعہ ہے۔ یہ وہ عیش ہے کہ جو ہر شخص اپنے لیے ممکن بنا سکتا ہے۔ کتاب صرف عالموں کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ کم عقل اور کم علم لوگوں کے لیے بھی دلچسپی اور مسرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ سقراط کی یہ بات کتنی اہم ہے کہ دنیا میں سب سے قابلِ رحم ہستی غلام، غریب یا بیمار کی نہیں ہے، بلکہ ایک جاہل آدمی کی ہے اور اس سے بھی زیادہ ہمدردی کا مستحق وہ شخص ہے کہ جس کا آقا بدتہذیب اور سطحی خیالات کا حامل ہو۔ سقراط کے عہد میں چونکہ غلام داری کا نظام تھا، اس لیے سقراط نے آقاؤں کے لیے اس بات کو ضروری قرار دیا ہے کہ وہ شائستہ، مہذب اور باوقار ہوں اور ان کی اس تہذیب وشائستگی سے ان کے غلام بھی مستفید ہوں۔

خود آزمائی:

ا۔ درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

الف۔ سقراط کہاں پیدا ہوا؟

(i) ایران (ii) فرانس (iii) ایتھنس

ب۔ سقراط نے عیسیٰ کی پیدائش سے کتنے برس قبل وفات پائی؟

(i) ۴۲۸ (ii) ۴۲۹ (iii) ۳۹۹

ج۔ سقراط کی بیوی کیسی تھی؟

(i) خوش مزاج (ii) سگھڑ اور گھریلو (iii) بدمزاج

د۔ سقراط کے خونِ ناحق پر ایتھنس کے لوگوں کو کیا محسوس ہوا؟

(i) خوشی (ii) اطمینان وسکون (iii) سخت پشیمانی

ہ۔ سقراط کے نزدیک: انسان کے علم حاصل کرنے کی عمر کون سی ہے؟

(i) بچپن (ii) جوانی (iii) عمر کا ہر حصہ

و۔ سقراط جاہل آدمی کو کیا سمجھتا ہے؟

(i) نادان (ii) واجب الرحم (iii) واجب القتل

ز۔ سقراط غیبت کرنے والوں کو کیا نہیں سمجھتا؟

(i) شریف　　　(ii) ظالم　　　(iii) خود مختار

۲۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔

الف۔ سقراط کا باپ پیشے کے اعتبار سے کیا تھا؟

ب۔ سقراط نے ایک لڑائی میں کن دو لائق شخصوں کی جان بچائی؟

ج۔ سقراط نے کن کن چیزوں میں سادگی کو اختیار کیا؟

د۔ سقراط کا فلسفہ و حکمت کی تعلیم دینے کا طریقہ کیا تھا؟

ہ۔ ایک شاعر نے سقراط کی ہجو میں کیا لکھا؟

۳۔ سقراط کے افکار و نظریات پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۴۔ مضمون کے مطالعے کے بعد آپ کے ذہن میں سقراط کی شخصیت کے کون کون سے پہلو اجاگر ہوئے ہیں وضاحت کریں۔

۵۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

کم عمری ۔ فراست ۔ خونِ ناحق ۔ استقلال ۔ مزاحمت

۴۔ خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے بلند مرتبہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے گہری محبت اور عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف سے ان کا شغف بہت گہرا تھا۔ ان کے صوفیانہ افکار وخیالات ان کی بیشتر تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔ خواجہ حسن نظامی دلّی میں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ دلّی کے علمی اور ادبی ماحول نے ان کی تربیت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کی نثر کی خوبی یہ تھی کہ وہ معمولی اور ادنیٰ درجے کی چیزیں اور باتوں کہ جن کو عام زندگی میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، وہ ان کے بیان میں تہذیب واخلاق کے ایسے ایسے پہلو اور نکات ڈھونڈ نکالتے تھے کہ اس حوالے سے کوئی دوسری مثال کا ملنا بہت دشوار ہے۔ ان کی تحریر میں جہاں: طنز ومزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے، وہاں: ہمدردی، اخلاق، اخلاص اور محبت کا پہلو بھی بہت واضح دکھائی دیتا ہے۔ اپنے عہد میں "مخزن" جیسے بڑے رسائل میں چھپنے والے ان کے مضامین اردو ادب کا اثاثہ ہیں۔ مضامین کے علاوہ ان کی کہانیاں اور افسانے بھی ان کے اس خاص اسلوب کی غمازی کرتے ہیں۔ صوفیانہ افکار کی آمیزش کے باوجود ان کی نثر انتہائی سادہ اور رواں ہے۔ خواجہ حسن نظامی پیری مریدی کا سلسلہ بھی رکھتے تھے۔ ہندوستان بھر میں ان کے سیکڑوں مرید تھے۔ بقولِ حافظ محمود شیرانی: آپ ایک کامیاب پیر تھے۔ صحافت کے میدان میں بھی آپ کا زورِ قلم کچھ کم نہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں "رعیت" کے عنوان سے ایک روزنامہ بھی جاری کیا۔ اس کے علاوہ کئی رسائل کے ایڈیٹر، نگران اور سرپرست بھی رہے۔ انھوں نے پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں، جن میں سے: 'غدر کے افسانے'، 'بیگمات کے آنسو'، 'سفرنامہٗ ہندوستان'، 'سیپارہٗ دل'، 'غالب کا روزنامچہ' اور 'کرشن کتھا' بہت اہم ہیں۔ شاملِ نصاب مضمون ان کی کتاب "سیپارہٗ دل" سے لیا گیا ہے۔ ان کا انتقال ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو دلّی میں ہوا اور بارگاہِ نظام الدین اولیاءؒ کے احاطے میں دفن ہوئے۔

۴.۱ مچھر [متن]:

یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کردی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لیے ٹیمیں تیار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں، مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پاسکتا۔ طرح طرح کے مسالے بھی بناتا ہے کہ ان کی بو

سے مچھر بھاگ جائیں، لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بے چارہ آدم زاد حیران رہ جاتا ہے اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

امیر، غریب، ادنیٰ، اعلیٰ، بچے، بوڑھے، عورت، مرد کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی ان کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے، تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر مچھر اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی، تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسو کے ذریعے سے پھیلتا ہے، ان کو فنا کر دیا جائے، تو یہ ہولناک وبا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا، تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اِس سرے سے اُس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو؛ مچھروں کو کچل ڈالو؛ مچھروں کو تہس نہس کر دو اور ایسی تدبیریں نکالیں، جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سُن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے "پائنیر" کو آکر دیکھتا اور اپنی بُرائی کے حروف پر بیٹھ کر اس میں خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا، جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے فائدے کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا کہ میاں! تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

انسان کہتا ہے کہ: مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے کرکٹ؛ میل کچیل سے پیدا ہوتا ہے اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو! اس وقت حملہ کرتا ہے، جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا؛ بے خبر کے چرکے لگانا مردانگی نہیں؛ انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو! کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں، بے ڈول چہرہ، اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے، خوش وضع، پیاری ادا کی دشمنی: بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو، تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے، تو مقابلہ کیجیے۔ ذات وصفات نہ دیکھیے۔ میں کالا سہی؛ بدرونق سہی؛ نیچ ذات اور کمینہ سہی، مگر یہ تو کہیے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کی ناک میں دم کرتا ہوں؟ یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر نا انصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر الٹی میٹم دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ، اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل -

رہو، تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کردے گا کہ میدانِ جنگ میں کالا بھتنا؛ لمبے لمبے پاؤں والا؛ بے ڈول فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا؛ آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں؟ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے، جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا؟ کون اس پر غالب آیا؟ کس کے سبب اس کی خدائی ختم ہوئی؟ اگر آپ نہ جانتے ہوں، تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیے یا مجھ سے سنیے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو، میں تمھارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے، تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کرلو۔ دیکھو! وہ میری شان میں کیا کہے گا؟ کل ایک شاہ صاحب عالمِ ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانے میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے، باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں، تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کریں اور حمد و شکر کے گیت گائیں۔ اس لیے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے: اٹھو میاں اٹھو! جاگو جاگنے کا وقت ہے؛ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا، تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے، مگر انسان اس سُریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے، تو وہ مجبور ہو کر غصے میں آجاتا ہے اور اس کے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر ڈنگ مارتا ہے۔ پر واہ رے انسان! آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے، تو بے چارے مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جنابِ عالی! کتنے سیکنڈ جاگے تھے، جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے؟

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سُن کر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے، ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں، بلکہ میں دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے، قدم چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوئی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔ [سیپارۂ دل]

۴.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
بالاتفاق	اتفاق کے ساتھ	یورش	حملہ	بھنگے	کیڑے
آدم زاد	آدمی	اطاعت	فرمانبرداری	ایجی ٹیشن	احتجاج
تہس نہس کرنا	برباد کرنا	ریمارک	تبصرہ	چرکا لگانا	زخم لگانا
بے ڈول	بدوضع	تقدیس	پاکیزگی	صلواتیں سنانا	گالیاں نکالنا
عارفانہ کلمات	معرفت کی باتیں	ندامت	شرمندگی		

۴.۳ خلاصہ:

مچھر بظاہر ایک معمولی سی مخلوق سمجھی جاتی ہے، لیکن خواجہ حسن نظامی نے اس چھوٹی سی مخلوق کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ مچھر انسانوں کی رات کی نیند کو حرام کر دیتا ہے۔ اسے بھگانے اور مارنے کے لیے طرح طرح کی دوائیں اور مسالے تیار کیے جاتے ہیں، لیکن انسان کی کوئی بھی تدبیر ان کے خلاف کامیاب نہیں ہو پاتی۔ انسان کو اپنی طاقت اور ذہانت پر بہت ناز ہے، لیکن یہ چھوٹا سا مچھر اسے شکست دے دیتا ہے۔ انسان تو کیا، انسان کے پالتو جانور بھی اس کے کاٹنے سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس کے باعث طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ طاعون بھی اسی کے کاٹنے سے پھیلتا ہے اور ملیریا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی مچھر کا جانی دشمن بنا ہوا ہے اور اس کی بربادی کی تدبیریں کرتا رہتا ہے۔

مچھر کو اپنے خلاف انسانوں کی کارگزاریوں سے کوئی خوف نہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انسان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ انسان اسے کمینہ، بدذات اور کالا بھتنا کہتا ہے۔ انسان کا خیال ہے کہ مچھر بزدل ہے۔ وہ اس وقت انسان پر وار کرتا ہے، جبکہ وہ سویا ہوا ہوتا ہے اور سوئے ہوئے دشمن پر وار کرنا مردانگی نہیں۔ جواب میں مچھر یہ کہتا ہے کہ یہ بات سراسر غلط ہے، وہ تو کان میں آکر پہلے الٹی میٹم دیتا ہے کہ اٹھو اور مقابلہ کرو، لیکن غافل انسان سویا رہتا ہے۔ انسان بھول بیٹھا ہے کہ نمرود کا غرور بھی اسی نے توڑا تھا۔

ایک شاہ صاحب مچھر کے بڑے قدردان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مچھر رات کو اللہ کی حمد بیان کرتا ہے۔ وہ کاٹتا نہیں،

بے خبر سوئے ہوؤں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی اٹھیں اور اللہ کی عبادت کریں، لیکن مچھر شاہ صاحب کو وظیفہ پڑھنے کے دوران پاؤں پر کاٹتا ہے۔ وہ اسے شاہ صاحب کی قدم بوسی قرار دیتا ہے، لیکن اس بات سے اس کی ندامت دور نہیں ہوتی۔

۴.۴ اہم نکات:

۱۔ مچھر بلاتفریق رنگ، نسل اور مذہب سب انسانوں کا دشمن ہے۔

۲۔ مچھروں کے کاٹنے سے انسان کے پالتو جانور بھی محفوظ نہیں ہیں۔

۳۔ طاعون اور ملیریا کا سبب مچھر اور پسو کو سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ انسان کو گلہ ہے کہ مچھر بزدل ہے اور سوتے میں وار کرتا ہے۔

۵۔ مچھر کو اس بات پر فخر ہے کہ نمرود کا خاتمہ بھی اسی نے کیا۔

۶۔ شاہ صاحب مچھر کی زندگی کے دل سے قدردان ہیں۔

۷۔ مچھر شاہ صاحب کے پاؤں پر کاٹنے کو ان کی قدم بوسی قرار دیتا ہے، لیکن اس بات سے خود اس کی اپنی ندامت کم نہیں ہوتی۔

۴.۵ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''انسان کہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جہالت اسی کو کہتے ہیں''۔

سبق کا عنوان: مچھر

مصنف کا نام: خواجہ حسن نظامی

سیاق وسباق:

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف نے مچھر کے بارے میں بتایا ہے کہ ہندو، مسلمان، یہودی، امیر، غریب، گورا، کالا غرض ہر شخص مچھر کا دشمن ہے اور اسے برباد کرنے کی تراکیب ڈھونڈتا رہتا ہے۔ تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف

کہتے ہیں کہ مچھر انسان کے الزامات کا بھرپور جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ نمرود کا خاتمہ بھی اسی نے کیا تھا۔ مصنف کے خیال میں مچھر کی زندگی ایک شب بیدار صوفی کی مانند ہوتی ہے۔ مچھر چونکہ اپنی فطرت سے مجبور ہے، اس لیے شاہ صاحب کے پاؤں پر بھی کاٹ لیتا ہے، لیکن وہ اسے بزرگوں کی قدم بوسی سمجھتا ہے۔

تشریح:

اس اقتباس میں مصنف نے انسان کے ان الزامات کا ذکر کیا ہے کہ جو وہ مچھر پر لگاتا ہے۔ انسان مچھر کو کم ذات سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ مچھر ایسی ذلیل اور حقیر مخلوق ہے کہ جو کوڑے کرکٹ اور گندی جگہوں میں پرورش پاتی ہے۔ انسان بڑے بڑے آرام دہ اور صاف ستھرے گھروں میں رہتے ہیں، جبکہ مچھر گندی اور غلیظ موریوں میں دن بھر چھپا رہتا ہے۔ مچھر سے بڑھ کر بے غیرت اور نامرد ہستی کوئی نہیں ہے کہ یہ انسان پر اس وقت حملہ آور ہوتا ہے، جب انسان دن بھر کے کام کاج کے بعد آرام وسکون کی نیند سویا ہوا ہوتا ہے۔ اگر مچھر مرد ہوتا، تو مردانہ وار آتا اور پہلے اپنے حملے کی انسان کو خبر کرتا کہ اُٹھو اور میرا مقابلہ کرو، مگر افسوس ایسی پیچ مخلوق سے مردانگی کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ سوتے ہوئے انسان پر وار کرنا، تو انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ مچھر کو اس بات کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہے کہ رتبے اور مقام میں انسان اور مچھر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مچھر کے تو لمبے لمبے پاؤں ہوتے ہیں؛ شکل وصورت سے بالکل کالا بھتنا لگتا ہے؛ چہرہ بھی عجیب بدوضع سا ہوتا ہے، لیکن افسوس اس نے جس انسان کو دشمن جانا، اسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے، اسے گورا رنگ، اچھی شکل وصورت اور خوب صورت ادائیں عطا فرمائی ہیں۔ مچھر کی یہ بے عقلی اور جہالت نہیں ہے، تو پھر کیا ہے کہ وہ اللہ کی سب سے پسندیدہ مخلوق کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اسے تکلیف پہنچاتا ہے اور بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی باز پرس سے بچا رہے، تو اسے یہی زیب دیتا ہے کہ فوری طور پر انسان کی دشمنی سے ہاتھ کھینچ لے۔

خود آزمائی:

ا۔ مختصر جواب تحریر کریں۔

الف۔ سبق "مچھر" خواجہ حسن نظامی کی کس کتاب سے لیا گیا ہے؟

ب۔ انسان مچھر کو اپنا دشمن کیوں خیال کرتا ہے؟

ج۔ طاعون اور ملیریا جیسی بیماریاں کون پھیلاتا ہے؟

د۔ مچھر کہاں زندگی بسر کرتا ہے؟

ہ۔ مچھر انسان پر کب وار کرتا ہے؟

و۔ مصنف کے خیال میں مچھر کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟

ز۔ مچھر شاہ صاحب کے پاؤں پر کاٹنے کو کیا سمجھتا ہے؟

۲۔ درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

الف۔ مچھر بھنبھناتا ہو نہا:

(i) پرندہ ہے (ii) کیڑا ہے (iii) جانور ہے۔

ب۔ حضرت میں تو کان میں آ کر:

(i) اذان دیتا ہوں (ii) آواز دیتا ہوں (iii) الٹی میٹم دیتا ہوں

ج۔ آدمی غفلت میں پڑے:

(i) گاتے (ii) سوتے (iii) گرتے ہیں

د۔ بزرگوں کے قدم قابل ہوتے ہیں:

(i) چھونے کے (ii) دھونے کے (iii) چومنے کے

۳۔ درج ذیل اقتباس کی تشریح بحوالہ سیاق وسباق کریں۔

''کل ایک شاہ صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جاگو جاگنے کا وقت ہے''۔

۴۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

ا۔ 'مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی'۔

ب۔ 'مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں'۔

ج۔ 'حضرت! میں تو کان میں آ کر الٹی میٹم دیتا ہوں'۔

۵۔ سبق 'مچھر' کا خلاصہ تحریر کریں اور مصنف کا نام بھی لکھیں۔

۵۔ مولانا صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد ۲۵ مارچ ۱۹۰۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ لاہور کی علمی اور تہذیبی فضا نے ان کے افکار و خیالات اور شخصیت پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ ان کے والد احمد بخش چیفس کالج لاہور میں فارسی کے استاد تھے اور والدہ شیخ عبدالقادر کی صاحبزادی تھیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اپنی تعلیم مسلم ہائی اسکول لاہور اور اعلیٰ تعلیم سناتن دھرم کالج لاہور میں پائی۔ ادب کی طرف ان کا فطری میلان تھا۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی میں ایک ادبی رسالہ "خیالستان" جاری کیا۔ عملی زندگی کا آغاز پولیس کی ملازمت سے کیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا، تو ملازمت کو خیر باد کہہ کر انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک میں شمولیت اختیار کرلی۔ انھوں نے آزادی کے خواب کی تکمیل کے لیے صحافت میں قدم رکھنا ضروری سمجھا۔ یہی وہ میدان تھا کہ جس میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی نے "ادبی دنیا" کے نام سے لاہور سے ایک رسالہ جاری کیا کہ جسے منصور احمد نے اپنی ادارت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا، تو اس رسالے کی ادارت کا منصب مولانا صلاح الدین احمد کو حاصل ہوا۔ مولانا کے بیشتر مضامین بھی اسی رسالے میں شائع ہوئے۔

مولانا صلاح الدین احمد کا مجموعۂ مضامین "صریرِ خامہ" تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں: اقبال اور فکرِ اقبال سے متعلق مضامین ہیں۔ جلد دوم میں: اردو کے افسانوی ادب پر اعلیٰ پائے کے مضامین شامل ہیں، جبکہ جلد سوم میں: محمد حسین آزاد کے فکر وفن پر مضامین شامل ہیں۔ مولانا کی تحریر میں ہمیں محمد حسین آزاد، مہدی افادی، یلدرم اور ابوالکلام آزاد کے اسلوب کی سی رنگینی، شگفتگی اور دلآویزی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تحریر میں حقیقت، خواب، خیال اور جذبہ ہم رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ نصاب میں شامل مضمون ان کی کتاب "صریرِ خامہ" سے لیا گیا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے ۱۴ جون ۱۹۶۴ء کو وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہوئے۔

۵.۱ وطن اور ملت [متن]

پاکستان کے قیام سے پہلے اسلامیانِ ہند کے دل جس جذبے سے سرشار تھے، وہ وحدتِ ملت کا جذبہ تھا اور اگرچہ اس جذبے نے ہمارے فکر وشعور سے وطنیت کو یکسر مٹا دیا، لیکن یہی جذبہ بالآخر ہمارے وطن کے قیام کا باعث بنا۔ تاریخ کا یہ ایک حیرت انگیز معما اور ایک گہرا راز ہے، جسے پوری صحت اور قطعیت سے حل کر لینا ممکن نہیں۔ بہر حال جہاں تک ہماری

زندگی کے موجودہ تقاضوں کا تعلق ہے۔ اس بات کا فیصلہ کر لینا نہ صرف موزوں، بلکہ ضروری ہے کہ ہمارا قومی نصب العین کیا ہے H یا اس کے حصول کا سیدھا راستہ کون سا ہے اور ہماری وطنیت اور ملت اس کی کس حد تک معاون یا مخالف ہو سکتی ہے؟

اسلامی ہند میں جذبۂ ملت کا فروغ اور پھر اس فروغ کے نتیجے میں ایک قومی وطن کی آفرینش بظاہر ایک تاریخی معمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے قیام سے کم و بیش ربع صدی پیشتر اس مردِ عظیم کے افکار، جس نے ہمیں پاکستان کا تصور دیا، وطن اور وطنیت کے استخفاف کو مسلسل اپنا محور بنا رہے تھے، لیکن جب مفکرِ اسلام نے اپنے شاعرانہ الہامات کی موجودگی میں ایک وقفۂ قلیل کے لیے مسلمانانِ ہند کی عملی سیاسیات کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، تو انھیں شمال مغربی ہندوستان نے ایک اسلامی وطن کے قیام کی دعوت دی۔ وہ خواب جسے ٹیپو سلطان نے بھی دیکھا اور عبدالحمید ثانی نے بھی، جمال الدین افغانی نے بھی دیکھا اور خود مفکرِ اسلام علاّمہ اقبال نے بھی۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملت اور مقاصدِ ملت کے امکانات و فروغ کے سلسلے میں جب شاعرِ مشرق نے جذبات سے افکار کی طرف انحراف کیا، تو اسے مومن کی تگ و تاز کے لیے اس جہان کی وسعتیں اور اس کے سفینے کے سفر کے لیے بحرِ امکان کی ناپیدا کناریاں بے کار اور بے معنی نظر آئیں اور اس نے اپنے تاریخی خطبے میں مسلمانوں کو اس ملک کے شمال اور مغربی کونے میں ایک قومی وطن کی تاسیس و تشکیل کی دعوت دی۔ شاعر آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں سے اُتر کر زمین کے ایک تنگ ٹکڑے کی حدود میں ملت اور اس کے مفاد کو محصور و محدود کرنے پر نہ صرف آمادہ ہو گیا، بلکہ اسی میں اس کو اس کی نجات بھی نظر آئی۔

زمین آخر زمین ہے اور ہمارے تخیل کی ہزار پروازیں اور ہماری آرزوؤں کی ہزار رفعتیں بھی اسے آسمان نہیں بنا سکتیں اور حقیقت کی دنیا میں ہمیں آسمان سے زیادہ ضرورت زمین ہی کی ہے، تاکہ آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو اور اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر اس کے فرماں بردار بندے متصرف ہو کر اسے اپنا وطن بنائیں اور اس وطن کی حفاظت میں، اگر ضرورت پڑے، تو اپنی جانیں، اپنا مال اور اپنی اولاد قربان کر دیں۔

اقبالؒ نے جب ہمیں پاکستان کا تصور دیا، تو یہ بلاشبہ اس کے آفاق گیر تصورِ ملت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کی رجعت ایک حقیت پرستانہ رجعت تھی۔ ملتِ اسلامیۂ ہند کو اپنے تحفظ اور اپنے فروغ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کسی بحرِ بے پایاں یا کسی آسمانِ بے کراں کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے خطۂ زمین کی حاجت تھی، جس میں سما کر یا سمٹ کر یا پھیل کر اسے ایک آزاد اسلامی زندگی بسر کرنی تھی۔

خداوند تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہماری یہ ضرورت ایک حد تک پوری ہوئی۔ یہاں اس بحث میں الجھنا بے سود ہوگا کہ ہم میں سے کتنے اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ مندہ ہوئے، لیکن جس قدر بھی بہرہ مند ہو سکے، ان کے لیے نجات و فلاح کا

ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ وطن کی والہانہ محبت کے مرغزار میں ہو کر نکلتا اور اس فوزِ عظیم کی طرف بڑھتا ہے، جو مومن کی منزلِ مقصود ہے۔

جب اپنے ملی مفاد کی حفاظت اور اپنے ملی مقاصد کے فروغ کے لیے ہم نے ایک وطن حاصل کر لیا ہے، ہمارے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کو تمام دیگر فرائض پر ترجیح دیں، کیونکہ نہ صرف ہمارے اعمالِ حسنہ؛ نہ صرف ہمارے مقاصدِ ملی، بلکہ خود ہماری ہستی؛ ہماری جانیں اور ہمارے جسم؛ ہمارے گھر بار اور ہمارے مواقع اور ہمارے امکانات اس کی سلامتی سے وابستہ ہیں۔ اگر ہمارا وطن قائم رہے گا، تو ہمیں خدمتِ دین اور تعمیرِ ملت کے موقعے بھی ملیں گے؛ ہم اعلائے کلمۃ اللہ بھی کر سکیں گے اور حقوقِ انسانیت بھی ادا کر پائیں گے، لیکن اگر خدانخواستہ وطن کو ضعف پہنچا یا ملک پر آفت آئی، تو نہ ہم بچے رہیں گے اور نہ ہماری مسلمانی اور خاکم بدہن ملک کا زوال ملت کا زوال بن جائے گا۔

جہاں تک اس برِ عظیم کا تعلق ہے، قیامِ پاکستان کے بعد ہمارا محاذ یکسر بدل چکا ہے۔ اب وطن اور ملت کے مفاد متضاد نہیں رہے، بلکہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور ایک کا فروغ، دوسرے کی ترقی کا ضامن ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہم پر ایک نئی ذمہ داری بھی عائد ہو گئی ہے اور وہ ہے غیر مسلم پاکستانیوں کی ذمہ داری۔ ظاہر ہے کہ قیامِ پاکستان میں ان کی کسی قسم کی آرزوؤں نے حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ خود بخود اس کے حصے میں آ گئے۔ انھیں مفید شہری بنانے کے لیے اور ان کے اور اپنے درمیان ایک بنیادی ہم آہنگی اور ہم مقصدی کے لیے لازم ہے کہ ہمارے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو، جس کے تقدس سے نہ انھیں مجالِ انکار ہو اور نہ ہمیں یارائے انحراف۔ ظاہر ہے کہ یہ نصب العین وطن پروری اور وطن دوستی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی نصب العین ان کی وفاداری کا ضامن اور مملکت کی سلامتی کا سہارا ہو گا اور اسی وجہ سے ملک کی اکثریت اور اقلیت ہاتھوں میں ہاتھ دیے آگے بڑھیں گی اور ملک کی فلاح و بہبود میں برابر کا حصہ لیں گی۔

اب کہ ہم آزاد ہیں۔ ہماری وطن دوستی ہمارے ملی روابط پر غالب نہ آئے گی اور نہ انھیں نقصان پہنچائے گی اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم شاعرِ اسلام کی اس آرزو کو بر لانے کے لیے ہمیشہ سربکف رہیں گے:

ایک ہوں مسلم، حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

[صریرِ خامہ]

۵.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
وطنیت	وطن پرستی	قطعیت	حتمیت	ربع	چوتھائی
الہامات	الہام کی جمع	اقطاع	قطع کی جمع	عیاں	ظاہر
رفعتیں	بلندیاں	متصرف ہونا	استعمال میں لانا	رجعت	واپسی
بے کراں	بے کنار	حاجت	ضرورت	فوزِ عظیم	
اعمالِ حسنہ	اچھے اعمال	ضعف	کمزوری	آفت	مصیبت
خاکم بدہن	میرے منہ میں خاک	فروغ	بڑھاوا	وطن پروری	وطن کو ترقی دینا

۵.۳ خلاصہ:

اس مضمون میں مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کے وحدتِ ملت کے تصور سے لے کر تصورِ وطن تک اور پھر اس حوالے سے مثالی ریاست پاکستان کے قیام تک اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اسلامیانِ ہند ہمیشہ سے وحدتِ ملت کے قائل تھے۔ وطن پرستی کا جذبہ تقریباً ختم ہو چکا تھا، لیکن علامہ اقبال نے جب جذبات کی بجائے فکر کو راہنما بنایا، تو انھوں نے لازم جانا کہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا قیام ضروری ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اصولوں پر عملدرآمد کے لیے کسی خطۂ زمین کا انتخاب ضروری ہے۔ اقبال کا خیال درست تھا کہ جب تک مسلمان کسی ریاست میں رہتے ہوئے اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کا دفاع کرنے کے اہل نہ بن پائیں گے، وہ ملت کے وسیع تصور کو بھی نہ سمجھ پائیں گے۔ "پاکستان" دراصل ملت کے اجتماعی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ تعمیرِ ملت کی ذمہ داری سے عہد برآ ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وطن کو مضبوط اور توانا بنایا جائے۔ غیر مسلم پاکستانی بھی پاکستانی ہیں۔ ان کے ساتھ نا صرف اچھے تعلقات ناگزیر ہیں، بلکہ ایک مشترکہ نصب العین بھی ضروری ہے۔ یہی وطن دوستی کا تقاضا ہے۔ ہماری وطن پرستی ایسے اصولوں پر مبنی ہو کہ جن کے باعث ہماری ملی ذمہ داریاں مجروح نہ ہونے پائیں اور ان اصولوں میں سب سے بڑا حصول اتحادِ عالمِ اسلام ہے۔

۵.۴ اہم نکات:

۱۔ وطن اور ملت جدا جدا تصورات نہیں ہیں۔

۲۔ وطن دوستی وحدتِ ملت کے تصور کو وسیع بنا دیتی ہے۔

۳۔ مسلمانانِ ہند کے لیے آزاد وطن کے قیام کا مطالبہ اسلامی تعلیمات کے فروغ اور ان پر عمل کی ایک سنجیدہ اور باوقار کوشش تھی۔

۴۔ ٹیپو سلطان، عبدالحمید ثانی اور جمال الدین افغانی سے لے کر مفکرِ پاکستان علامہ اقبال تک سب کی کوششوں کا مرکز اسلامی ریاست ہی کا قیام تھا اور پاکستان اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

۵۔ مومن کی منزلِ مقصود وطن کی والہانہ محبت کے مرغزار سے گزرتی ہے۔

۶۔ پاکستان میں بلاتفریقِ مذہب کسی مشترکہ نصب العین کی بھی ضرورت ہے تاکہ اکثریت اور اقلیت جو دونوں کے لیے ترقی کا باعث بن سکے۔

۷۔ وطن دوستی کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ملت سے کنارہ کش ہو جائیں۔

۸۔ اتحادِ عالمِ اسلام وقت کی اہم ضرورت ہے۔

۵.۵ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''اقبال نے جب ہمیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسلامی زندگی کی بسر کرنی تھی''۔

سبق کا عنوان: وطن اور ملت

مصنف کا نام: مولانا صلاح الدین احمد

سیاق وسباق:

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف نے بتایا ہے کہ علامہ اقبال کے تصورِ پاکستان سے قبل ہندوستان کے مسلمان ملتِ اسلامیہ کی محبت میں وطن دوستی کے جذبے کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ اسلامی وطن کے قیام کی دعوت دراصل جمرود

سے لے کر اس کماری تک مسلمانانِ ہند کی شیرازہ بندی تھی، تا کہ مسلمان اسلام کی اعلیٰ تعلیمات پہ خود عمل پیرا ہو کر پوری آزادی کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کا دفاع کر سکیں۔تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایسی تمام کوششوں، جن کے باعث وطن کمزور پڑتا ہو اور ملک پر آفت کا اندیشہ ہو، کا خاتمہ بھی ضروری ہے، کیونکہ ملک کا زوال ملت کا زوال ہے۔اس سلسلے میں ایک مشترکہ نصب العین بھی ضروری ہے، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کا آئینہ دار ہو۔اتحادِ عالمِ اسلام ملتِ اسلامیہ کی بنیادی شرط اور تقاضا ہے۔

تشریح:

تشریح طلب اقتباس میں مصنف نے اقبال کے تصورِ پاکستان کی وضاحت کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کا تصورِ وطن عالمگیر تصورِ ملت سے متضاد نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں تصورات ایک ہی منزل کے حصول کے دو مختلف راستے ہیں۔عام طور پر جب ہم مسلمانوں کے لیے وطن کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں، تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس کے باعث ملت کا وسیع تر نصب العین مجروح ہو جائے گا۔مصنف کے خیال میں حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ان کے خیال میں: اسلام ایک ایسی عالمگیر دعوت ہے کہ جو وطن کی مخصوص سرحدوں کو خاطر میں لائے بغیر ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ایسا اجتماعی زندگی کا تصور دیتی ہے، جو تمام اسلامی ممالک میں یکساں نتائج کے حصول کی ایک صورت پیدا کر دیتا ہے اور یہ نتائج اس وقت تک سامنے نہیں آسکتے، جب تک کہ اسلام کی آفاقی تعلیمات کو دنیا بھر کے اسلامی ممالک اپنی تہذیبی زندگی کا نصب العین قرار نہیں دے دیتے۔چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ امر ضروری قرار پاتا تھا کہ وہ بھی اپنے لیے ایک ایسا وطن قائم کریں کہ جہاں وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے دین کے احکامات پر کاربند ہو کر ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مفادات کے حصول کا ذریعہ بن سکیں۔اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ آزادی کے بغیر اسلامی معاشرے کا پھیلاؤ ایک محدود دائرے سے کبھی نکل نہ پاتا۔جہاں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہوتی ہے، وہ اکثریت اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی معاملات میں آزاد بھی ہوتی ہے۔پاکستان کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا کہ برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو اپنی اسلامی تہذیب و معاشرت کی ترقی اور فروغ میں آزاد کر دیا جائے۔اس حوالے سے دیکھا جائے، تو قیامِ پاکستان کا مطالبہ ہمیں ملتِ اسلامیہ کے تحفظ کا آئینہ دار دکھائی دینے لگتا ہے۔اسلامی طرزِ زندگی کے اصولوں پر عمل کرنے کے لیے بے شک ہمیں کسی بے کراں خلا کی نہیں، ایک خطۂ ارض کی ضرورت تھی۔پاکستان کا قیام اس ضرورت کا ترجمان اور عکاس ہے۔

خود آزمائی:

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں۔

الف۔ وطنیت اور ملت میں کیا فرق ہے؟

ب۔ مفکرِ اسلام نے مسلمانانِ ہند کو کس بات کی دعوت دی؟

ج۔ ٹیپو سلطان، عبدالحمید ثانی اور جمال الدین افغانی کا خواب کیا تھا؟

د۔ پاکستان کے حصول کا مقصد ملی مفاد ہے، کیوں؟

ہ۔ پاکستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مشترکہ نصب العین کیوں ضروری ہے؟

و۔ اتحادِ عالمِ اسلام پر مختصر، مگر جامع نوٹ تحریر کریں۔

۲۔ خالی جگہ پر کریں۔

الف۔ زمین آخر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہے۔

ب۔ ملک کا زوال ملت کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بن جائے گا۔

ج۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارا محاذ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بدل چکا ہے۔

د۔ ہم شاعرِ اسلام کی اس آرزو کو بر لانے کے لیے ہمیشہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رہیں گے۔

۳۔ اعراب لگائیں۔

صحت ۔ ربع ۔ اقطاع ۔انحراف ۔بحرِ امکاں

۴۔ علامہ اقبال کی وطن دوستی پر ان کے دو اشعار لکھیں اور ان کا مطلب بھی بیان کریں۔

۵۔ درج ذیل اقتباسات کی تشریح بحوالہ سیاق وسباق کریں۔ سبق کا عنوان اور مصنف کا نام لکھیں۔

ا۔ ''زمین آخر زمین ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اولاد قربان کر دی۔''

ب۔ ''اس کے ساتھ ہم پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نہ ہمیں یارائے انحراف۔''

۶۔ درج ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

اسلامیانِ ہند ۔ مفکرِ اسلام۔ مقاصدِ ملت۔ فوزِ عظیم۔ تعمیرِ ملت۔

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا عصرِ حاضر میں اردو زبان وادب کا نہایت اہم نام ہے۔ شاعری کا میدان ہو یا تنقید کا، تحقیق کا ہو یا انشائیہ نگاری کا، ڈاکٹر وزیر آغا ایک صاحب اسلوب لکھاری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا منفرد اور جدا طرزِ تحقیق وتنقید ان کو ہم عصر محققین اور نقادوں میں ممتاز اور نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

وزیر آغا وزیر کوٹ (سرگودھا) میں ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد ایران سے پہلے افغانستان آئے اور پھر برطانوی دورِ حکومت میں وہاں سے لاہور اور پھر سرگودھا منتقل ہو گئے۔

وزیر آغا نے ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے۔ اکنامکس (معاشیات) کیا۔ ۱۹۵۶ء میں اُردو ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر مقالہ لکھنے پر پنجاب یونی ورسٹی نے ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔

وزیر آغا کی ادبی شہرت اور خدمت کی شروعات 'ادبی دنیا' کے مدیر کی حیثیت سے ہوتی ہیں، جہاں انھوں نے مولانا صلاح الدین صاحب کے ساتھ ادب کی آبیاری کے لیے بہت کام کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد کی وفات کے بعد وزیر آغا نے ۱۹۶۵ء میں اپنا ادبی رسالہ 'اوراق' جاری کیا، جس نے اردو میں تنقیدی اور انشائیہ ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

ان کی گراں قدر تصانیف میں: 'اُردو شاعری کا مزاج'، 'نظم جدید کی کروٹیں'، 'تنقید اور احتساب'، 'نئے تناظر'، 'شام کی منڈیر سے' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے عمدہ شعر کہے اور اچھی شاعری کی۔ ان کی شاعری کے مجموعوں میں: 'آدھی صدی کے بعد'، 'شام اور سائے'، 'نردبان' اور 'دن کا زرد پہاڑ' شامل ہیں۔

۶.۱ ہنسی، مزاح اور انسانی زندگی (متن):

سنجیدگی: کائنات کی ازلی وابدی خصوصیت ہے اور اس کے تمام اجزا میں ایک برقی رو کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ نتیجتاً کائنات کا ہر واقعہ کسی مجبور ستارے کی اڑان سے لے کر مکڑی کے جالے کی تعمیر تک اور زندگی کے ہر ذرے سے لے کر بیج کی حرارتِ پنہاں تک، ایک عجیب سی سنجیدگی سے ہم آہنگ ہے۔ زندگی مجموعی طور پر ایک تیز سوار کی طرح دشت وجبل اور بحر و بر کو عبور کرتی، کسی نامعلوم منزل کی طرف اس انداز سے دیوانہ وار بڑھ رہی ہے کہ:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایسی سنجیدہ کائنات اور ایسی منہ زور زندگی کے زیرِ سایہ انسان کا سنجیدہ کاوشوں اور ٹھوس تعمیری کارناموں میں یکسر

منہمک ہو جانا ایک بالکل فطری امر ہے۔ تاہم یہاں یہ خطرہ ضرور ہے کہ سنجیدہ زندگی کا ایک انتہائی سنجیدہ جزو ہونے کے باعث اس کی انفرادیت یکسر ختم نہ ہو جائے اور وہ محض ایک مشین کی طرح فطرت کے اشاروں پر ناچتا نہ چلا جائے۔ خوش قسمتی سے قدرت نے انسان کو ایک ایسی قوت بھی بخشی ہے، جس سے کام لے کر وہ کائنات کی خوفناک سنجیدگی اور زندگی کی صبر آزما کشمکش پر ہنس سکتا اور مسکرا کر، بلکہ قہقہہ لگا کر، اپنی اس دیوانہ وار پیش قدمی میں دھیما پن پیدا کر سکتا ہے، جو زندگی کے تیز بہاؤ سے ہم آہنگ ہے۔

چنانچہ زندگی کی بے رحم سنجیدگی اور ماحول کی ٹھوس مادیت جو قریب قریب ہر شے کو اپنے فولادی بازوؤں میں جکڑے ہوئے ہے، انسان کے احساسِ مزاح کی حدت سے پگھل کر لچکیلی اور ملائم ہو جاتی ہے۔ یہ احساسِ مزاح ماں کے اس لطیف و دلنواز تبسم کی طرح ہے، جو بچوں کی طفلانہ کاوشوں اور ٹھوس تعمیری کارناموں کے پیشِ نظر نمودار ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ماں کا تبسم تو بچوں کو مزید انہماک کی ترغیب دیتا ہے اور احساسِ مزاح کے طفیل انسان ایک لحظہ رک کر اپنی سنجیدہ کاوشوں اور جذباتیت سے سینچی ہوئی قدروں پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اسے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ لامحدود و لازوال کائنات میں یہ کاوشیں اور قدریں کتنی معمولی حیثیت کی حامل اور کتنی طفلانہ صورت کی امین ہیں۔ مشہور لطیفہ ہے کہ: کسی نے ہائیڈروجن بم کے متعلق پروفیسر آئن سٹائن سے اس کے خیالات دریافت کیے، تو آئن سٹائن نے مسکرا کر جواب دیا: ہائیڈروجن بم سے ہماری زمین کے تباہ ہو جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں اور بالفرض یہ تباہ ہو بھی گئی، تو اس سے اتنی بڑی کائنات میں قطعاً کچھ فرق نہیں پڑے گا۔۔۔۔ یہ احساسِ مزاح اور اس کے مظہر یعنی تبسم، ہنسی اور قہقہہ ہی دراصل اس سنجیدہ کائنات میں ہمیں زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں اور ان ہی کے سہارے ہم زندگی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مگر ایک اور طرح سے بھی یہ احساسِ مزاح انسانی زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کا ذمہ دار ہے اور وہ اس طرح کہ انسان کائنات میں سب سے بڑا خواب پرست ہے اور وہ اکثر و بیشتر اپنی امنگوں اور آزادیوں کے تانے بانے سے ایک ایسا رنگ محل تیار کرتا رہتا ہے، جس کی اساس محض خوابوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس زندگی خواب ہو یا نہ ہو، ایک سپاٹ اور ٹھوس حقیقت ضرور ہے۔ چنانچہ جب اس کی امنگوں اور آرزوؤں کے رنگ محل اس کرخت اور خوفناک حقیقت سے زود یا بدیر ٹکراتے ہیں، تو وہ کائنات کی سب سے زیادہ بے بس اور غم زدہ ہستی بن جاتا ہے اور کبھی کبھی خودکشی کے ذریعے اپنی رنگین زندگی کا خاتمہ کرنے پر بھی تل جاتا ہے۔ احساسِ مزاح کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی بے لگام آرزوؤں، منہ زور اُمنگوں اور پُر اسرار خوابوں پر متبسم انداز سے تنقید کرے اور یوں اسے حقائق کی کرخت اور خوفناک صورت دکھا کر اس کو شدید مایوسی کے تند و تیز شعلوں سے بچائے، جو اس کے خوابوں کی منزل پر ہمیشہ سے اس کے منتظر ہیں اور جن سے اس کا بچ نکلنا ایک امر

محال ہے۔ چنانچہ بقول ملن یوٹا نگ: مزاح نگار ایک دھیمے تبسم سے خواب پرستوں کو اُمنگوں اور امیدوں کی سرابی کیفیات کا احساس دلا کر ان کے حد سے بڑھے ہوئے جوش کو ٹھنڈا کرتا ہے اور یوں انھیں آنے والے ذہنی صدمات کے لیے تیار کرتا ہے --------- اور دیکھا جائے، تو یہ بہت بڑی انسانی خدمت ہے۔

زندگی کی کرخت سنجیدگی سے انسان کو بچانے اور اسے شکستِ خواب سے بیدار ہونے والے نا قابلِ برداشت صدموں کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کے علاوہ احساسِ مزاح کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ مثل یاد کریں کہ: "ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا --------- بیٹھ اکیلے ہی رونا ہوگا" تو ہمیں محسوس ہوگا کہ مزاح کے طفیل، انسان اور انسان کے مابین ایک نا قابلِ شکست رشتہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ عام زندگی میں بھی دیکھیے، تو ہنسی ایک متعدی بیماری کی طرح پھیلتی ہے اور جہاں چند لوگ ہنس رہے ہوں، وہاں راہ گیر بے جانے بوجھے بھی ان کی ہنسی میں شریک ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ہنسی، نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے، بلکہ ہر اس فرد کو نشانۂ تمسخر بھی بناتی ہے، جو سوسائٹی کے مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے۔ دیکھا جائے، تو مزاحیہ کردار صرف اس لیے مزاحیہ رنگ میں نظر آتا ہے کہ اس سے بعض ایسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں، جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد محظوظ ہوتے ہیں، مثلاً: اگر ایسا کردار چچا چھکن کی طرح اپنی اس عینک کی تلاش کرے، جو اس نے اپنی ناک پر لگا رکھی ہو، تو خواہ مخواہ اس پر ہنسنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ قدیم قبائل میں اجنبیوں کے لباس، گفتار اور عادات و اطوار کو نشانۂ تمسخر بنانے کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں، وہ اسی زمرے میں شامل ہیں۔ دراصل ہنسی، اس فرد کا مذاق اڑاتی ہے، جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا بھی بھٹکے اور اس غرض سے اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے لکیر میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ یہ بات ہنسنے والوں کے لیے تو باعثِ انبساط ہوتی ہے، لیکن اس فرد کو رنج و ندامت سے ضرور ہمکنار کر دیتی ہے، جس کے خلاف یہ عمل میں آئے۔ بقولِ برگساں: "ہنسی کا کام فراریت کے رجحان کا قلع قمع کرنا اور یوں فرد کو دوبارہ کل میں مدغم ہو جانے کی ترغیب دینا ہے"۔

پس دیکھا جائے، تو ہنسی ایک ایسا آلہ ہے، جس کے ذریعے سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے، جو اس کے ضابطۂ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ سماجی لحاظ سے ہنسی کا یہ عمل اس لیے بھی زیادہ اہم ہے کہ اس کی بدولت سوسائٹی ان تمام، لیکن مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے، جن کو یہ نشانۂ تمسخر بناتا ہے اور ان تمام اندرونی نقائص کے استیصال کی طرف توجہ دلاتا ہے، جو مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اردو ادب میں اکبر الہ آبادی کے ہاں مزاح کا جو افادی پہلو بڑے نمایاں انداز میں کارفرما نظر آتا ہے، وہ ہنسی کے اسی اصلاحی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا کہ: کائنات پر سنجیدگی مسلط ہے اور یہاں ہر ذی روح سنجیدہ زندگی کے پُراسرار اشاروں پر سرگرم عمل ہے۔ انسان کی امتیازی خصوصیت البتہ یہ ہے کہ اس سنجیدگی کو چند لمحات کے لیے ہی سہی، سانپ کی کینچلی کی طرح اُتار پھینکتا ہے اور ہنسی جیسے خالص حیاتیاتی تعیش (Biological Luxury) سے زندگی کے کھردرے کناروں کو ملائم کر لیتا ہے۔

ارسطو کا نظریہ کہ: ہنسی کسی ایسی کمی یا بدصورتی سے نمودار ہوتی ہے، جو صدمہ انگیز نہ ہو۔ اس چہرے کی طرح ہے، جس کے خطوط کو مسکرا کر خوفناک بنالیا جائے اور کانٹ کا نظریہ کہ: ہنسی توقع کے پیدا ہونے اور پھر اچانک ختم ہو جانے سے نمودار ہوتی ہے۔ اس ہاتھ کی طرح ہے، جو کسی شے کو تھامنے کے لیے بڑھے اور پھر دیکھے کہ وہ شے وہاں نہیں ہے۔ دیکھا جائے، تو سرکس کا مسخرہ بھی ان دونوں طریقوں ہی سے سامعین کو ہنسانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ پہلے تو اپنے چہرے پر سفید اور سرخ رنگ مل کر اور ایک بیہودہ سا لباس پہن کر آتا ہے اور پھر جب کوئی شہ زور کسی وزنی شے کو اٹھانے کا مظاہرہ کر چکتا ہے، تو یہ مسخرہ بڑے اہتمام سے اسی شے کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے اور پھر اچانک اسے ہاتھ لگا کر پیچھے ہٹ آتا ہے اور وہ لوگ مارے ہنسی کے بے حال ہو جاتے ہیں۔

غور کریں، تو بچے یا وحشی کے پاس بلند بانگ قہقہوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی، لیکن اس کے مزاح میں وسعت اور گہرائی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کا مزاح محض اس طوفانی ندی کی طرح ہے، جو معمولی پتھر سے بھی ٹکرائے، تو شور مچاتی ہے۔ چنانچہ وہ ایسی باتوں پر بے اختیار قہقہے لگاتا ہے، جو بالغ انسانوں کے ذوقِ مزاح سے کافی پست ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وحشی انسان کا وہ اولین قہقہہ، جو اس نے دشمن کی کھال ادھیڑتے وقت لگایا تھا، آج کی مہذب دنیا میں قطعاً ناقابلِ قبول ہے، لیکن چونکہ ساری تاریخ انسان کی مختصر سی زندگی میں خود کو کلیتاً دہرا دیتی ہے، لہٰذا وحشی انسان کے ان قہقہوں کی صدائے بازگشت، بچوں کے ان نقرئی قہقہوں میں سنائی دے گی، جو وہ کسی شے کو ٹوٹتے یا گرتے یا بدشکل ہوتے دیکھ کر لگاتے ہیں۔

چنانچہ انسانی مزاح کے نشوونما ارتقا میں ہمیں ایک تدریجی انداز کارفرما نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہی دیکھیے کہ قہقہے کا آغاز ہی اس وقت ہوا، جب انسان نے حیوان کی میکانکی زندگی سے نجات پائی۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ اس کے تخیل نے رجحان سے اپنا دامن جھٹک کر علیحدہ کر لیا اور طبعی رجحان کے میکانکی عمل کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے لگا۔ یوں دیکھنے سے اسے اس بات کا اچانک احساس ہوا کہ انسان کی جذباتی زندگی تو بڑی لغو اور بے معنی سی چیز ہے۔ اس احساس نے اس کے قہقہے کو تحریک دی۔

اولین انسان کے اس قہقہے میں شدت اور گونج تو بہت تھی، لیکن گہرائی اور لطافت کا فقدان تھا۔ اس کا مزاح زیادہ تر

میدان (Practical Jokes) تک محدود تھا یا پھر وہ ان باتوں کو نشانۂ تمسخر بناتا تھا، جو اس کے اپنے ماحول سے مختلف تھیں۔ آج بھی اجنبیوں خصوصاً سفید لوگوں کے لباس، چال، میل جول اور عادات واطوار کی نقلیں کرنا وحشی قبیلوں میں بہت عام ہے اور ان پر دل کھول کر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ نہ صرف قہقہے، بلکہ بعض اوقات تو یہ لوگ مارے ہنسی کے تالیاں بجانا اور پاؤں کو زور زور سے زمین پر پٹخنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دور کیوں جایئے، یہاں پنجاب کے دور دراز دیہات میں آج بھی جب کوئی نو وارد سر پر سولا ہیٹ رکھے نظر آتا ہے، تو دیہاتیوں کے لبوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ ضرور کھیلنے لگتی ہے۔

دیکھا جائے، تو وحشی انسان کا ذوقِ مزاح ہمارے ہاں کے اسکول کے بچوں کے ذوقِ مزاح سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ وہی عملی مذاق تخریبی انداز، لیکن ہمدردی کی افسوسناک کمی۔ دراصل مزاح میں ہمدردانہ پہلو کی نمود بہت بعد کی بات ہے، جب کہ وحشی قبیلوں کو تنگ اور گھٹی ہوئی فضا نے ہر لحظہ وسیع ہوتے ہوئے سوشل نظام کے لیے جگہ خالی کر دی ہے۔ چنانچہ سوسائٹی میں طبقاتی درجہ بندی مزاح کے نشوو ارتقا کے لیے ازبس ضروری ہے اور چونکہ وحشی قبائل میں اس طبقاتی حد بندی کا نام ونشان تک نہیں ہوتا، لہٰذا وہ زیادہ سے زیادہ اجنبیوں ہی کو نشانۂ تمسخر بناتے اور دل کھول کر قہقہے لگاتے ہیں۔

طبقاتی کشمکش کے علاوہ ہمارے سوشل ارتقا کی ہر نہج، ذہنی وسعت، اخلاقی اقدار، سیاسی اور سماجی آزادی اور دولت کے تصور نے بھی ہمارے ذوقِ مزاح پر بڑے نمایاں اثرات مرتسم کیے ہیں۔ اب ہمارا مزاح یقینی طور پر گروہ کی ہنسی (Chora Laughter) سے ترقی کر کے فرد کی ہنسی (Individual Laughter) تک جا پہنچا ہے۔ دراصل سوشل ارتقا نے کہیں صدیوں کے مدوجزر کے بعد جا کر ایسی فضا پیدا کی ہے، جس میں انفرادی آزادی کے تصور نے اپنے پاؤں مضبوط کر لیے ہیں اور فرد کے قہقہے یا تبسم میں نہ صرف گہرائی اور انفرادیت کی جھلک نظر آنے لگی ہے، بلکہ اس کے مزاح میں بھی پہاڑی ندی کی پر شور راگنی کی بجائے پُرسکون دریا کی دھیمی لے سنائی دے رہی ہے۔ [نئی تحریریں]

۶.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
برقی رو	بجلی کی رو	سرایت کرنا	جذب کرنا	دشت وجبل	جنگل اور پہاڑ
بحر و بر	خشکی وتری	منہمک	کھویا ہوا، مصروف	پیش قدمی	آگے بڑھنا

کوششوں	کاوشوں	بچوں جیسی	طفلانہ	مسکراہٹ	تبسم
خوشی،مسرت	انبساط	مثال	مثل	سیدھا، ہموار، بے رنگ، نائیپ	سپاٹ
فائدہ مند	افادی	نقصان دہ	مضر	مل جانا	مدغم ہونا
مشابہت	مماثلت	کمی	فقدان	زندہ	ذی روح

۶.۳ خلاصہ:

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے اس دلچسپ مضمون میں ہنسی اور مزاح کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات سے بحث کی اور زندگی کے اس خوب صورت پہلو کو لازمِ حیات قرار دیا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہنسی اور مزاح کا پہلو انسانی کی زندگی کو حیوانی حیات سے ممتاز کرتا ہے۔ان کے خیال میں: کائنات اور اس کے تمام مظاہر میں ہر طرف ایک گہری سنجیدگی چھائی ہوئی ہے۔ پس اس سنجیدہ کائنات کے متوازی انسان نے بھی اپنے لیے جس زندگی کو اختیار کیا ہے، وہ اپنے کام کاج اور شب و روز کی مصروفیات کے حوالے سے بھی سنجیدہ ہے، لیکن انسان احساسِ مزاح کے باعث زندگی کی ٹھوس اور مادیت پسند صورت حال کو لچکیلا اور ملائم بنالیتا ہے۔ انسان چونکہ خواب پرست واقع ہوا ہے، اس لیے اگر اس کے خواب تعبیر سے محروم ہوتے چلے جائیں، تو زندگی وبال بن کر رہ جائے۔ چنانچہ ہنسی اور مزاح دو ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے باعث محرومیوں کے باوجود زندگی رہنے اور بسنے کے قابل رہتی ہے۔ زندگی کے ناقابلِ برداشت صدموں کو قابلِ برداشت بنانے میں ہنسی اور مزاح کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ: انسان ہنستا لوگوں میں اور روتا تنہائی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہنسی کے ذریعے زندگی کے کھردرے کناروں کو ملائم بنالیتا ہے۔ مزاح کی بے شمار شکلیں اور اقسام ہیں، مثلاً: ایک وحشی انسان کے لیے دورِ جدید کا انسان اور دورِ جدید کے کسی انسان کے لیے وحشی کا رنگ وروپ اور طرزِ تمدن مزاح کا باعث بن جاتا ہے۔ بسا اوقات اجنبی بھی ایک دوسرے کی وضع قطع دیکھ کر خوب دل کھول کر قہقہے لگانے لگتے ہیں۔ انسان جیسے جیسے ترقی کرتا چلا جارہا ہے، ویسے ویسے اس کے اخلاقی، سیاسی اور سماجی تصورات بھی وسیع ہورہے ہیں۔ اب ہماری ہنسی بھی گروہی نہیں، بلکہ انفرادی ہے۔ فرد کے قہقہے میں گہرائی اور انفرادیت کے ساتھ ساتھ پُرسکون دریا کی دھیمی لے بھی سنائی دیتی ہے۔

۴ اہم نکات:

۱۔ ہنسی اور مزاح کا پہلو انسانی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے۔

۲۔ انسان کوئی مشین نہیں ہے کہ فطرت کے اشاروں پر ناچے۔

۳۔ کائنات کی خوفناک سنجیدگی کے مقابلے میں انسان ہنسنے اور مسکرانے کے ساتھ ساتھ قہقہے بھی لگا سکتا ہے۔

۴۔ مزاح زندگی کی ٹھوس مادیت کو روحانیت میں بدل دیتا ہے۔

۵۔ تبسم، ہنسی اور قہقہہ نہ ہو، تو انسان زندگی میں جیتے جی مرجائے۔ مزاح انسان کے جینے کا وسیلہ ہے۔

۶۔ انسان اگر نہ ہنسے، تو شاید بے درد زندگی میں سوائے خودکشی کے کوئی چارہ نہ رہے۔

۷۔ ہنسی اور مزاح کی مختلف اقسام اور صورتیں ہیں۔

۸۔ موجودہ عہد میں ہمارا مزاح گروہی نہیں رہا، بلکہ اس کی صورت انفرادی ہے۔

۶.۵ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''زندگی کی کرخت سنجیدگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مجبور ہوتے ہیں۔''

سبق کا عنوان: ہنسی، مزاح اور انسانی زندگی

مصنف کا نام: ڈاکٹر وزیر آغا

سیاق و سباق:

تشریح طلب اقتباس سے پہلے مصنف نے بتایا ہے کہ کائنات اور اس کے تمام مظاہر میں سنجیدگی کی ایک ازلی وابدی خصوصیت موجود ہے۔ انسان بھی کائنات کا مظہر ہے، لیکن وہ کوئی مشین نہیں ہے، بلکہ وہ اس تلخ تر زندگی میں مسکرا کر جی سکتا ہے۔ ہنسی اور مزاح کے باعث ہم بے درد دنیا اور زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تشریح طلب اقتباس کے بعد مصنف نے بتایا ہے کہ انسان روتا تنہائی میں ہے، لیکن اگر ہنسنا ہو، تو دوسروں کو بھی اس میں شریک کر کے مزید لطف اندوز ہوتا ہے، کیوں کہ ہنسی افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد دیتی ہے۔ ہنسی اور مزاح کی مختلف اقسام اور صورتیں ہیں۔ آج کے اس جدید دور میں گروہی مزاح کی جگہ انفرادی مزاح نے لے لی ہے۔

تشریح:

اس اقتباس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی یوں تو کرخت سنجیدگی کی حامل ہوتی ہے اور اس کی سنگین حقیقتوں کا ادراک بسا اوقات انسان کو مایوس اور بے دل بنا سکتا ہے۔ چنانچہ مزاح کی خوبی انسان کو فطری طور پر کچھ ایسے عطا ہوئی ہے کہ انسان اس سنجیدہ کائنات اور اس کے مظاہر میں بے دست و پا اور مجبورِ محض ہی نہیں بنا رہتا، بلکہ اسی زندگی کو چند لمحات کے لیے ہی سہی، اپنے لیے خوشگوار بنا لیتا ہے۔

مصنف نے اس حوالے سے یہ بات بالکل برحق کہی ہے کہ مزاح زندگی کا روشن ترین پہلو ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے ایک عام، لیکن بڑی برمحل مثال بھی پیش کی ہے اور وہ یہ کہ: انسان جب مایوس اور دل گرفتہ ہوتا ہے، تو تنہائی میں بیٹھ کر چار آنسو بہا لیتا ہے، لیکن جب بھی اسے خوشی و مسرت کے لمحات میسر ہوتے ہیں، تو وہ چاہتا ہے کہ اپنی خوشی میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔ چنانچہ ہنسنے ہنسانے کے عمل میں وہ دوسرے افراد کو بھی شامل کر کے اپنی خوشی کو دو چند کر لیتا ہے، یہ سب ہنسی اور مزاح کی برکتیں ہیں۔ مصنف نے ہنسی کو ایک متعدی بیماری سے تشبیہ دے کر اپنے نظریے کو مزید وسعت بخش دی ہے اور وہ یوں کہ جہاں چند لوگ ہنس بول رہے ہوں، تو خواہ مخواہ اردگرد سے گزرنے والے راہ گیر بھی چند گھڑیوں کے لیے رک جاتے ہیں اور ان ہنسنے والوں کی خوشی میں شریک ہو کر متبسم ہو جاتے ہیں۔ وہ وقتی طور پر ہی سہی یہ بات بھول جاتے ہیں کہ وہ کس کام کی غرض سے کہاں جا رہے تھے؟ وہ خوشی اور مسرت کی گھڑی کو ایک لمحے کے لیے بھی تج دینے پر آمادہ نہیں ہوتے، رک جاتے ہیں اور احباب کی ہنسی میں شریک ہو کر ہنسنے لگتے ہیں۔

خود آزمائی:

ا۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں۔

الف۔ مصنف کے خیال میں کائنات کی ازلی و ابدی خصوصیت کیا ہے؟

ب۔ "نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں" وزیر آغا نے اپنے مضمون میں یہ مصرع کیوں تحریر کیا؟

ج۔ ماں کے تبسم کا بچے پر کیا اثر ہوتا ہے؟

د۔ حقائق کی خوفناکی سے کیونکر بچا جا سکتا ہے؟

ہ۔ مصنف کے خیال میں ہنسی انسانوں کو باہم مربوط بنا دیتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کریں؟

و۔ دواجنبی دیسوں کے باشندے ایک دوسرے کی وضع قطع دیکھ کر کیوں ہنسنے اور قہقہے لگانے لگتے ہیں؟

۲۔ خالی جگہ درست الفاظ سے پُر کریں۔

ا۔ نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں

ب۔ ماں کا تبسم بچوں کی مزید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کی ترغیب دیتا ہے۔

ج۔ بیٹھا اکیلے ہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہوگا۔

د۔ کائنات پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مسلط ہے۔

ہ۔ انسانی مزاح کے نشوو ارتقا میں ایک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انداز کار فرما ہے۔

۳۔ درج ذیل اقتباس کی تشریح بحوالہ سیاق و سباق کریں۔

''دیکھا جائے، تو وحشی انسان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دل کھول کر قہقہے لگاتے ہیں۔''

۴۔ سبق "ہنسی، مزاح اور انسانی زندگی" کا خلاصہ تحریر کریں اور مصنف کا نام بھی لکھیں۔

۵۔ گروہی اور انفرادی مزاح پر ایک نوٹ تحریر کریں۔

۶۔ درج ذیل جملوں کی مختصر اوضاحت کریں۔

الف۔ 'وحشی انسان کا ذوقِ مزاح ہمارے ہاں کے اسکول کے بچوں کے ذوقِ مزاح سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔'

ب۔ 'انسان کائنات میں سب سے بڑا خواب پرست ہے۔'

یونٹ نمبر......۳

افسانہ

تحریر: ڈاکٹر صلاح الدین درویش
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

فہرستِ مضامین

۵.۱۔ دم[متن]

۵.۲۔ مرکزی خیال

۵.۳۔ خلاصہ

☆ خودآزمائی

۶۔ الطاف فاطمہ

۶.۱۔ کنڈیکٹر[متن]

۶.۲۔ مرکزی خیال

۵.۳۔ خلاصہ

☆ خودآزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات

کہانی کی مختلف صورتیں ہیں: داستان، ناول، افسانہ وغیرہ...... یہ صورتیں باہم مربوط بھی ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ان اصناف کے فکری اور فنی خدوخال انھیں ایک دوسرے سے ممیز کرتے ہیں ،لیکن ان کا معنوی ارتباط انھیں کہانی کے جمالیاتی آہنگ سے جوڑے ہوئے ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی افسانے کی ابتدا ہوئی۔ ناول کی طرح یہ صنفِ ادب بھی مغرب سے اردو میں آئی۔ سجاد حیدر یلدرم، علامہ راشد الخیری اور منشی پریم چند نے اس صنف کو معنوی اور فنی اعتبار سے ثروت مند کیا۔ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور انتظار حسین وغیرہم نے اس صنف کے امکانات کو اس قدر وسعت آشنا کیا کہ اب اسے کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔

اس یونٹ میں آپ چھے افسانوں کا مطالعہ کریں گے۔ یہ افسانے زندگی کے مختلف رویوں کے عکاس ہیں۔ ان میں تہذیب اور معاشرت کے رنگ اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ عکس انداز ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کا مطالعہ دراصل زندگی کے مختلف رنگوں کی جمالیات کو سمجھنے سے عبارت ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ:

۱۔ اس کورس میں شامل افسانہ نگاروں کے سوانحی کوائف اور ادبی مقام سے آگاہ ہو سکیں۔

۲۔ شاملِ نصاب افسانوں کے فکری اور فنی رویوں سے متعارف ہو سکیں۔

۳۔ اس رویے کی تفہیم کر سکیں کہ افسانہ: زندگی اور اس کے مختلف تجربات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ افسانے اور زندگی میں معنوی ارتباط پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے یہ دونوں لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔

۱۔ سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو کا شمار اردو کے عظیم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔منٹو ۱۱مئی ۱۹۱۲ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام غلام حسن تھا۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول امرتسر سے ۱۹۳۱ء میں پاس کیا۔ بعد میں ایم اے او کالج امرتسر میں داخل ہوئے ،لیکن ایف اے نہ کر سکے۔ ۱۹۳۸ء میں صفیہ بیگم سے شادی ہوئی۔ اس زمانے میں کئی فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ 'آتش پارے' ۱۹۳۶ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات اور رسائل سے بھی وابستہ رہے۔ 'خلق' امرتسر، 'ہمایوں' لاہور، 'عالمگیر' لاہور، 'کارواں' بمبئی اور 'احسان' لاہور جیسے رسائل میں بحیثیتِ مدیر خدمات انجام دیتے رہے۔ 'آتش پارے' کے علاوہ منٹو کے افسانوی مجموعے: 'منٹو کے افسانے'، 'دھواں'، 'لذتِ سنگ'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'یزید اور 'پھندے' وغیرہ بہت اہم ہیں۔ انھوں نے خاکہ نگاری بھی کی۔ 'گنجے فرشتے' اور 'نور جہاں سرور جہاں' خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ میں ہوا۔

منٹو کے افسانوں میں حقیقت نگاری اپنی پوری بے رحمی اور سچائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ منٹو جیسی بے باکی اور جرأت بہت کم اردو کے افسانہ نگاروں کو نصیب ہوئی ہے۔ وہ جہاں معاشرتی برائیوں سے پردہ ہٹاتے ہیں، وہاں وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ قاری اپنے گردو پیش سے غافل نہ ہونے پائے اور اصلاحِ احوال پر راغب ہو۔ تحریر و تقریر کی آزادی کے وہ اتنے زبردست داعی تھے کہ ان کے کئی افسانوں پر اُن کے خلاف مقدمات بھی چلے۔ منٹو سیدھی سادی کہانیاں پیش کرتے ہیں، لیکن اُن کا اسلوب اپنی سادگی کے باوجود معانی کی کئی پرتیں بھی رکھتا ہے۔ منٹو اپنی کہانیوں کے ذریعے اپنے سیاسی اور سماجی شعور کو بہ سہولت اپنے قاری تک منتقل کر دیتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں محروم طبقات کی نمائندگی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ذلتوں کے مارے لوگ اپنی زندگیوں کے تمام مسائل سے آگاہی حاصل کریں اور خود رحمی کا شکار ہونے کی بجائے زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا کریں۔

۱.۱ طاقت کا امتحان (متن):

"کھیل خوب تھا۔۔۔۔۔۔کاش تم بھی وہاں موجود ہوتے۔"

''مجھے کل کچھ ضروری کام تھا، مگر اِس کھیل میں کون سی چیز ایسی قابلِ دید تھی، جس کی تم تعریف کر رہے ہو؟''

''ایک صاحب نے چند جسمانی ورزشوں کے کرتب دکھلائے کہ ہوش گُم ہوگیا۔''

''مثلاً'':

''مثلاً: کلائی پر ایک انچ موٹی آہنی سلاخ کو خم دینا۔۔۔۔۔''

''یہ آج کل بچے کر سکتے ہیں۔''

''چھاتی پر چکی کا پتھر رکھ کر آہنی ہتھوڑوں سے پاش پاش کرانا۔''

''میں نے ایسے بیسیوں شخص دیکھے ہیں۔''

''مگر وہ وزن جو اس نے دو ہاتھوں سے اُٹھا کر ایک تنکے کی طرح پرے پھینک دیا، کسی اور شخص کے بس کی بات نہیں۔۔۔۔۔ یہ تمھیں بھی ماننا پڑے گا۔''

''بھلے آدمی یہ کون سا اہم کام ہے۔ وزن کتنا تھا آخر؟''

''کوئی چار من کے قریب ہوگا۔ کیوں؟''

''اتنا وزن تو شہر کا فاقہ زدہ مزدور گھنٹوں پُشت پر اُٹھائے رہتا ہے''۔

''بالکل غلط!''

''کیوں؟''

''غلیظ ٹکڑوں پر پلے ہوئے مزدور میں اتنی قوت نہیں ہوسکتی۔ طاقت کے لیے اچھی غذا کا ہونا لازم ہے ۔۔۔۔۔شہر کا مزدور! کیسی باتیں کر رہے ہو!''

''غذا والے معاملے کے متعلق میں تم سے متفق ہوں، مگر یہ حقیقت ہے ۔۔۔۔۔ یہاں ایسے بہتیرے مزدور ہیں، جو دو پیسے کی خاطر چار من، بلکہ اس سے کچھ زیادہ اٹھا کر تمھارے گھر کی دوسری منزل پر چھوڑ کر آسکتے ہیں۔۔۔۔۔کہو تو اسے ثابت کر دوں؟''

یہ گفتگو دو نوجوان طلبہ میں ہو رہی تھی، جو ایک پُر تکلف کمرے کی گدی دار کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ کا دُھواں اُڑا رہے تھے۔

''میں اسے ہرگز نہیں مان سکتا اور باور آئے بھی کس طرح ۔۔۔۔۔ قاسم چوب فروش کے مزدور ہی کو لو۔

کم بخت سے ایک من لکڑیاں بھی تو اٹھائی نہیں جاتیں۔ ہزاروں میں ایک ایسا طاقتور ہو، تو کوئی اچنبا نہیں ہے۔''

''چھوڑ و یار! اس قصے کو، بھاڑ میں جائیں، یہ سب مزدور اور چولھے میں جائے ان کی طاقت ۔۔۔ سناؤ! آج تاش کی بازی لگ رہی ہے؟''

''تاش کی بازیاں تو لگتی ہی رہیں گی، پہلے اس بحث کا فیصلہ ہونا چاہیے''۔

سامنے والی دیوار پر آویزاں کلاک ہر روز اسی قسم کی لایعنی گفتگوؤں سے تنگ آ کر برابر اپنی ٹک ٹک کیے جا رہا تھا۔ سگریٹ کا دُھواں ان کے منہ سے آزاد ہو کر بڑی بے پروائی سے چکر لگاتا ہوا کھڑکی کے راستے باہر نکل رہا تھا۔ دیواروں پر لٹکی ہوئی تصاویر کے چہروں پر بے فکری و بے اعتنائی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ کمرے کا فرنیچر سالہا سال سے ایک ہی جگہ پر جما ہوا کسی تغیر سے نا اُمید ہو کر بے حس پڑا تھا۔ آتشدان کے طاق پر رکھا ہوا کسی یونانی مفکر کا مجسمہ اپنی سنگین نگاہوں سے آدم کے ان دو فرزندوں کی بے معنی گفتگو سُن کر تعجب سے اپنا سر کُھجلا رہا تھا ۔۔۔۔ کمرے کی فضا بھدی اور فضول باتوں سے کثیف ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک دونوں دوست تاش کی مختلف کھیلوں، برج کے اُصولوں اور روپیہ جیتنے کے طریقوں پر اظہارِ خیالات کرتے رہے۔ دفعتاً ان میں وہ، جسے مزدور کی طاقت کے متعلق پورا یقین تھا، اپنے دوست سے مخاطب ہوا۔

''باہر بازار میں لوہے کا جو گاڈر پڑا ہے، وہ تمھارے خیال میں کتنا وزن رکھتا ہوگا؟''

''پھر وہی بحث!''

''تم بتاؤ تو سہی۔''

''پانچ چھے من کے قریب ہوگا۔''

''یہ وزن تو تمھاری نظر میں کافی ہے نا؟''

''یعنی تمھارا یہ مطلب ہے کہ لوہے کی یہ بھاری بھر کم لاٹھ تمھارا مزدور پہلوان اٹھائے گا ۔۔۔۔ گدھے والی گاڑی ضرور ہوگی اس کے ساتھ!''

''یہاں کے مزدور بھی گدھوں سے کیا کم ہیں۔ گیہوں کی دو تین بوریاں اُٹھانا، تو ان کے نزدیک معمولی کام ہے ۔۔۔۔ مگر تمھیں کیا پتا ہو سکتا ہے؟ کہو تو، تمھارے کل والے کھیل سے کہیں حیرت انگیز اور بہت سستے داموں ایک نیا تماشا دکھاؤں؟''

"اگر تمھارا مزدور لوہے کا وہ وزنی ٹکڑا اٹھائے گا، تو میں تیار ہوں۔"

"تمھاری آنکھوں کے سامنے اور بغیر کسی چالاکی کے۔"

دونوں دوست اپنے اپنے سگریٹ کی خاکدان میں گردن دبا کر اٹھے اور باہر بازار کی طرف مزدور کی طاقت کا امتحان کرنے چل دیے۔۔۔۔۔ کمرے کی تمام اشیا کسی گہری فکر میں غرق ہوگئیں، جیسے انھیں کسی غیر معمولی حادثے کا خوف ہو۔ کلاک اپنی انگلیوں پر کسی متعینہ وقت کی گھڑیاں شمار کرنے لگا۔ دیواروں پر آویزاں تصویریں حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔۔۔۔۔ کمرے کی فضا خاموش آہیں بھرنے لگ گئی۔

لوہے کا وہ بھاری بھرکم ٹکڑا لاش کا سا سرد اور کسی وحشت ناک خواب کی طرح تاریک، بازار کے ایک کونے میں کسی بھیانک دیو کی مانند اکڑا ہوا تھا۔ دونوں دوست لوہے کے اس ٹکڑے کے پاس آ کر کھڑے ہوگئے اور کسی مزدور کا انتظار کرنے لگے۔

بازار بارش کی وجہ سے کیچڑ میں لت پت تھا، جو راہ گزروں کے جوتوں کے ساتھ اُچھل اُچھل کر ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا، گویا وہ اپنے روندنے والوں سے کہہ رہی ہے کہ وہ اسی آب و گل کی تخلیق ہیں، جسے وہ اس وقت پاؤں سے گوندھ رہے ہیں، مگر وہ اس حقیقت سے غافل اپنے دنیاوی کام دھندوں کی دھن میں مصروف کیچڑ کے سینے کو مسلتے ہوئے ادھر ادھر جلد جلد قدم اُٹھاتے ہوئے جا رہے تھے۔

کچھ دکان دار اپنے گاہکوں کے ساتھ سودا طے کرنے میں مصروف تھے اور کچھ سجی ہوئی دکانوں میں تکیہ لگائے اپنے حریف ہمسایہ دکان داروں کی طرف حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور اس وقت کے منتظر تھے کہ [illegible] فراغت کر دیں۔

ان میووں کی دکانوں کے ساتھ ہی ایک ہوٹل والا اپنے مریل گاہکوں کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔۔۔ بازار [illegible] پروا ایک ایسے مزدور کی راہ دیکھ رہے تھے [illegible] کا سامان مہیا کر سکے۔

دور بازار کے آخری سرے سے ایک مزدور کمر کے گرد رسی لپیٹے اور پشت پر ٹاٹ کا ایک موٹا سا ٹکڑا لٹکائے [illegible] آ رہا تھا۔

[illegible] سے قریب آتی گئی [illegible] تنور سے [illegible] ہوئی روٹیوں نے [illegible]

مزدور نے اپنی پھٹی ہوئی جیب کی طرف نگاہ کی۔ گرسنہ دانتوں سے اپنے خشک لبوں کو کاٹ کر خاموش رہ گیا۔ سرد آہ بھری اور اسی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے وقت اس کے کان بڑی بے صبری سے کسی کی دل خوش کن آواز 'مزدور' کا انتظار کر رہے تھے، مگر اس کے دل میں نہ معلوم کیا کیا خیالات چکر لگا رہے تھے۔

''دو تین دن سے روٹی بمشکل نصیب ہوئی ہے۔ اب چار بجنے کو آئے ہیں، مگر ایک کوڑی تک نہیں ملی ۔۔۔۔۔ کاش آج صرف ایک روٹی کے لیے کچھ نصیب ہو جائے! ۔۔۔۔۔ بھیک؟ ۔۔۔۔۔ نہیں خدا کارساز ہے!''۔

اس نے بُھوک سے تنگ آ کر بھیک مانگنے کا خیال کیا، مگر اسے ایک مزدور کی شان کے خلاف سمجھتے ہوئے خدا کا دامن تھام لیا اور اس خیال سے مطمئن ہو کر جلدی جلدی اس بازار کو طے کرنے لگا ۔۔۔۔۔ اس خیال سے کہ شاید دوسرے بازار میں اسے کچھ نصیب ہو جائے۔ دونوں دوستوں نے بیک وقت ایک مزدور کو تیزی سے اپنی طرف قدم بڑھاتے دیکھا ۔۔۔۔۔ مزدُور بلا پتلا نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے فوراً آواز دی: ''مزدور!''

یہ سنتے ہی گویا مزدور کے سُوکھے دھانوں میں پانی مل گیا۔ بھاگا ہوا آیا اور نہایت ادب سے پوچھنے لگا: ''حضور''!

''دیکھو! لوہے کا یہ ٹکڑا اُٹھا کر ہمارے ساتھ چلو ۔۔۔۔۔ کتنے پیسے لو گے؟''

مزدور نے جھک کر لوہے کے بھاری بھرکم ٹکڑے کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کی چمک جو 'مزدور' کا لفظ سن کر پیدا ہوئی تھی، غائب ہو گئی۔

وزن بلاشک وشبہ زیادہ تھا، مگر روٹی کے قحط اور پیٹ پوجا کے لیے سامان پیدا کرنے کا سوال اس سے کہیں وزنی تھا۔

مزدور نے ایک بار پھر اس آہنی لاٹھ کی طرف دیکھا اور دل میں عزم کرنے کے بعد کہ وہ اسے ضرور اٹھائے گا۔ ان سے بولا: ''جو حضور فرمائیں''، ''یعنی تم یہ وزن اکیلے اُٹھا لو گے؟'' ان دو لڑکوں میں سے ایک نے مزدور کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا، جو کل شب جسمانی کرتب دیکھ کر آیا تھا۔

''بولو کیا لو گے؟ ۔۔۔۔۔ یہ وزن بھلا کہاں سے زیادہ ہوا''۔ دوسرے نے بات کا رُخ پلٹ دیا۔

''کہاں تک جانا ہو گا حضور!''

''بہت قریب ۔۔۔۔۔ دوسرے بازار کے نکڑ تک''۔

''وزن زیادہ ہے، آپ تین آنے دے دیجیے''۔

''تین آنے!!''

''دو آنے مناسب ہیں بھئی''۔

دو آنے ۔۔۔۔۔ آٹھ پیسے، یعنی دو وقت کے لیے سامانِ خورد و نوش۔ یہ سوچتے ہی مزدور راضی ہوگیا۔اس نے کمر سے رسی اتاری اور اسے لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔۔۔۔۔ دو تین جھٹکوں کے بعد وہ آہنی سلاخ اس کی کمر پر تھی۔

گو وزن واقعی نا قابلِ برداشت تھا، مگر تھوڑے عرصے کے بعد ملنے والی روٹی نے مزدور کے جسم میں عارضی طور پر ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی تھی۔ اب ان کاندھوں میں جو بُھوک کی وجہ سے مُردہ ہو رہے تھے، روٹی کا نام سُن کر تمام طاقت عود کر آئی۔

گرسنہ انسان بڑی سے بڑی مشقت فراموش کر دیتا ہے، جب اسے اپنے پیٹ کے لیے کچھ سامان نظر آتا ہے۔

''آیئے''! مزدور نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور زیرِ لب مسکرا دیے ۔۔۔۔۔ وہ بہت مسرور تھے۔

''چلو ۔۔۔۔۔ مگر ذرا جلدی قدم بڑھاؤ۔ ہمیں کچھ اور بھی کام کرنا ہے''۔

مزدور ان دو لڑکوں کے پیچھے ہولیا ۔۔۔۔۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ موت اس کے کاندھوں پر سوار ہے۔

''کہو میاں! کہاں ہے وہ تمھارا کل والا سینڈو؟''

''کمال کر دیا اس مزدور نے، واقعی سخت تعجب ہے''!

''تعجب! ۔۔۔۔۔ اگر کہو، تو اس لوہے کے ٹکڑے کو تمھارے گھر کی بالائی چھت پر رکھوا دوں''۔

''مگر سوال ہے کہ ہم لوگ اچھی غذا ملنے پر بھی اتنے طاقتور نہیں ہیں''۔

ہماری غذا تو کتابوں اور دیگر علمی چیزوں کی نذر ہو جاتی ہے ۔۔۔۔۔ انھیں اس قسم کی سر دردی سے کیا تعلق؟ ۔۔۔۔۔ بے فکری، کھانا اور سو جانا!''

''واقعی درست ہے''۔

لڑکے مزدور پر لدے ہوئے بوجھ اور اس کی خمیدہ کمر سے غافل آپس میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

وہاں سے سو قدم کے فاصلے پر مزدور کی قضا کیلے کے چھلکے پر چھپی ہوئی اپنے شکار کا انتظار کر رہی تھی۔ گو مزدور کیچڑ میں پُھونک پُھونک کر قدم رکھ رہا تھا، مگر تقدیر کے آگے تدبیر کی ایک بھی پیش نہ چلی۔ اس کا قدم چھلکے پر پڑا۔ پھسلا اور چشم زدن میں لوہے کی اس بھاری لاٹھ نے اسے کیچڑ میں پیوست کر دیا۔

مزدور نے مترحم نگاہوں سے کیچڑ اور لوہے کے سرد ٹکڑے کی طرف دیکھا۔ تڑپا اور ہمیشہ کے لیے بھوک کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

دھماکے کی آواز سن کر لڑکوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ــــــ مزدور کا سر آہنی سلاخ کے نیچے کچلا ہوا تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی، نہ معلوم کس سمت ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔ خون کی ایک موٹی سی تہہ کیچڑ کے ساتھ ہم آغوش ہو رہی تھی۔

''چلو آؤ چلیں ــــــ ہمیں خواہ مخواہ اس حادثے کا گواہ بننا پڑے گا''۔

''میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ وزن اس سے نہیں اُٹھایا جائے گا ــــــ لالچ!''

یہ کہتے ہوئے دونوں لڑکے مزدور کی لاش کے گرد جمع ہوئی بھیڑ کو کاٹتے ہوئے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

سامنے والی دکان پر ایک بڑی توند والا شخص ٹیلی فون کا چونگا ہاتھ میں لیے غالباً گندم کا بھاؤ طے کرنے والا تھا کہ اس نے مزدور کو موت کا شکار ہوتے دیکھا اور اس حادثے کو منحوس خیال کرتے ہوئے بڑ بڑا کر ٹیلی فون کا سلسلۂ گفتگو منقطع کر لیا۔

''کم بخت کو مرنا بھی تھا، تو میری دکان کے سامنے ــــــ بھلا ان لوگوں کو اس قدر وزن اُٹھانے پر کون مجبور کرتا ہے''۔

دھندلے آسمان پر ابر کے ایک ٹکڑے نے مزدور کے خون کو کیچڑ میں ملتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے ــــــ ان آنسوؤں نے سڑک کے سینے پر اس کے خون کے دھبوں کو دھو دیا۔

آہنی لاٹھ ابھی تک بازار کے ایک کنارے پر پڑی ہوئی ہے۔ مزدور کے خون کا صرف ایک قطرہ باقی ہے، جو دیوار کے ساتھ چمٹا ہوا نہ معلوم کس چیز کا اپنی خونیں آنکھوں سے انتظار کر رہا ہے؟ [آتش پارے]

۱.۲ مرکزی خیال:

ہمارا سماج بالا دست اور محروم طبقات پر مشتمل ہے۔ ایک طرف اگر مال و دولت کی ریل پیل ہے، تو دوسری طرف نانِ جویں کو ترسے ہوئے لوگوں کا انبوہ ہے۔ جن لوگوں کے پاس دولت اور طاقت ہے، انھیں اختیارات کے اندھے استعمال نے بے حس اور بے رحم بنا دیا ہے۔ مزدور طبقات کی طاقت و ہمت خود اُن کی اپنی زندگیوں میں تو کسی بھی نوع کی تبدیلی کا باعث نہیں بنتی، لیکن دولت مندوں کے سامانِ راحت کا ذریعہ ضرور بنی رہتی ہے۔

۱.۳ خلاصہ:

اس افسانے میں سعادت حسن منٹو نے دو کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوانوں کی باہمی گفتگو کو پیش کیا ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ کوئی فاقہ کش مزدور کئی من وزنی بوجھ تنکے کی طرح اٹھا کر پرے پھینک سکتا ہے، جبکہ دوسرے کا خیال ہے: غلیظ ٹکڑوں پر پلنے والے مزدور اتنی قوت رکھ ہی نہیں سکتے۔ تاش کی بازی لگاتے اور سگریٹ کا دھواں اڑاتے دونوں دوستوں میں اِس موضوع پر بحث چھڑ جاتی ہے۔ فیصلہ یہ قرار پاتا ہے کہ باہر بازار میں جو پانچ چھے من وزنی لوہے کا گارڈر پڑا ہے، کسی مزدور سے اِسے اٹھوانے کی شرط لگاتے ہیں۔ بازار میں ایک مزدور نانبائی کی دکان کے قریب سے جب گزرتا ہے، تو اس کی بھوک سالن کی دیگچیوں اور تنور سے نکلی ہوئی تازہ روٹیوں کو دیکھ کر چمک اٹھتی ہے۔ شام ڈھل رہی تھی، اُسے مزدوری ابھی تک نہیں ملی تھی۔ خالی جیب لیے وہ سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی 'مزدور' کہہ کر اُسے صدا دے۔ دونوں نوجوان اُسے بلاتے ہیں اور اُسے لوہے کا گارڈر اٹھا کر گلی کی نکڑ تک لے جانے کے لیے دو آنے کی مزدوری پر راضی کر لیتے ہیں۔ بوجھ اگرچہ اُس کی ہمت اور طاقت سے کہیں زیادہ تھا، لیکن روٹی کی بھوک نے عارضی طور پر اُس کی طاقت کو بڑھا دیا۔ اُس نے رسی کو مضبوطی سے گارڈر کے گرد باندھا اور دو تین جھٹکوں کے بعد اُسے اٹھایا اور چلنا شروع کر دیا۔ دوسرا دوست طاقت کے اس کھیل کو دیکھ کر پہلے دوست کے دعوے کو مان گیا، لیکن راستے ہی میں کیلے کے چھلکے سے مزدور کا پاؤں ایسا پھسلا کہ وہ خود گارڈر کے بوجھ تلے دب کر مر گیا۔ دونوں دوستوں نے گھر کی راہ لی کہ خواہ مخواہ حادثے کا گواہ بننا پڑے گا۔ سامنے بیٹھا ایک امیر

دکان دار ٹیلی فون پر گندم کے بھاؤ طے کرتے ہوئے بڑبڑایا کہ اِن لوگوں کو اس قدر وزن اٹھانے پر کون مجبور کرتا ہے؟

خود آزمائی:

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔

(i) دونوں دوستوں کی مزدور کی طاقت کے حوالے سے کیا رائے تھے؟

(ii) دونوں دوستوں میں کس بات پر شرط لگی؟

(iii) مزدور نانبائی کی دکان کو دیکھ کر کیا سوچنے لگا؟

(iv) مزدور نے کتنی مزدوری پر گارڈر اٹھانے کی حامی بھری؟

(v) مزدور کی موت کیونکر واقع ہوئی؟

(vi) دونوں دوست لاش کو چھوڑ کر گھروں کی طرف کیوں روانہ ہوگئے؟

(vii) بڑی توند والے دکاندار نے اِس حادثے کو کیا خیال کیا؟

۲۔ افسانہ 'طاقت کا امتحان' ہماری کس سماجی برائی کی نشاندہی کرتا ہے؟

۳۔ افسانہ 'طاقت کا امتحان' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

۴۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(i) طاقت کے لیے اچھی .... کا ہونا لازم ہے۔

(ii) یہاں کے مزدور بھی .... سے کیا کم ہیں۔

(iii) کمرے کی فضا.................. آہیں بھرنے لگ گئی۔

(iv) بازار بارش کی وجہ سے .... میں لت پت تھا۔

(v) اُس نے بھوک سے تنگ آ کر .... مانگنے کا خیال کیا۔

۵۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں۔

اچنبا۔ مجسمہ۔ تعجب ۔ وحشت ناک ۔ آب و گل

۲۔ غلام عباس

غلام عباس ۱۷ نومبر ۱۹۰۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں عبدالعزیز تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں میٹرک اور ۱۹۴۴ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۲۲ء میں پہلا افسانہ 'بکری' تحریر کیا اور ۱۹۲۵ء میں ٹالسٹائی کی تصنیف کا ترجمہ 'جلا وطن' کے عنوان سے کیا ، جو رسالہ 'ہزار داستان' لاہور میں چھپا۔ امتیاز علی تاج کی نگرانی میں جاری ہونے والے رسالے 'تہذیب نسواں' اور بچوں کے معروف رسالے 'پھول' کے نائب مدیر بھی رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جب انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی، تو ریڈیو کے رسالے 'آواز' کے مدیر بنائے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان کے رسالہ 'آہنگ' نے ان کی ادارت میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے بی بی سی لندن سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۵۲ء میں جب پاکستان آئے، تو ایک مرتبہ پھر 'آہنگ' کے لیے خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۹۶۰ء میں 'جاڑے کی چاندنی' پر آدم جی ادبی انعام حاصل کیا۔ ۱۹۶۷ء میں حکومت پاکستان کی طرف 'ستارۂ امتیاز' ملا۔ ۱۹۶۷ء میں صدرِ پاکستان ایوب خان کی خودنوشت 'فرینڈز ناٹ ماسٹرز' کا اردو میں ترجمہ ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' کے عنوان سے کیا۔ بچوں کے لیے بھی ادب تخلیق کیا۔ اُن کا ایک ناول ''گوندنی والا تکیہ'' ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یکم نومبر ۱۹۸۲ء کو وفات پائی۔

'آنندی'، 'جاڑے کی چاندنی' اور 'کن رس' اُن کے معروف افسانوی مجموعے ہیں۔ افسانہ نگاری کے فن پر جو گرفت اور کمال اُنھیں حاصل ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُن کی ہر کہانی زندگی کے کسی نہ کسی تضاد سے جنم لیتی ہے۔ انسانی زندگی کے ظاہری اور باطنی تضادات کو وہ ایک معمّے کے طور پر نہیں دیکھتے ، بلکہ ایک سادہ حقیقت کے روپ میں پیش کر دینے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اُن کا اسلوب سادہ بیانیہ ہے۔ اس اسلوب میں وہ عام آدمی کی زندگی کو بڑے قرینے سے سمو دینے کا ہُنر جانتے ہیں۔ اُن کے اکثر کردار بڑی خاموشی سے اپنی زندگی میں مگن دکھائی دیتے ہیں، اپنے حال میں مست اور راضی بہ رضا۔

۲.۱ یہ پری چہرہ لوگ [متن]:

پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بیگم بلقیس تراب علی ہر سال کی طرح اب کے بھی اپنے بنگلے کے باغیچے

میں مالی سے پودوں اور پیڑوں کی کاٹ چھانٹ کرا رہی تھیں۔ اس وقت دن کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ سیٹھ تراب علی اپنے کام پر اور لڑکے لڑکیاں اسکولوں کالجوں میں جا چکے تھے۔ چنانچہ بیگم صاحب بڑی بے فکری کے ساتھ آرام کرسی پر بیٹھی مالی کے کام کی نگرانی کر رہی تھیں۔

بیگم تراب علی کو نگرانی کے کاموں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی تھی۔ آج سے پندرہ سال پہلے جب ان کے شوہر نے جو اُس وقت سیٹھ تراب علی نہیں، بلکہ شیخ تراب تھے اور سرکاری تعمیرات کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اس نواح میں بنگلہ بنوانا شروع کیا تھا، تو بیگم صاحب نے اس کی تعمیر کے کام کی بڑی کڑی نگرانی کی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ بنگلہ بڑی کفایت کے ساتھ اور تھوڑے ہی دنوں میں بن کر تیار ہو گیا تھا۔

بیگم تراب علی کا ڈیل ڈول مَردوں جیسا تھا۔ آواز اونچی اور گمبھیر اور رنگ سانولا، جو غصے کی حالت میں سیاہ پڑ جایا کرتا۔ چنانچہ نوکر چاکر ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے تھر تھر کانپنے لگتے اور گھر بھر پر سناٹا چھا جاتا۔ ان کی اولاد میں سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں سِنِ بلوغت کو پہنچ چکے تھے، مگر کیا مجال جو ماں کو پلٹ کر جواب دے لیں یا نظر ملا کر بات کر سکیں اور تو اور خود سیٹھ تراب علی بیوی کے کاموں میں دخل دینا، اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا، پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ بیگم صاحب پورے خاندان پر ایک ملکہ کی طرح حکمران تھیں۔ عمر اور خوش حالی کے ساتھ ساتھ ان کی فربہی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور فربہی کے ساتھ رعب اور دبدبہ بھی۔

ان پندرہ برس میں جو انھوں نے اس نواح میں گزارے تھے۔ وہ یہاں کے قریب قریب سبھی رہنے والوں سے بخوبی واقف ہو گئی تھیں۔ بعض گھروں سے میل ملاپ بھی تھا اور کچھ بیبیوں سے دوستی بھی۔ وہ اس علاقے کے حالات سے خود کو باخبر رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ املاک کی خرید و فروخت اور بنگلوں میں نئے کرایہ داروں کی آمد اور پرانے کرایہ داروں کی رخصت کی بھی انھیں پوری پوری خبر رہتی تھی۔

اس وقت بیگم تراب علی کی تیز نظروں کے سامنے مالی کا ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہا تھا۔ اس نے پودوں اور چھوٹے چھوٹے پیڑوں کی کاٹ چھانٹ تو قینچی سے کھڑے کھڑے ہی کر ڈالی تھی اور اب وہ اونچے درختوں پر چڑھ کر بیگم صاحب کی ہدایت کے مطابق سُوکھے یا زائد ٹہنے کلہاڑی سے کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بیگم صاحب بیٹھے بیٹھے تھک گئیں اور کرسی سے اٹھ کر بنگلے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگیں۔ بنگلے کے آگے کی دیوار کے ساتھ ساتھ جو پیڑ تھے، ان میں دو ایک تو خاصے بڑے تھے، جن کی چھاؤں گھنی تھی۔ خاص کر ولایتی بادام کا پیڑ۔ اس کا سایہ نصف بنگلے کے اندر اور نصف باہر سڑک پر رہتا تھا۔ دن کو جب دھوپ

تیز ہو جاتی، تو کبھی کبھی کوئی راہگیر یا خوانچے والا ذرا دم لینے کو اس کے سائے میں بیٹھ جاتا تھا۔

بیگم بلقیس تراب علی جیسے ہی اس پیڑ کے پاس پہنچیں، ان کے کان میں دیوار کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ انھوں نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔ یہ اس علاقے کی مہترانی سگو کی آواز تھی، جو اپنی بیٹی جگو سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ ماں بیٹیاں بھی اکثر دوپہر کو اسی پیڑ کے نیچے ستانے یا ناشتا کرنے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

بیگم بلقیس تراب علی نے پہلے تو ان کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا، مگر یکایک ان کے کان میں کچھ ایسے الفاظ پڑے کہ وہ چونک اٹھیں۔ سگو اپنی بیٹی سے پوچھ رہی تھی: ''کیوں ری! تو نے طوطے والی کے ہاں کام کر لیا تھا؟''

''ہاں''! جگو نے اپنی مہین آواز میں جواب دیا۔

''اور کھلونے والی کے ہاں؟''

''وہاں بھی۔''

''اور تپ دق والی کے ہاں؟''

اب کے جگو کی آواز سنائی نہ دی۔ شاید اس نے سر ہلا دینے پر ہی اکتفا کیا ہوگا۔

''اور کالی میم کے ہاں؟''

اب تو بیگم تراب علی سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بے اختیار پکار اٹھیں:

''سگو۔ اری او سگو! ذرا اندر آئیو۔''

سگو کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی باتیں کوئی سن رہا ہوگا، خصوصاً: بیگم بلقیس تراب علی، جن کی سخت مزاجی اور غصے سے اس کی روح کانپتی تھی۔ وہ پہلے تو گم سم رہ گئی، پھر مری ہوئی آواز میں بولی: ''ابھی آئی بیگم صاحب!''

تھوڑی دیر میں وہ آنچل سے سینے کو ڈھانپتی، لہنگا ہلاتی، بنگلے کا پھاٹک کھول کر اندر آئی۔ جگو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں کے کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے۔ دونوں نے سر میں سرسوں کا تیل خوب لیسا ہوا تھا۔

''سلام بیگم صاحب!'' سگو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کس قصور کی بنا پر اسے بیگم صاحب کے حضور پیش ہونا پڑا ہے۔

بیگم صاحبہ نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا: ''کیوں ری مردار! یہ تو باہر بیٹھی کن لوگوں کے نام لے رہی تھی؟''

''کیسے نام بیگم صاحبہ؟''

''اری! تو کہہ رہی تھی نا طوطے والی، کھلونے والی، تپ دق والی، کالی میم؟''

سگو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''وہ تو بیگم صاحب! ہم آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔''

''دیکھ! سچ سچ بتا دے، ورنہ میں جیتا نہ چھوڑوں گی''۔

سگو پل بھر کو خاموش رہی۔ اس نے جان لیا کہ بیگم صاحب سے بات چھپانی مشکل ہوگی اور اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا: ''اچھا تو یہ طوطے والی کون ہے؟''

''وہ جو بڑا سا گھر ہے نا، اگلی گلی میں نکڑ والا............''

''فاروق صاحب کا؟''

''جی بیگم صاحب وہی۔ ان کی بیوی نے طوطا پال رکھا ہے۔ ہم ان کو نشانی کے لیے طوطے والی کہتے ہیں۔''

''اور یہ کھلونے والی کون ہے؟''

''وہ جو میت کے برابر والے بنگلے میں رہتی ہیں۔''

بیگم تراب علی نے اس علاقے کا نقشہ ذہن میں جمایا، ذرا غور کیا، پھر بولیں: ''اچھا! بخش الٰہی صاحب کا مکان؟''

''جی سرکار وہی۔''

''اری کم! بخت تو ان کی بیگم کو کھلونے والی کیوں کہتی ہے، جانتی ہے وہ تو لکھ پتی ہیں لکھ پتی، کھلونے تھوڑا ہی بیچتے ہیں۔''

''جب دیکھو ان کی کوٹھی میں ہر طرف کھلونے ہی کھلونے بکھرے رہتے ہیں، بہت بڑھیا بڑھیا کھلونے، یہ بڑے بڑے ہوائی جہاز، چلنے والی؛ باتیں کرنے والی گڑیا۔ بجلی کی ریل گاڑی، موٹریں............''

''اری موئی! یہ کھلونے تو وہ خود اپنے بچوں کے کھیلنے کے لیے ولایت سے منگواتے ہیں، بیچتے تھوڑا ہی ہیں''۔

''ہم نسانی کے لیے کہتے ہیں بیگم صاحب۔''

''اور یہ کالی میم کس بی صاحبہ کا خطاب ہے؟''

''وہ جو کرستان رہتے ہیں نا.........''

''مسز ڈی فلوری؟''

''جی ہاں، وہی۔''

''ہے کمبخت تیرا ناس جائے ....اور تپ دق والی کون ہے؟''

''اُدھر کو۔'' سگو نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بڑی سڑک پر پہلی گلی کے نکڑ والا جو گھر ہے، اس میں ہر وقت ایک عورت پلنگ پر پڑی رہے ہے اور میج پر بہت سی دواؤں کی سیسیاں نجر آوے ہیں۔''

بیگم صاحب بے اختیار مسکرا دیں۔ ان کا غصہ اب اُتر چکا تھا اور وہ سگو کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں کہ اچانک ایک بات ان کے ذہن میں آئی اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا: ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ڈانٹ کر بولیں:

''کیوں ری مردار! تو نے میرا بھی تو کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا۔ بتا کیا نام رکھا ہے؟ سچ سچ بتائیو، نہیں تو مارتے مارتے بھرکس نکال دوں گی۔''

''سگو ذرا ٹھٹکی، مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔''

''بیگم صاحب! چاہے ماریے چاہے جندہ چھوڑیے! ہم تو آپ کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں۔''

''چل جھوٹی مکار!''

''میں جھوٹ نہیں بولتی سرکار، چاہے جس کی قسم لے لیجیے .... کیوں ری جگو، ہم بیگم صاحب کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں نا؟''

''مجھے تو تم ماں بیٹیوں کی بات پر یقین نہیں آتا۔'' بیگم تراب علی بولیں۔ اس پر سگو خوشامدانہ لہجہ میں کہنے لگی:

''اجی آپ ایسی سکھی (سخی) اور گریب پرور ہیں۔ بھلا ہم آپ کی سان میں ایسی گستاخی کہہ سکتے ہیں۔''

بیگم صاحب کا غصہ کچھ دھیما ہوا اور انھوں نے سگو کو نصیحت کرنی شروع کی: ''دیکھو سگو! اس طرح شریف آدمیوں کے نام رکھنا ٹھیک نہیں۔ اگر ان کو پتا چل جائے، تو تجھے ایک دم نوکری سے جواب دے دیں۔''

اچھا بیگم صاحب! اس دفعہ تو ہمیں معاف کر دیں، آگے کو ہم کسی کو ان ناموں سے نہیں بلائیں گے۔''

شگو نے جب دیکھا بیگم صاحب کا غصہ بالکل اُتر گیا ہے، تو اس نے زمین پر پڑے ہوئے ٹہنوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''بیگم صاحب!'' اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ ''کھدا حجور کے صاحب اور بچوں کو سدا سکھی رکھے، یہ جو دو ٹہنے آپ نے کٹوائے ہیں، یہ تو آپ ہمیں دے دیجیے سرکار۔ جھونپڑی کی چھت کئی دنوں سے ٹوٹی ہوئی ہے، اس کی مرمت ہو جائے گی؛ گریب دعا دیں گے''۔

بیگم بلقیس تراب علی پہلے تو خاموش رہیں، مگر سگو نے زیادہ گڑگڑانا شروع کیا، تو پسیج گئیں: ''اچھا! اپنے آدمی سے کہنا، اُٹھالے جائے۔''

''کھدا آپ کو سکھی رکھے، بیگم صاحب، کھدا..........''

بیگم صاحب اس کی دعا پوری نہ سن سکیں، کیونکہ ان کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور وہ بنگلے کے اندر چلی گئیں۔

دوپہر کو بارہ بجے کے قریب سگو اور جگو سب کام نمٹا کر گھر جا رہی تھیں کہ سامنے سے ایک مہتر منڈاسا باندھے جھاڑو سے سڑک پر گردوغبار کے بادل اڑاتا جلد جلد چلا آ رہا تھا۔

دونوں ماں بیٹیاں اس کے قریب پہنچ کر رک گئیں۔

''آج بڑی دیر میں سڑک جھاڑنے نکلے ہو، جگو کے باوا؟''

''ہاں! جرا آنکھ دیر میں کھلی تھی۔''

یہ کہہ کر وہ مہتر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی نے روک لیا۔

''ان جگو کے باوا۔ جب سڑک جھاڑ چکیو، تو ڈھڈو کے بنگلے پر چلے جائیو، وہاں دو بڑے بڑے ٹہنے کٹے پڑے ہیں، انھیں اٹھالائیو۔ میں نے ڈھڈو سے اجاجت لے لی ہے۔'' [زندگی، نقاب، چہرے]

۲.۲ مرکزی خیال:

انسان میں خواہ کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، وہ ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ اُسے نہ صرف اچھے الفاظ میں یاد رکھا جائے، بلکہ اس کی بُری باتوں سے چشم پوشی اختیار کی جائے۔ معاشرے کے تمام افراد نہ تو اندھے ہوتے ہیں اور نہ ہی بہرے۔ وہ جو کچھ بھی جس طرح دیکھتے اور سنتے ہیں، اسی کے مطابق اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ پری چہرہ لوگ

اپنے بارے میں کیسی ہی خوش گمانی کا شکار کیوں نہ ہوں، عام لوگ اپنی رائے میں آزاد ہوتے ہیں۔

۳.۲ خلاصہ:

سیٹھ تراب علی کا شہر کے نواح میں ایک بہت بڑا بنگلہ تھا۔ بیگم تراب مردانہ ڈیل ڈول کی حامل خاتون تھی۔ رنگ سانولا تھا، جو نوکروں کو ڈانٹتے وقت سیاہ ہو جاتا تھا۔ اولاد تو کیا خود سیٹھ صاحب بھی بیگم کے رعب اور دبدبے سے دبے دبے رہتے تھے۔ وہ خاندان میں ملکہ کی طرح حکمرانی کرتی تھی۔ ایک روز بیگم تراب علاقے کی مہترانی سگو اور اُس کی بیٹی جگو کی گفتگو دیوار کی اوٹ سے سن لیتی ہے۔ دونوں ماں بیٹی مختلف گھروں کی بیگمات کے نام لینے کی بجائے اپنے رکھے ہوئے ناموں سے پکار رہی تھیں۔ کسی کا نام طوطے والی بیگم، کسی کا تپ دق والی، تو کسی کا کھلونے والی رکھا ہوا تھا۔ ان سب کے گھروں میں جگو کام کرتی تھی، لیکن جب وہ کسی کو کالی میم کہہ کر پکارتی ہیں، تو بیگم تراب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جیسے یہ نام اُسی کے لیے رکھا گیا ہو۔ وہ سگو کو بلاتی ہے اور وصفی ناموں کی حامل شخصیات کے اصل نام باری باری دریافت کرتی ہے۔ وہ کالی میم کے بارے میں بتاتی ہے کہ یہ کرسٹان مسز ڈی فلوری کا نام نشانی کے طور پر رکھا گیا ہے۔ جب بیگم اپنے نام کے خطاب سے متعلق دریافت کرتی ہے، تو وہ صاف کہہ دیتی ہے کہ ہم آپ کو بیگم صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ بیگم کا غصہ اور اُلجھن دونوں کافور ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ بیگم صاحب کو اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ اُس کی غیر موجودگی میں دونوں ماں بیٹی نے اُن کا نام ''ڈھڈو'' رکھا ہوا تھا اور سگو، جگو کے علاوہ سگو کا خاوند بھی اسے 'ڈھڈو' ہی کہہ کر پکارتا تھا۔

خود آزمائی:

ا۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔

(i) بیگم تراب علی کا ڈیل ڈول کیسا تھا؟

(ii) سگو اور جگو کون تھیں؟

(iii) سگو اور جگو نے مختلف گھروں کی بیگمات کے نشانی کے طور پر کیا نام رکھے ہوئے تھے؟

(iv) بیگم تراب نے سگو کو کیا پوچھنے کے لیے بلایا؟

(v) 'کالی میم' کا خطاب سن کر بیگم تراب کا ماتھا کیوں ٹھنکا؟

(vi) سگو اور جگو نے بیگم تراب کا نام کیا رکھا ہوا تھا؟

۲۔ سگو اور جگو کا نام بگاڑ کر رکھنا کسی حد تک درست تھا؟

۳۔ اس افسانے کا نام ''پری چہرہ لوگ'' کیوں رکھا گیا ہے؟

۴۔ درست جواب کی نشاندہی کریں۔

(i) بیگم تراب کو کن کاموں میں دلچسپی تھی؟

ا) کانٹ چھانٹ کے ب۔ بھاگ دوڑ کے ج۔ نگرانی کے

(ii) بیگم تراب کا ڈیل ڈول کیسا تھا؟

ا) مَردوں جیسا ب۔ شیروں جیسا ج۔ پھولوں جیسا

(iii) کالی میم کون تھی؟

ا) مسز جہاں آرا ب۔ مسز ڈی سلوا ج۔ مسز ڈی فلوری

(iv) سگو کی نظر کس پر تھی؟

ا) ٹہنوں پر ب۔ قالین پر ج۔ الماری پر

(v) کیا سگو نے بیگم تراب کے نام کے حوالے سے سچ بولا تھا؟

ا) نہیں ب۔ ہاں ج۔ بات گول کر گئی

۵۔ درج ذیل الفاظ اور تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

ڈانٹ ڈپٹ ۔ سنِ بلوغت ۔ باخبر ۔ املاک ۔ سخت مزاجی ۔ گم سم

۶۔ درج ذیل الفاظ کے درست تلفظ کو اعراب لگا کر واضح کریں۔

کفایت ۔ مجال ۔ فربہی ۔ مہترانی ۔ آنچل ۔ حضور ۔ للچائی

۳۔ احمد ندیم قاسمی

اصل نام احمد شاہ تھا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو خوشاب کے ایک گاؤں 'انگہ' میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک گاؤں ہی میں پڑھے۔ ۱۹۲۴ء میں والد کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے پاس کیمبل پور آ گئے۔ چچا کا تبادلہ شیخوپورہ میں ہوا، تو وہ بھی وہاں آ گئے۔ ۱۹۳۱ء میں یہیں سے میٹرک کیا، پھر بہاول پور کے ایجرٹن کالج میں داخل ہو گئے اور ۱۹۳۵ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۴۸ء میں شادی ہوئی۔ عملی زندگی کا آغاز ایک دفتر میں محرری سے کیا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں ملازمت چھوڑ کر مدیر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ وہ ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ کالم نگاری بھی کی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔

ان کے شعری مجموعوں میں: 'دھڑکنیں'، 'رم جھم'، 'جلال و جمال'، 'شعلۂ گل' اور 'دوام' بہت اہم ہیں۔ پندرہ افسانوی مجموعوں میں: 'چوپال'، 'بگولے'، 'گرداب'، 'در و دیوار'، 'سناٹا' اور 'آنچل' ادبِ اردو کی زینت ہیں۔ انھوں نے بحیثیتِ مدیر 'پھول'، 'ادبِ لطیف'، 'تہذیبِ نسواں'، 'سویرا'، 'نقوش'، 'سحر'، 'صحیفہ' اور 'فنون' جیسے بڑے ادبی رسائل میں خدمات انجام دیں۔ وہ روز نامہ ''امروز'' کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ بچوں کے حوالے سے بھی کہانیاں لکھیں اور ان کی مرتبہ کتب میں ''منٹو کے خطوط'' بہت اہم ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ہمیں پنجاب کے دیہات، پنجاب کی ثقافت کے مختلف رنگ اور دیہی زندگی کے مسائل کا احاطہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ چونکہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ تھے، اسے لیے اپنے افسانوں میں انھوں نے طبقاتی تضادات کو بھی پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں جہاں ایک طرف ہمیں غربت اور محرومی کا شکار کردار دکھائی دیتے ہیں، وہاں دوسری طرف اعلیٰ اقدار و روایات کے حامل کردار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا اسلوب سادہ بیانیہ ہے۔ ان کے کرداروں کی زبان وہی ہے کہ جو وہ اپنی حقیقی زندگی میں بولتے ہیں۔

۳.۱ خربوزے [متن]:

وہ تھکا ماندہ روتا بسورتا سو گیا۔ سوتے میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان کے ستارے ہولے ہولے خربوزوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں اور یہ آسمانی خربوزے جھم جھم کرتے اس کی جھولی میں آ گرتے ہیں۔ خود کٹ

جاتے ہیں، بیج خود ہی الگ ہو جاتے ہیں، خود اس کے منہ میں اپنا گودا تراش کر ڈال دیتے ہیں اور چھلکے اُچھل کر خود ہی پرے جا گرتے ہیں اور اس کی ماں جس نے شام سے اس وقت تک چیخنے چلانے کے باوجود اسے ایک خربوزے کے لیے دو پیسے نہیں دیے تھے، کواڑ کا سہارا لیے بیٹھی مسکرا رہی ہے اور اس کے ہم جولی پست دیوار پر سے اپنے گرد آلود سر اٹھا کر اسے تعجب اور شک سے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک ایک خربوزہ اس کے سر پر آن گرا اور وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا۔

''ہائے ماں خربوزہ۔''

اور اس کی ماں اچانک نیند سے چونک کر پکاری۔

تیرے دشمنوں کو موت آئے، تو کیا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ یہ اللہ مارے خربوزے کیا آئے ،میرے لیے آفت آ گئی۔ چند روز ہوئے تجھے ایک گول گول پیلا پیلا خربوزہ نہیں خرید دیا تھا..........سو جا!''

اس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر آنکھیں جھپکا کر آسمانی خربوزے دیکھنا چاہے، مگر بوڑھی بکری کے مدھم دھبے اور کبڑے نیم کے چُپ چاپ سائے کے سوا اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی، جس پر اسے خربوزے کا گمان ہو سکتا

۔

ساری رات اسے خربوزے بھرے خواب نظر آتے رہے اور جب صبح کو اٹھا، تو آنکھیں ملتا، اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا اور اس کے اُٹھے ہوئے گھٹنے پر اپنی ننھی سی ٹھوڑی رکھ کر مسکین آواز میں بولا:''ماں!''

اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی:''کیا......؟''

''خربوزہ!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اس کی حقیقی ماں کی آنکھیں سوتیلی ماؤں کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر ننھے کے گال پر اُلٹے ہاتھ سے اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر چولھے کے پاس جا گرا۔ زار و قطار روتا، وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا اور سوچنے لگا: اس دنیا میں پہلے ہی میرا باپ نہ تھا، اب میری ماں بھی کوئی نہیں۔ میں تو کوئی آوارہ بھکاری چھوکرا ہوں، جس گلی میں جاتا ہوں، کُتے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور جس سے بات کرتا ہوں وہ تیوری چڑھا لیتا ہے۔ بس اب آج کے بعد گھر نہیں جاؤں گا۔ ان کھیتوں سے نکل کر بہت دُور چلا جاؤں گا۔ وہ جہاں اڑتی ہوئی کونجیں چڑیاں سی نظر آ رہی ہیں، جہاں ریلیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ بس وہاں .... نہ کسی سے کچھ مانگوں گا؛ نہ کسی کی چوری کروں گا۔ دن کو چلتے چلتے تھک جاؤں گا، تو شیشموں تلے لیٹ رہوں گا؛ رات کو تھکوں

گا، تو نرم گھاس کے قطعوں پر سو رہوں گا۔ ماں کہا کرتی ہے کہ ہم سب کو رزق دینے والا خدا ہے، بس اس سے مانگوں گا، وہی میرا پیٹ بھر دے گا.......... وہی خربوزے بھی لا دے گا اور خربوزوں کا خیال آتے ہی وہ رک گیا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل کر اس نے ہاتھ بند کیے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا: ''اے میرے خدا! میں تجھے یاد کیا کرتا ہوں۔ برسوں مولوی جی سے میں نے نماز کا سبق بھی لیا تھا اور مجھے کلمہ بھی آتا ہے اور میں بہت اچھا ہوں۔ اچھے خدا اور تو یوں کر کہ مجھے آج اچھے اچھے پیلے پیلے خربوزے لا دے ضرور۔ میں آج ساری رات کلمہ پڑھتا رہوں گا اور پھر کبھی خربوزے نہ مانگوں گا۔ اسے میرے اچھے خدا! ...... اب میں آنکھیں بند کرتا ہوں، تو میرے سامنے خربوزے رکھ جا، لے۔''

اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے لبوں کے گوشے کانپنے لگے؛ نتھنے پھڑک گئے اور وہ مسکرانے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اللہ میاں اس کے لیے خربوزوں کی گٹھڑی باندھے آ رہے ہیں۔ قدموں کی چاپ نہایت تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ذہن پر اللہ میاں کا پاکیزہ ہیولا اُبھرا۔ سفید لباس، سفید بال، نورانی چہرہ، ایک سفید کپڑے میں پیلے پیلے خربوزوں کا ایک انبار باندھے، وہ اس کے قریب آئے اور پھر.......... اور پھر تڑاخ کی آواز آئی۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دھپ سے نکیل پتھروں پر گر گیا؛ اس پر سکتہ چھا گیا۔ پلٹ کر دیکھا، تو اللہ میاں کی جگہ سفید لباس پہنے سفید ریش بخشو کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور پریشانی میں وہ اپنی ڈاڑھی کو بار بار کھجلاتا تھا۔ گرج کر بولا: ''شیطان کہیں کا۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ کھڑا ہو گیا، جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ یوں کھیت میں گھسا آ رہا تھا، جیسے اپنے باپ کی ریاست میں اینڈتا پھر رہا ہے۔ شیطان کہیں کا۔''

ننھا، جو خدا اور بخشو کے اس ہولناک تصادم سے گھبرا سا گیا تھا، رونی صورت بنا کر بولا: ''میں تو خربوزوں کی ـ''
اور بخشو اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا: ''اور میں کب کہتا ہوں کہ تو یہاں نماز پڑھنے آیا ہے۔ خربوزوں کی تلاش ہی تو تجھے یہاں کھینچ لائی۔ پچھلے چند دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے، جس نے میرے کھیت کا پوربی گوشہ تباہ کر ڈالا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں۔''

''اور کل .... اور پرسوں؟'' بخشو نے اپنا سر دائیں اور پھر بائیں کاندھے پر جھکا کر کہا: ''کل پرسوں میں نے تجھے نہیں دیکھا، اس لیے .... اٹھ بھاگ یہاں سے۔ اگر آج کے بعد تو پھر ادھر آیا، تو نگل جاؤں گا تجھے۔ بڑا آیا خربوزوں کا رسیا۔ اتنا شوق ہے، تو ماں سے دو پیسے لے اور خرید لے جا خربوزہ۔''

ننھا اٹھا۔ اٹھتے ہوئے اس کی نظریں سامنے سارے کھیت میں گھوم گئیں اور بے شمار پیلے پیلے دھبے اس کے سامنے تیرتے ہوئے کہیں کھو گئے۔ سر جھکائے، وہ پلٹا اور بہت دور جا کر ایک ننھی سی بیری کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا: اس دنیا میں نہ تو اس کا کوئی باپ ہے اور نہ ماں اور نہ خدا.......... اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ سسکیاں بھرتا ہوا وہیں سو گیا۔

وہ بہت دیر تک خربوزوں بھرے خواب دیکھتا رہا، مگر اچانک جیسے اس کے منہ پر اللہ بخش نے تھپڑ مار دیا۔ بڑ بڑا کر اُٹھا، دیکھا، تو ماں کھڑی ہانپ رہی ہے۔ بڑی بڑی لال آنکھیں، پسینے سے شرابور چہرہ، پاؤں پر گرد جمی ہوئی، ہاتھ دوسرے طمانچے کے لیے تلا ہوا۔

''لگاؤں دوسرا؟'' وہ بولی۔ لگاؤں یا گھر چلے گا؟ ارے کم بخت! تو بخشو کے کھیت اُجاڑتا رہا ہے اور پھر بھی ہر وقت خربوزہ خربوزہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ ارے چوٹے! تجھے شرم نہ آئی۔ اللہ بخشے تیرے باپ کو، ایک روز پانچ روپے کا نوٹ گلی میں پڑا ملا تھا، تو بھاگا بھاگا چوپال پر گیا، پوچھ گچھ کی اور جس کا نوٹ تھا، اسے دے دیا۔ ایک کوڑی تک نہیں لی۔ گھر لے آتا، تو بھیڑ بکری خرید لی جاتی، لیکن اس کے من میں کھوٹ نہ تھا اور تو ایسا ناخلف؛ ایسا کپوت کہ خربوزے چراتا پھر رہا ہے۔ زبان کا چسکا پورا کرنے کے لیے خاندان بھر کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے۔ بخشو ابھی میرے ہاں آیا تھا اور اتنی عورتوں کے سامنے میری ناک کاٹ کر وہ پھینکی۔

ماں کی کف آلود ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہا، لیکن ماں کی ناک کٹ جانے کی خبر سُن کر اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ ماں کی ناک اُسی طرح قائم تھی۔ اسی طرح لمبی اور جھکی ہوئی اور پھر اُسے وہ سوراخ بھی نظر آ گیا، جو شاید بچپن میں بلاق ڈالنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کی ماں بھی عجیب ہے۔ اس پر ایک جھوٹا الزام دھر رہی ہے اور خود اتنا بڑا جھوٹ بول رہی ہے۔

''ارے چلتا ہے گھر یا۔'' ماں کا ہاتھ اور بلند ہو کر تن گیا۔ انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔ وہ اٹھا اور ہولے سے بولا: ''چلتا ہوں۔''

''چل میرے آگے'' ماں نے اس کی گردن کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا اور جب وہ بخشو کے کھیت کے قریب سے گزرا، تو اس کی آنکھوں کے سامنے پیلے پیلے پیلے تارے سے تیرنے لگے، جو آہستہ آہستہ رنگ بدلتے گئے اور جب وہ گھر پہنچا، تو وہ تارے صحن میں پڑے ہوئے کنکروں میں تبدیل ہو گئے۔

گھر آ کر ماں نے اسے دلاسا دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے نُون مرچ کے علاوہ اس کے سامنے گُڑ بھی تھا۔ ماں

اُسے پنکھا بھی جھلتی رہی اور یہ بھی کہا: ''تُو تو میرا سب کچھ ہے؛ تو ہی تو میرا دھن دولت ہے؛ تجھی کے سہارے تو میں جی رہی ہوں، ورنہ کب کی کسی کھائی میں چھلانگ لگا گئی ہوتی۔ تُو بڑا ہوگا، نوکر ہو جائے گا فوج میں۔''

''میں تھانے میں سپاہی بنوں گا۔'' اس نے لقمہ چباتے ہوئے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

''ہاں ہاں۔'' ماں مسکرا کر بولی۔ میرا ننھا تھانے کا سپاہی بنے گا۔ سر پر لال پگڑی، ہاتھ میں ننھی سی چھڑی، پاؤں میں کالے کالے بوٹ۔ جدھر جائے گا، لوگ زمین پر بچھتے جائیں گے اور پھر میرا لال چھٹی پر آئے گا، تو میرے لیے اچھی اچھی چیزیں لائے گا۔ ریشمی کپڑے اور مٹھائیاں اور..........''

''اور خربوزے بھی..........!'' اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ماں کے چہرے کی جُھریاں گہری ہو گئیں اور پھر وہ بولی: ''ہاں! خربوزے بھی اور..........''

اور ان باتوں کے دوران میں ننھا سوچتا رہا کہ ماں اس وقت بہت مہربان معلوم ہوتی ہے۔ اب میری ماں سچی ماں کے روپ میں ہے، کیوں نہ میں اسے ایک خربوزہ لانے کے لیے کہہ دوں، لیکن اس کی نظریں اچانک اپنی ماں کے سُوکھے ہوئے ہاتھ پر جا پڑیں، جس کی انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں۔ تھوک نگل کر چپکا ہو رہا۔

لیکن خربوزوں کا بُھوت اس کے سر پر اسی طرح سوار رہا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ ماں کو ایک خربوزے کے لیے کہہ دے۔ پرسوں ذیلدار، جس کے گھر کی چکی پیس کر ایک آنہ لائی ہے، کیا ان چار پیسوں میں سے، وہ ایک پیسے کا بھی حقدار نہیں؟ آخر اس کا پیسا ہوا آٹا اٹھا کر، وہی تو ذیلدار جی کی بیٹی کو دے آیا تھا اور اگر یوں نہیں، تو کیوں نہ وہ بخشو والے جُھوٹے الزام کو سچ کر دکھائے۔ چپکے سے گُھس جائے کھیت میں اور اتنے خربوزے کھائے کہ ساری عمر خربوزوں ہی کی ڈکاریں آتی رہیں، لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اچانک اس کے دماغ میں ماں کا اکڑا ہوا ہاتھ کلبلانے لگا اور اس کے سارے ارادے ننھے ننھے ذرے سے بن کر ہواؤں میں کھو گئے۔

ایک دن وہ ایک گلی میں خربوزے کے چھلکے دیکھتا گزر رہا تھا کہ اُسے ذیلدار کی آواز سنائی دی: ''اے ننھے! ادھر آ۔'' اس نے پلٹ کر دیکھا، تو اس کے کئی ہم عمر چوپال پر اکٹھے تھے۔ آخر آنکھیں جھپکاتا، وہ ذیلدار کے پلنگ تک گیا اور بولا: ''جی!''

ذیلدار جی بولے: ''ہمارا بھوسہ آیا ہے آج۔ اُس کوٹھے میں پڑا ہے۔ تم سب لڑکے اسے اچھی طرح لتاڑو؛ تاکہ وہ نیچے بیٹھ جائے اور بھوسے کا ایک اور بورا بھی کوٹھے میں آسکے۔ دو دو پیسے ملیں گے، تم سب کو..........لتاڑو

گے؟"

"لتاڑوں گا۔" ننھا بولا اور ہر طرف خربوزوں کا موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

سب لڑکے اندھیرے کوٹھے میں گھس کر بھوسے پر چڑھ گئے۔ بہت دیر تک کُودتے ناچتے، گرتے اٹھتے رہے۔ بھوسے میں سے مہین دھول نکل کر اُن کے بالوں، کانوں، آنکھوں اور مُنہ میں گھستی رہی، مگر دو پیسوں کا جادو انھیں اس شدت سے نچاتا رہا۔ کسی کو ریوڑیاں یاد آ رہی تھیں، تو کسی کو پیپر منٹ، کوئی مصالحہ دار گُڑ کے خواب دیکھ رہا تھا، تو کوئی رنگ برنگے پتنگوں کے، لیکن صرف ایک دماغ میں خربوزے لڑھک رہے تھے۔ قدموں کی ہر دھمک کے ساتھ کوئی اس کا کان میں کہتا: "خربوزہ۔"

اور وہ خوش ہو کر جی ہی جی میں کہتا: "خربوزہ نہیں، تو کیا ریوڑیاں؟ دانت ٹوٹ جاتے ہیں چباتے چباتے اور پیپر منٹوں سے کچی کچی بدبو آتی ہے اور مصالحہ دار گڑ میں مصالحہ کی جگہ مکوڑے پڑے ہوتے ہیں اور پتنگ ایک جھٹکے سے کٹ جاتے ہیں کم بخت۔ ہم تو خربوزہ خریدیں گے۔ باہر سے پیلا اور اندر سے سفید یا سبز۔ ایک ایک پھانک میں لاکھ لاکھ مزے!"

بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا؛ کودتا رہا؛ ناچتا رہا اور مہین دھول اس کی آنکھوں اور نتھنوں اور گلے میں گھستی رہی اور آخر جب ذیلدار جی مطمئن ہو گئے کہ بھوسا اس سے زیادہ نہ دب سکے گا، تو سب ننھے ننھے بھتنوں کی طرح باہر نکلے۔ دو دو پیسے سب کی ہتھیلیوں پر رکھے جانے لگے۔ ننھا سب سے آخر میں تھا۔ وہ جونہی ہاتھ پھیلائے ذیلدار جی کے قریب آیا اور انھوں نے جیب سے ہاتھ نکالا، تو وہ مٹھی بند کر کے کلیلیں بھرتا چوپال سے بھاگ نکلا۔

"ارے ننھے! پیسے تو لیتا جا۔" ذیلدار جی ہنستے ہوئے بولے۔ اس نے رُک کر مٹھی کھولی، تو خالی تھی۔ اسے ذیلدار جی بڑے سست اور نالائق معلوم ہونے لگے، جنھوں نے دو پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھنے میں تین گھنٹے لگا دیے تھے۔

واپس آ کر اس نے ذیلدار جی سے پیسے لیے، مگر اس کا ہاتھ کانپ گیا اور پیسے نیچے گھوڑے کی لید میں گر گئے۔ نہایت پھرتی سے اس نے لید سے پیسے اٹھائے اور ڈھلوان پر سے لڑھکتے ہوئے کھلونے کی طرح خربوزوں والے شامُوں کی دکان کی طرف لپکا۔

دُور سے شامو کو پُکارا: "چچا شامُوں! ایک خربوزہ، دو پیسے کا ایک اچھا سا، بڑا سا پیلا سا خربوزہ!"

اور جب وہ چچا شامُوں کے قریب پہنچا، تو خربوزہ منتخب ہو چکا تھا۔ دو پیسے شامُوں کے آگے پھینک کر وہ خربوزے کو بغل میں دبائے گھر کی طرف دوڑا۔ ایک جگہ اُس نے ٹھوکر بھی کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ حلق پر جمی ہوئی دھول تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے 'چیں چاں' بجنے لگی۔ گھر کے صحن میں قدم دھرتے ہی پکارا: ''ماں .... خربوزہ.........'' اور اس کا حلق فرطِ مسرت سے گھٹ گیا۔ ''خربوزہ.........!'' وہ ایک بار پھر چلایا۔

اندر سے آواز آئی: ''پھر وہی خربوزہ.........؟ تیرا باپ دے گیا ہے، مجھے خربوزے کہ تو......... ارے خربوزہ.........''

اور ماں نے بڑھ کر خربوزہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گھمایا۔

''کہاں سے لایا.........؟''

ننھے نے جب ماں کو سارا حال سنایا، تو وہ بولی: ''پیسے گھر لے آتا، تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلتا .... مگر خیر، تجھے شوق تھا .... شکر ہے تیرے من کی آگ تو ٹھنڈی ہوئی .... لے ذری چھری اٹھالا......... چولھے کے پاس پڑی ہوگی۔''

ننھا کودتا پھاندتا چولھے کے پاس گیا۔ چھری کے دھوکے میں دست پناہ اٹھا لایا۔ رستے میں پلٹ کر دست پناہ وہ پھینکا اور چُھری اٹھالی۔ ماں کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چُھری خربوزے پر جُھکی اور جب اس کی نوک خربوزے کے کلیجے میں داخل ہونے لگی، تو ماں بولی: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور جی ہی جی میں ننھے نے بھی بسم اللہ شریف پڑھی.........اور پھر.........!

پھر دونوں ٹکڑے الگ ہوگئے اور پانی کی ایک ندی سی فرش پر بہنے لگی۔ بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا سارا گودا پانی بن چکا تھا اور بیج کالے رنگ کے ہوگئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔ خربوزے کو فرش پر پٹخ کر ماں نے انگلیوں کی پانچ سلاخوں سے ننھے کے گال پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ لڑھکتا لڑھکتا دیوار کے قریب جا رُکا۔ چھلکے بوڑھی بکری نے بھی قبول نہ کیے۔

وہ روتا بلکتا سوگیا.........اور جب صبح کو اٹھا، تو اس کے گلے میں 'چیں چاں' سی ہو رہی تھی اور اس کے بدن سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

اور خربوزے کے چھلکے سے کالے کالے ملنگے چیونٹے چمٹ رہے تھے اور بخشو کے کھیت میں .... ہر طرف پیلے پیلے دھبے سے ناچنے لگے۔ وہ چیخ مار کر تڑپا اور کھٹولے سے نیچے آ رہا۔ [آنچل]

۳.۲ مرکزی خیال

انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔لیکن جو چیز قسمت میں نہیں ہوتی، وہ وسائل ہونے کے باوجود استعمال نہیں کی جا سکتی۔ 'خربوزے' خواہشات کا استعارہ ہیں۔ جب کوئی خواہش دل میں سر اٹھاتی ہے، تو اسے پورا کرنے کے عمل میں بعض اوقات ذلت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر انسان کی ہر خواہش پوری ہو۔

۳.۳ خلاصہ

ایک بچہ نھا جسے خربوزے کھانے کی شدید خواہش ہوئی۔ ماں کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ بچے کو خربوزے لا کر دے، لیکن بچہ اس ضد پہ اڑا رہا کہ اس نے ہر حال میں خربوزے کھانے ہیں۔ اسی ضد کی پاداش میں ماں نے اسے تھپڑ بھی رسید کیے، جس پہ وہ دل برداشتہ ہو کر کھیتوں کی طرف نکل بھاگا اور بے خیالی میں بخشو کے خربوزوں کے کھیت میں جا گھسا، جہاں بخشو نے بھی اس کی خوب پٹائی کی اور ماں کو الگ سے شکایت بھی کی، جس پر ماں بچے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھیتوں میں آ نکلی اور اس کی خوب بے عزتی کی۔ بچہ رات دن خربوزے کے سپنے دیکھنے کا عادی ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ خواب میں بھی اسے خربوزے ہی دکھائی دیتے۔ جب خربوزے کھانے کی خواہش حد سے بڑھ گئی، تو ماں نے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔ بچے نے پولیس میں بھرتی ہونے کا ارادہ کیا لیکن تان خربوزے پر ہی آ کر ٹوٹی۔

ہر ممکن کوشش کے بعد بھی بچے کو خربوزے نہ ملے۔ ایک دن اس کی یہ خواہش پوری ہونے کا موقع آ ہی گیا۔ گاؤں کے ذیلدار نے دو دو پیسوں کے عوض بچوں کو اچھل کود کر بھوسہ دبانے کے کام پہ لگا دیا۔ ہر بچہ اپنی اپنی خواہش من میں دبائے خوب جوش و خروش سے اچھلا کودا۔ کام کے ختم ہونے پر ہر بچے کو بھی دو دو پیسے ملے۔ خربوزے کے خواہش مند بچے نے شامو کی دکان سے ایک بڑا سا پیلا خربوزہ خریدا اور گھر کی طرف خوشی خوشی چل پڑا۔ گھر پہنچتے ہی ماں کو سارا ماجرا سنایا، تو ماں نے چھری لانے کو کہا تا کہ خربزے کو کاٹا جا سکے۔ جیسے ہی خربوزے کا کاٹا گیا اندر سے بدبودار پانی بہہ نکلا۔ سارا گودا پانی بن چکا تھا اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔ ماں نے ایک بار پھر بچے کے گال پر زوردار طمانچہ مارا، جس کی تکلیف سے وہ بلکنے لگا اور بلکتے بلکتے سو گیا۔ خواب میں اسے خربوزے کے چھلکے پر کالے کالے چیونٹے اور بخشو کے کھیت میں پیلے پیلے دھبے ناچتے نظر آنے لگے۔ وہ چیخ مار کر تڑپا اور کھوے سے نیچے آ رہا۔

خودآزمائی:

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔

(i) ننھا بچہ سوتے میں کیا خواب دیکھتا ہے؟

(ii) ماں جب خربوزہ لے کر دینے سے انکار کر دیتی ہے، تو بچہ ماں کے بارے میں کیا سوچتا ہے؟

(iii) بچہ اللہ میاں سے کیا دُعا مانگتا ہے؟

(iv) کھیت کا مالک بخشو بچے پر کیا الزام لگاتا ہے؟

(v) بچے کی سپاہی بننے کی آرزو کا سُن کر ماں کیا جواب دیتی ہے؟

(vi) ماں جب خربوزہ کاٹنے لگی، تو بچے نے دل میں کیا پڑھا؟

(vii) خربوزہ جب کاٹا گیا، تو اندر سے کیا نکلا؟

(ix) افسانہ 'خربوزے' پڑھ کر آپ نے کیا محسوس کیا؟ مختصراً لکھیں۔

۲۔ خالی جگہ کو پُر کریں۔

(i) ماں اچانک نیند سے .... کر پکاری۔

(ii) میں تو کوئی .... بھکاری چھوکرا ہوں۔

(iii) میرے کھیت کا .... کو تباہ کر ڈالا۔

(iv) ارے! .... تجھے شرم نہ آئی۔

(v) سب ننھے ننھے .... کی طرح باہر نکلے۔

(vi) اُس کا حلق .... سے گھٹ گیا۔

۳۔ افسانہ 'خربوزے' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ اور تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ اُن کا مفہوم واضح ہو جائے۔

تھکا ماندہ۔ گردآلود۔ بھکاری۔ چاپ۔ کم بخت۔ چوپال۔ فرطِ مسرت

۴۔ شوکت صدیقی

افسانوی ادب کے مقبول ترین تخلیق کار شوکت صدیقی ۲۰ مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام الطاف حسین تھا، جو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ شوکت صدیقی نے ۱۹۳۸ء میں میٹرک کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ ایف اے کرنے کے لیے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخلہ لیا، لیکن وہاں تعلیم باقاعدگی سے حاصل نہ کر پائے۔ ۱۹۴۰ء میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر درجہ دوم میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں پاس ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کرلیا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں افسانہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا۔ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۳ء فوج میں ملازم رہے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے اور صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرلیا۔ 'پاکستان اسٹینڈرڈ'، 'ٹائمز آف کراچی' روزنامہ 'انجام' اور 'مساوات' کے ایڈیٹر رہے۔ 'خدا کی بستی'، 'جانگلوس' اور 'چار دیواری' اُن کے ناولوں کے نام ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں: 'تیسرا آدمی'، 'اندھیرا اور اندھیرا'، 'راتوں کا شہر'، 'کیمیا گر' اور 'عشق کے دو چار دن' شامل ہیں۔ انھوں نے کئی یادگار ڈرامے لکھے اور کالم نگاری بھی کی۔ اُن کے کالم 'طبقاتی جدوجہد اور بنیاد پرستی' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں آدم جی ادبی ایوارڈ، ۱۹۹۷ء میں پرائڈ آف پرفارمنس، ۲۰۰۲ء میں کمالِ فن ایوارڈ اور پھر ۲۰۰۳ء میں ستارۂ امتیاز سے بھی سرافراز ہوئے۔

شوکت صدیقی کی کہانیاں شہری زندگی کے مسائل اور پریشانیوں کو موضوع بناتی ہیں۔ غربت، مفلسی، بے بسی اور طبقاتی تفریق سے معاشرے میں کیسی کیسی ہولناک صورتیں منظرِ عام پر آتی ہیں؟ شوکت صدیقی ان خوفناک صورتوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ پیش کرنے کا تخلیقی جوہر رکھتے ہیں۔ اُن کا اسلوب اگرچہ سادہ ہے، لیکن ان کا موضوع بہت تہہ دار ہوتا ہے۔ وہ موضوع خواہ سیاسی اور سماجی ہو، خواہ معاشی، وہ ایک حقیقت نگار ہی نہیں، بلکہ اپنی اس جہت کی بدولت حقیقت کا شعور بھی عطا کرتے ہیں۔

۴.۱ تماشائے اہلِ کرم [متن]:

سڑک کے کنارے ایک موڑ سے اچانک کتوں کا غول نمودار ہوا۔ کتے کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور زور زور سے بھونک بھی رہے تھے۔ سلیم احمد خان درانی نے مُڑ کر ان کی جانب دیکھا اور جھنجھلا کر بڑبڑانے لگا۔

سامنے نظر ڈالی، تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک سایہ کار کی بتیوں کی تیز روشنی میں لہرایا۔ درانی نے گھبرا کر بریک لگانے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں ایک ہول ناک چیخ اُبھری۔ کار زور سے اُچھلی اور بے قابو ہو کر سڑک کے کنارے لگے ہوئے ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرا کر رک گئی۔

حادثہ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ درانی دم بخود رہ گیا۔ چند لمحے تک ہکا بکا سا اسٹیرنگ وہیل کے سہارے بُت بنا بیٹھا رہا، پھر ذرا ہوش ٹھکانے آئے، تو وہ سنبھلا۔ خیریت ہوئی کہ جسم پر کہیں چوٹ چپیٹ نہیں آئی تھی۔ وہ بالکل محفوظ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور کار سے نکل کر باہر آ گیا۔

اس نے بدحواس ہو کر دیکھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ کوئی اندھیرے میں بے حال پڑا تھا اور رک رک کر کراہ رہا تھا۔ درانی نے اس کی کراہ سنی۔ دم بھر کے لیے ٹھٹکا، پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ تاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں درانی نے غور سے دیکھا۔ ایک لمبا چوڑا آدمی اوندھے منہ سڑک پر لیٹا تھا۔ اس کے آس پاس خون ہی خون پھیلا تھا۔ دور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور گہری خاموشی چھائی تھی۔

درانی نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جھکا اور سڑک پر پڑے ہوئے زخمی شخص کے بازوؤں کو دونوں ہاتھوں سے تھاما؛ اپنی طرف کھینچا اور اسے گھسیٹتا ہوا کسی نہ کسی طور سڑک کے کنارے لے گیا۔ اس نے اب کراہنا بند کر دیا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ درانی نے اس کی یہ حالت دیکھی، تو پریشان ہو گیا۔ موقع غنیمت تھا، اس نے فرار ہونے کی کوشش کی، مگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔

ہر طرح کی کوشش کے باوجود جب انجن اسٹارٹ نہ ہوا اور کار ٹس سے مس نہ ہوئی، تو مجبوراً وہ پھر باہر آ گیا۔ سہا ہوا سا خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا۔ وہ اب تک بے سُدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ درانی خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے؟ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ کار چھوڑ کر بھاگ جائے، مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ جائے واردات پر کار کی موجودگی اس کے خلاف پورا پورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔

درانی کی پریشانی اور گھبراہٹ دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ آس پاس آبادی بھی نہ تھی۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور چٹیل میدان تھا، جس میں کہیں کہیں خودرو اور جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ درانی کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ گم سم کھڑا تھا۔ کئی منٹ اس گومگو کے عالم میں گزر گئے۔ ناگاہ، دور سے روشنی اُبھری

اور سڑک پر پھیلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹرک سامنے سے نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ قریب آ گیا۔ درانی نے اپنے حواس درست کیے، آگے بڑھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر ٹرک ٹھہرانے کی کوشش کی۔ ٹرک نزدیک پہنچ کر رک گیا۔

درانی نے اونچی آواز سے کہا: ''ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

ٹرک کے اندر ڈرائیور کے علاوہ کلینر بھی موجود تھا۔ دونوں نے جھک کر باہر دیکھا۔ ان کے سامنے خون میں لتھڑا ہوا ایک کالا کلوٹا آدمی مردے کی مانند بے حال پڑا تھا۔ قریب ہی درانی کی کار کھڑی تھی، جس کا بونٹ ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرا کر ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ کھمبا بھی کار کی ٹکر سے ایک طرف جھک گیا تھا۔

''زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔'' ڈرائیور نے زخمی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا: ''کیا ایک دم سامنے آ گیا تھا؟''

''یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔'' درانی نے مڑ کر زخمی کو دیکھا، جو ٹرک کی بتیوں کی تیز روشنی میں بے جان نظر آ رہا تھا۔ ''اسے فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔''

''معاف کرنا جی، میں ایسے چکر میں نہیں پڑتا۔'' ڈرائیور نے بے رخی سے جواب دیا۔

درانی نے عاجزی سے کہا: ''یہ ایک زندگی کا سوال ہے۔ اسے فوری طور پر طبی امداد نہ ملی، تو ختم ہو جائے گا۔''

''یہ تو اسپتال پہنچے سے پہلے ہی راستے میں مر جائے گا۔ اس کی حالت دیکھ کر، تو یہی معلوم ہوتا ہے۔'' ڈرائیور اسپتال جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ ''مر گیا، تو تمھارے ساتھ میں بھی پھنس جاؤں گا۔ گواہی دو، ہر پیشی پر عدالت میں حاضری لگواؤ۔ نہ جاؤ، تو گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو جائے گا۔''

''پولیس الگ پریشان کرے گی، کبھی تھانے جاؤ؛ کبھی عدالت۔'' اس دفعہ کلینر بولا۔

اس نے حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی کی۔ اس نے ڈرائیور کو مخاطب کیا: ''استاد گاڑی اسٹارٹ کرو۔ اس پھڈے میں نہ پڑو۔ یاد ہے نہر کے پل والا ایکسیڈنٹ۔ عدالت کے چکر کاٹ کاٹ کر کتنی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ سارا دھندا چوپٹ ہو گیا تھا۔''

''گویا تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔'' درانی نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

''میں تمھاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ تھانے پہنچا دوں۔'' ڈرائیور نے مشورہ دیا۔ ''تھانہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں، راستے ہی میں پڑے گا۔ میں تم کو وہاں چھوڑ دوں گا۔''

''مگر میں تھانے جا کر کیا کروں گا؟'' درانی نے حیرت سے پوچھا۔

''لگتا ہے پہلی بار تمھارا ایکسیڈنٹ سے سابقہ پڑا ہے۔'' ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔ ''میری گاڑی سے تو جب بھی ایکسیڈنٹ ہوتا ہے، گاڑی چھوڑ کر سیدھا تھانے جاتا ہوں۔ تھانے ہی میں معاملہ ہو جائے، تو عام طور پر عدالت جانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ساری کارروائی تو، پولیس ہی کو کوئی ہوتی ہے نا۔ میرا کہنا مانو، تو تھانے چلے جاؤ۔ دیوان جی سے اپنی جان پہچان بھی ہے۔ اس وقت ڈیوٹی پر ہوئے، تو معاملہ طے کرادوں گا۔''

درانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحے گم سم کھڑا سوچتا رہا، پھر اس نے ڈرائیور کا مشورہ قبول کرلیا۔ اس کے ہمراہ تھانے جانے پر آمادہ ہوگیا۔ ٹرک کے اندر داخل ہوا اور ڈرائیور کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے اکسیلیٹر دبایا؛ ٹرک آگے بڑھا اور سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔

درانی چلا گیا، مگر زخمی سڑک کے کنارے بے ہوش پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک کار اس کے نزدیک آ کر رُکی۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص کار سے نکل کر باہر آیا۔ اتفاق سے وہ ڈاکٹر تھا۔ نوجوان اور صحت مند تھا۔ خدا ترس بھی تھا۔ اس نے زخمی کو اُٹھا کر کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے زخمی کو شعبۂ حادثات کے ڈاکٹروں کے سپرد کر دیا۔

یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ درانی نے تھانے میں پہنچ کر کس ڈھب سے بات کی، ٹرک ڈرائیور کے وسیلے سے کیوں کر اپنی گلوخلاصی کرائی اور پولیس نے ضابطے کی کارروائی کس طور مکمل کی؟ تھانے کے ہیڈ محرر نے روزنامچے میں کیا رپورٹ درج کی؟ البتہ مقامی اخبارات میں حادثے کے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں، ان سے اتنا معلوم ہو سکا کہ زخمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشا چلاتا تھا۔ حادثے کی شب مالک کو رکشا واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ نکلسن روڈ کے موڑ پر ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ گیا تھا۔ زخم ایسا کاری لگا کہ فوراً بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا، تو وہ اسپتال میں تھا۔

عبداللہ لگ بھگ دو مہینے تک اسپتال کے جنرل وارڈ میں زیرِ علاج رہا۔ جس روز اسپتال سے چھٹی ملی، تو صرف اس کی بیوی موجود تھی، وہ اسے گھر لے گئی۔ حادثے میں جو زخم آئے تھے، وہ تو علاج معالجے سے مندمل ہو گئے، لیکن پیر کی ہڈی ایسی چکنا چور ہوگئی کہ درست نہ ہوسکی۔ ڈاکٹروں نے مجبوراً اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی۔

عبداللہ اب کسی کام دھندے کے لائق نہیں رہا تھا۔ ایک ٹانگ سے محروم ہونے کے بعد وہ بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا مضبوط جسم مرجھا کر کُبڑوں کی مانند جھک گیا تھا۔ وہ تمام وقت گھر میں پڑا کھانستا رہتا۔ آل اولاد بھی نہ تھی۔ لے دے گھر میں صرف ایک بیوی تھی، جو اس کی مونس وغم گسار بھی تھی اور اس کے غم و

غصے کا نشانہ بھی بنتی تھی۔ وہ بہت چڑ چڑا اور زود رنج ہو گیا تھا۔ بات بات پر بیوی سے لڑتا جھگڑتا۔ مارنے پیٹنے کی دھمکی بھی دیتا۔ اس کا سیاہ رنگ کچھ اور زیادہ سیاہ ہو گیا تھا۔ ڈاڑھی بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برستی، چہرہ روز بروز خوف ناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے، جو از راہِ ہمدردی کبھی کبھار اس کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے، اب کترانے لگے تھے۔

عبداللہ جس محلّے میں رہتا تھا، اس کی بیشتر آبادی غریب اور پس ماندہ طبقے کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ محلّے میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے نیم پختہ مکانات تھے۔ چند قدیم وضع کی بلند و بالا عمارتیں بھی تھیں، جو امتدادِ زمانہ سے روز بروز کھنڈر بنتی جا رہی تھیں۔ تنگ و تاریک گلیاں تھیں، جن کے درمیان انگریزوں کا ایک قبرستان بھی تھا۔ قبرستان کے چاروں طرف قدِ آدم پختہ چار دیواری تھی۔ وسط میں ایک اونچی لاٹ تھی، جس پر سنگِ مرمر کا کتبہ آویزاں تھا۔ یہ کسی انگریز کرنل کی قبر تھی، جس کی تمام زندگی میدانِ جنگ میں غنیم سے معرکہ آرائی میں بسر ہوئی تھی، لیکن اس کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔

محلّے بھر میں مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا تھا۔ اکثر سنسان راتوں میں لوگوں نے اسے گلیوں میں منڈلاتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب کبھی وہ کسی کو نظر آیا، تو ہمیشہ ایک ہی صدا لگاتا: ''مکھن ٹوش۔'' خدا معلوم اس کی اس طلب کا کیا مطلب تھا؟ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس کسی کی بھی مڈ بھیڑ ہوئی، اس نے یہی آواز اس کے منہ سے سنی اور یہ آواز اس قدر ڈراؤنی ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ، جو پتلی سی گلی جاتی تھی، رات گئے راہ گیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

محلّے کی دوسری نمایاں شخصیت سکینہ بیگم تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور ان کے شوہر ترکے میں بہت بڑی جائیدار چھوڑ کر مرے تھے۔ مرحوم کی جیتی جاگتی نشانی صرف ایک بیٹا تھا۔ سکینہ نے اُسے بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا۔ اسے دیکھ کر جیتی تھیں؛ ہر طرح سے ناز برداری کرتی تھیں، مگر وہ پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ گھر سے روٹھ کر چلا گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے ماں سے کھچڑی کھانے کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت کچھ ناساز تھی۔ باورچی نے توجہ نہ دی۔ دستر خواں پر کھچڑی نہ پا کر صاحب زادے اس قدر برا فروختہ ہوئے کہ بغیر کچھ کھائے پیے دستر خواں سے اٹھ گئے۔ اس کے بعد اُسے کسی نے نہ دیکھا۔ البتہ کچھ عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ ٹرین کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ حادثے کے کئی عینی گواہ تھے۔ انھوں نے سکینہ بیگم کو اس الم ناک سانحے سے

آگاہ بھی کیا، لیکن وہ کسی طرح یقین ماننے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ بعد میں کوئی اس کا اظہار بھی کرتا، تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتیں؛ ایک سانس میں سیکڑوں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا سب نے اس سلسلے میں بات کرنا ہی ترک کر دیا، بلکہ بعض عورتوں نے طرح طرح کے قصے کہانیاں سنا کر ٹھگنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ آئے دن نت نیا قصہ گڑھ کر لاتیں اور سکینہ بیگم سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔

سکینہ بیگم ہر تہوار پر بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں؛ خاندان کی ہر خوب صورت لڑکی کے لیے اپنے بیٹے کا پیغام دیتیں؛ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشاطائیں بلواتیں؛ انھیں انعام و اکرام دیتیں اور ان کے ذریعے بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی بیٹے کے بارے میں پوچھتا، تو مسکرا کر کہتیں: ''بس آنے ہی والا ہے۔ کل ہی تو ایک شخص ڈیوڑھی پر آیا تھا، جس سے اس نے میری خیریت دریافت کی تھی۔ کبھی اس کے خط کا حوالہ دیتیں اور پھر مزے لے لے کر اس کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیتیں''۔ سننے والے ان کی باتیں سُن کر دل ہی دل میں افسوس کرتے؛ خبطی اور سنکی کہتے؛ ان کی دیوانگی دیکھ کر کفِ افسوس ملتے۔

وہ ہر روز بیٹے کی آمد کا انتظار کرتیں۔ ہر شام نہایت اہتمام سے اس کے لیے کھچڑی پکواتیں؛ رات گئے تک منتظر رہتیں؛ صبح ہوتی، تو کھچڑی باسی ہو جاتی۔ محلے کے کسی محتاج اور مسکین کا اس سے پیٹ بھر جاتا۔ کئی سال سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا، باسی کھچڑی سے اسے بھی حصہ مل جاتا۔ سویرے ہی سویرے اس کی بیوی اُٹھ کر سکینہ بیگم کے دروازے پر جاتی اور جب واپس گھر آتی، تو میاں بیوی کے لیے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

عبداللہ کے شب و روز اسی طرح نیم فاقہ کشی اور تنگ دستی میں کٹ رہے تھے۔ اتفاق سے اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ طبیعت ایسی بگڑی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ عبداللہ کو کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب پیٹ کی آگ بجھانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو ایک روز اس نے اپنی بیساکھی سنبھالی اور اس کے سہارے چلتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کا مہینا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سرِ شام ہی محلے میں سناٹا پڑ گیا تھا۔ گلی کوچے ویران ہو گئے تھے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے ملحق تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ دھندلی دھندلی روشنی میں اسے کسی آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ جہاں تھا، وہیں ٹھہر گیا۔ جب وہ قریب آیا، تو عبداللہ نے جھجکتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے سامنے کر دیا۔ راہگیر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا: عبداللہ کا چہرہ اندھیرے میں اس قدر

ڈراؤنا لگا کہ خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی۔ پھر وہ پُڑا بھی زمین پر گر گیا، جو اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ چند لمحے حیران و پریشان کھڑا رہا۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے، تو اس نے فرش پر پڑے ہوئے پُڑے کو دیکھا۔ جھک کر اسے اٹھایا، کھول کر نظر ڈالی۔ گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں؛ گھبراہٹ ہوا ہو گئی۔ فوراً گھر پہنچا۔ میاں بیوی نے مزے لے لے کر امرتیاں کھائیں اور اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا۔

دوسرے روز عبداللہ رات کو پھر اسی گلی میں پہنچا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دیر تک گلی میں قبرستان کے احاطے کی دیوار سے لگائے کھڑا رہا، لیکن کوئی بھولے سے بھی اِدھر نہ آیا۔ سردی سے عبداللہ کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر جب وہ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا، تو اچانک ایک مونگ پھلی بیچنے والا گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے ہاتھ پھیلانے کی بجائے ناک میں منمنا کر کہا: ''ذراں بانت سُن ناں بھائی۔''

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ، بھوت پریتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات، مونگ پھلی والے پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ لحظہ بھر تک آنکھیں پھاڑے؛ منہ کھولے چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا، پھر لڑکھڑایا اور گر کر بے ہوش ہو گیا؛ اس کا خوانچہ بھی گر گیا۔ عبداللہ نے فرش پر بے سدھ پڑے ہوئے پھیری والے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جلدی جلدی اپنی چادر کے پلو میں سیر، سوا سیر مونگ پھلیاں باندھیں اور بیساکھی کے سہارے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ان دو واقعات سے محلّے بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ گھر گھر چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت آج کل راہگیروں کو بہت پریشان کر رہا ہے۔ رات کو گلی کوچوں میں منڈلاتا رہتا ہے؛ ڈراتا ہے؛ دھمکاتا ہے، جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔ قبرستان کے آس پاس رہنے والوں پر تو اور بھی زیادہ دہشت طاری تھی۔ وہ سرِ شام ہی دروازے بند کر کے گھروں میں بیٹھ جاتے۔ عبداللہ نے خوف اور دہشت کی اس فضا سے اور بھی فائدہ اٹھایا۔

رات گئے جب راستے سنسان ہو جاتے اور ہر طرف ہو کا عالم ہوتا، تو عبداللہ اپنی میلی کچیلی چادر اوڑھتا؛ خاموشی سے باہر نکلتا؛ قبرستان سے ملحق گلی میں داخل ہوتا اور اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ اِدھر کوئی بھولا بھٹکا راہگیر گلی میں داخل ہوا اور عبداللہ چوکس ہو کر اس کی گھات میں فوراً لگ گیا۔ قریب آتے ہی وہ بڑی خوف ناک آواز میں منمنا کر صدا بلند کرتا: ''مکھن ٹوش'' راہگیر اس کی آواز سنتے ہی دہشت زدہ ہو جاتا۔ عبداللہ نے اب

باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر بھی ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی اشیا پر اکتفا کر لیا کرتا تھا، پھر ایسا ہوا کہ اگر کوئی خوف سے بے ہوش ہو جاتا، تو وہ اس کی جیبیں ٹٹولتا، جامہ تلاشی لیتا اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا، اپنے قبضے میں کر لیتا۔

محلّے میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں سخت خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ دوسری طرف عبداللہ اپنے کام میں اتنا مشاق اور اتنا نڈر ہو گیا تھا کہ اکثر اندھیرے سے نکل کر جھپٹتا اور اپنے شکار کو دبوچ لیتا۔ کسی کو ''مکھن ٹوش'' کی خوف ناک صدا سے اور کسی کو صرف لرزہ خیز قہقہہ لگا کر بدحواس کر دیتا؛ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی؛ کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا؛ کبھی چہرہ کھلا ہوتا، کبھی چادر سے چھپا ہوتا؛ جیسا موقع ہوتا، اسی مناسبت سے اپنا حربہ استعمال کرتا۔

آخر ایک ایسا وقت آیا کہ راہ گیروں اور پھیری والوں نے رات کو قبرستان والی گلی سے گزرنا ہی چھوڑ دیا۔ کوئی بھولے سے بھی اس میں داخل نہ ہوتا، لیکن عبداللہ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ اس قدر دیدہ دلیر ہو گیا تھا کہ اندھیری اور سنسان راتوں میں گلی سے نکل کر باہر چلا جاتا اور راہگیروں کو ڈرا دھمکا کر جو کچھ ملتا، ہتھیا لیتا۔ گھر واپس جا کر بیوی کے سامنے اسے ڈال دیتا اور مسکرا کر کہتا: آج صرف اتنا ہی ٹیکس وصول ہوا۔ پہلے وہ پوچھ گچھ کرتی تھی؛ تشویش کا اظہار کرتی تھی، لیکن وہ بھی اب عادی ہو گئی تھی۔ دونوں کی مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

محلّے والے بھی اب اس قدر دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ سورج غروب ہوتے ہی کوچہ و بازار کی رونق اُجڑ جاتی؛ ہر طرف ویرانی برسنے لگتی؛ سناٹا شدید ہو جاتا اور اس ہولناک سناٹے میں عبداللہ اطمینان سے کسی گلی کے نکڑ پر اندھیرے میں دبکا ہوا کھڑا ہوتا۔ اس کا چہرہ اب اور بھی ڈراؤنا ہو گیا تھا؛ آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی وحشت اور بڑھ گئی تھی اور اس کی آواز میں دم توڑتے ہوئے انسان کا سا کرب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنی کوٹھری میں پڑا سوتا رہتا۔ پہر رات گزرتے ہی چادر اٹھاتا اور جسم کے گرد لپیٹ کر بیساکھی کے سہارے باہر چلا جاتا اور ویران گلیوں میں اپنے شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔

جاڑوں کا چل چلاؤ تھا اور گرمی کی آمد آمد تھی۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہ ملا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کے گھر ایک مدت سے آمد و رفت بند کر دی تھی۔ دونوں بالکل قلاش تھے، لہٰذا مسلسل کئی وقت کے فاقے کرنا پڑے۔

بیوی گھر میں اکیلی تھی۔ رات گہری ہو چکی تھی، مگر بھوک کے مارے اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس رات،

عبداللہ جلد ہی گھر سے باہر چلا گیا تھا اور بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ سناٹا بڑھتا گیا؛ وقت گزرتا رہا؛ رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی، لیکن عبداللہ کو کوئی بھی بھولا بھٹکا راہگیر نہ ملا۔ گلی کوچے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

عبداللہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات کی وہ گھڑی قریب آتی جا رہی تھی، جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ سنائی پڑتی، جن کی نظروں سے بچنے کے لیے اُسے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عام طور پر آدھی رات سے پہلے ہی واپس گھر چلا جاتا تھا، مگر آج رات وہ خالی ہاتھ واپس جانا نہ چاہتا تھا۔

آخر جب کوئی شکار ہاتھ نہ آیا، تو اس نے ایک نیا حربہ آزمانا چاہا۔ کسی راہگیر کی گھات میں کہیں چھپ کر کھڑے ہونے کی بجائے وہ کسی مکان کو تاڑتا؛ قریب جاتا دروازے سے کان لگا کر اندر کی سُن گن لیتا۔ وہ کئی مکانوں کے دروازوں پر پہنچا؛ سُن گن لینے کی ابھی کوشش کی، لیکن ہمت نہ ہوئی۔ پھر ایک مکان کو اس نے تاکا۔ دروازے پر پہنچ کر آہستہ سے دستک دی، لیکن اس وقت وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے رک رک کر کئی بار دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری: ''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو''۔ عبداللہ نے آہستہ سے کہا۔

قدموں کی آہٹ اُبھری اور دروازہ کھول کر کسی نے منہ باہر نکالا۔ پوچھا: ''کون ہے؟ سامنے آؤ۔''

عبداللہ اندھیرے سے نکل کر ایک دم سامنے آ گیا۔ اس نے خوفناک لہجے میں منمنا کر صدا بلند کی: ''مکھن ٹوش۔''

اس شخص کی سٹی گم ہوگئی۔ گلا پھاڑ کر چیخا۔ ''باپ رے باپ۔''

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھی ڈراؤنی آواز میں کہا: ''ماکھان ٹوش۔''

وہ شخص بدحواس ہو کر چلانے لگا: ''بھوت، بھوت۔''

سابقہ تجربے کے پیشِ نظر عبداللہ کو اب وہاں سے سٹک جانا چاہیے تھا، مگر وہ ڈھیٹ بنا دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب تو یہ خوف زدہ ہو ہی چکا ہے، ایک وار اور کروں گا، تو بے ہوش کر گر جائے گا۔ اس نے انتہائی خوفناک لہجے میں صدا بلند کی: ''ماکھان ٹوش۔''

اس بار اس شخص پر یہ ردِعمل ہوا کہ وہ اور بھی زیادہ دہشت زدہ ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ یہ بیٹھک کا دروازہ تھا، جس میں کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے۔ وہ بھی بیدار ہو گئے۔ ذرا دیر تو وہ سہمے ہوئے دم بخود پڑے رہے، پھر

سب بدحواس ہو کر چیخنے لگے: ''بھوت۔ بھوت۔''

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سُن کر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔ وہ اپنی بیساکھی سنبھال کر مڑا؛ آگے بڑھا اور کسی نہ کسی طرف قبرستان کے ساتھ والی تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوگیا۔ اب پاس پڑوس کے مکانوں کے رہنے والے بیدار ہوگئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جو ہمت کر کے گھروں سے نکل نکل کر باہر آنے لگے۔ وہ اونچی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ عبداللہ نے محسوس کیا کہ گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ گلی سے باہر نکلنے کی گنجائش نہ تھی۔ اِدھر اُدھر جانے کے بجائے وہ اندھیرے میں ایک دیوار کے ساتھ دبک کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

ناگاہ گلی کے پختہ فرش پر قدموں کی آہٹ اُبھری اور کوئی تیزی سے آ کر عبداللہ سے ٹکرایا۔ لڑکھڑایا، مگر گرا نہیں۔ وہ بھوت، بھوت کہتا ہوا سرپٹ بھاگا، پھر تو ہر طرف سے ملی جلی آوازیں اُبھرنے لگیں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ اسی اثنا میں ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آ کر زور سے لگا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ ہر طرف سے پتھر آ آ کر گلی میں گرنے لگے۔ ساتھ ہی ملی جلی آوازیں بھی اُبھرتی رہیں: ''گلی میں بھوت ہے۔''

''وہ دیکھو! کچھ نظر تو آ رہا ہے۔''

''ہاں، ہاں! دیوار کے ساتھ کوئی اندھیرے میں کھڑا ہے۔''

اچانک غلغلہ بلند ہوا۔ ''بھوت، بھوت'' اور پتھروں کی بارش تیز ہوگئی۔ پتھر آ آ کر عبداللہ کے جسم سے ٹکرا رہے تھے اور ایک پتھر تو اس کے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت ایک اور پتھر اس کی کن پٹی پر لگا۔ عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

قریب ہی ایک گہری بدرُو تھی۔ عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر بدرُو میں داخل ہو جائے، تو سنگ باری سے بچ جائے گا۔ اس نے ہمت سے کام لیا اور دھیرے دھیرے بدرُو کی جانب کھسکنے لگا، مگر وہ بدرُو کے قریب پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ کر لگا۔ عبداللہ جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخا: ''ہائے مرا۔''

عبداللہ پتھروں کی لگا تار چوٹوں سے بلبلا کر کئی بار چیخا؛ کئی بار اس نے التجا کی؛ گڑگڑایا بھی؛ دہائی بھی دی، مگر دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا؛ کسی کے کانوں تک اس کی فریاد نہ پہنچی۔ پتھروں کی بارش مسلسل ہوتی رہی۔ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے۔ وہ اس وقت کرنل کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے

ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور گلی میں بے تحاشا پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور بڑا خوف ناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے روز محلّے والوں نے دیکھا۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک بے حد غلیظ آدمی منہ اوندھائے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے کالے کلوٹے جسم کے ہر حصے پر گاڑھا گاڑھا خون بہہ کہ جم گیا تھا۔ اس کا خوفناک چہرہ بدرُو کے اندر تھا اور کیچڑ میں لت پت تھا۔

یہ عبداللہ تھا، جو رات کو مر گیا تھا۔ [راتوں کا شہر]

۴.۲ مرکزی خیال:

حادثات اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتے کہ جن کے باعث انسانی زندگی کا رخ بسا اوقات ایسا تبدیل ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود تماشائی بن جاتا ہے۔ یہ حادثات انسان کو بعض اوقات کوئی ایسی راہ سُجھا دیتے ہیں کہ جس پر چلنا خود اُس انسان کے لیے مجبوری بن جاتا ہے، لیکن دوسرے لوگ اُس کی مجبوری کو جانے بغیر اس انسان کی زندگی کو اندھیروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اسی کو افسانہ نگار نے تماشائے اہلِ کرم قرار دے دیا ہے اور طنز کی ایک لطیف، مگر سوگوار فضا کو اُبھارا ہے۔

۴.۳ خلاصہ

عبداللہ ایک بے اولاد غریب آدمی تھا۔ ایک رات رکشا اپنے مالک کو لوٹا کر واپس گھر آ رہا تھا کہ درانی نامی ایک شخص کی کار تلے آ کر بُری طرح کچلا گیا۔ درانی نے پولیس کے ساتھ مل کر اس حادثے سے اپنی گلو خلاصی پائی، لیکن ایک نوجوان خدا ترس ڈاکٹر کا گزر جب اُس حادثے کی سڑک پر سے ہوا، تو اس نے عبداللہ کو اُٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال پہنچا دیا، جہاں وہ دو ماہ تک زیرِ علاج رہا۔ وہ صحت مند تو ہو گیا، لیکن اُس کی ایک ٹانگ مجبوراً کاٹنی پڑی، کیونکہ پیر کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی اور اُس کے ٹھیک ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ محلّے میں ایک سکینہ بیگم رہتی تھی، جس کا بیٹا روٹھ کر گھر سے ایسا بھاگا تھا کہ پھر ماں کی خبر تک نہ لی۔ ایک اطلاع کے مطابق: وہ ایک ٹرین کے حادثے میں جان بحق ہو چکا تھا، لیکن وہ اُس کی واپسی کی اب بھی منتظر تھی۔ عبداللہ جو ٹانگ کی وجہ سے کام سے معذور ہو چکا تھا، سکینہ اپنے بیٹے کے لیے کھچڑی پکاتی اور رات گئے تک بیٹے کا انتظار کرتی رہتی، صبح جب وہ نہ

آ تا، تو کسی غریب مسکین کو دے دیتی تھی۔ اب یہ غریب اور مسکین عبداللہ اور اس کی بیوی تھے۔ یہ کھچڑی عبداللہ کی بیوی سکینہ کے گھر سے لے آتی تھی اور ایک وقت کھانے کا بندوبست ہو جاتا تھا، لیکن جب بیوی بیمار پڑی اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوگئی، تو کھانے کا یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ محلّے کے قبرستان میں ایک انگریز کی قبر تھی کہ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ انگریز کرنل کا بھوت سنسنان راتوں میں محلے کی گلیوں میں منڈلاتا ہے اور 'مکھن ٹوش' کی صدا لگاتا ہے۔ ایک تاریک رات جب عبداللہ قبرستان والی گلی سے گزر رہا ہوتا ہے، تو ایک راہ گیر عبداللہ کو اچانک سامنے پا کر اُسے بھوت سمجھتے ہوئے ایسا گھبراتا ہے کہ گرم گرم امرتیاں اُس کے ہاتھ سے گر جاتی ہیں۔ عبداللہ لفافہ اٹھالیتا ہے اور دونوں میاں بیوی مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ دوسری مرتبہ مونگ پھلی بیچنے والا دہشت زدہ ہوکر بھاگ جاتا ہے۔ غرض عبداللہ کو تاریک راتوں میں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ کرنل کے بھوت کے وہم میں مبتلا لوگ اُسے اب کرنل کا بھوت ہی سمجھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ اندھیرا ہوتے ہی وہ کسی نہ کسی شکار کو 'مکھن ٹوش' کی صدا لگا کر دبوچ لیتا تھا۔ اب وہ دن بھر سوتا اور رات کو 'کام' پر نکل جاتا تھا۔ ایک رات وہ ایک گھر کے پاس دروازے کے ساتھ لگ کر 'مکھن ٹوش' پکارتا ہے، تو گھر والے کی دہشت کے مارے چیخ نکل گئی۔ اس چیخ پکار کو سُن کر اور لوگ بھی بیدار ہو گئے۔ عبداللہ قبرستان کی طرف لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ اُس نے جان بچانے کی بہت کوشش کی، لیکن لوگوں نے اُس بھوت کو پتھروں کی بارش کر کے ابدی نیند سُلا دیا۔ اگلی صبح پتا چلا کہ وہ بھوت نہیں تھا، بلکہ کالا کلوٹا عبداللہ تھا۔

خود آزمائی:

ا۔ درج ذیل سوالات کے جواب تحریر کریں۔

(i) کار کے حادثے کے بعد درانی کی پریشانی کا اصل سبب کیا تھا؟

(ii) ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر نے درانی کو کیا مشورہ دیا؟

(iii) عبداللہ کتنا عرصہ ہسپتال میں زیرِ علاج رہا؟

(iv) عبداللہ جس محلّے میں رہتا تھا، وہاں کی بیشتر آبادی کن لوگوں پر مشتمل تھی؟

(v) بیوہ سکینہ بیگم کا بیٹا گھر سے کیوں بھاگ گیا تھا؟

(vi) سکینہ بیگم کھچڑی کیوں پکاتی تھی اور صبح کھچڑی کسے دے دیتی تھی؟

(vii) عبداللہ کے گھر کھچڑی آنا کیوں بند ہوگئی؟

(viii) عبداللہ نے کس بات کو اپنے لیے روٹی روزی کا ذریعہ بنایا؟

(ix) اہلِ محلّہ نے عبداللہ پر کیا سمجھ کر سنگ باری کی؟

(x) عبداللہ نے رات کی تاریکی میں بھوت بن کر کن کن لوگوں کو لوٹا؟

۲۔ عبداللہ جیسے معذور لوگوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟اس سوال کے جواب میں ایک مفصل نوٹ لکھیں۔

۳۔ افسانہ 'تماشائے اہلِ کرم' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۴۔ آپ کے خیال میں درانی کا رویہ درست تھا؟ اگر نہیں، تو کیوں؟

۵۔ افسانہ 'تماشائے اہلِ کرم' میں کس توہم پرستی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ آپ کے خیال میں توہم پرستی سے نجات کی صورت کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

۶۔ درج ذیل الفاظ اور تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ اُن کا مفہوم واضح ہو جائے۔
گومگو۔ ناگاہ۔ حوصلہ شکنی۔ گلوخلاصی۔ فاقہ کشی۔ سرِ شام

۵۔ اشفاق احمد

اشفاق احمد ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ لاہور منتقل ہو گئے۔ نوجوان اشفاق احمد کے لیے یہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا۔ اگرچہ گریجوایٹ تھے، لیکن حصولِ روزگار کے لیے کوشاں رہے۔ عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز محکمہ ریلوے میں ایک معمولی ملازمت سے کیا، لیکن اگلے ہی روز ملازمت کو خیر باد کہا اور لاہور میں والٹن کے مقام پر مہاجرین کے کیمپ میں ملازم بھرتی ہو گئے۔ یہاں اناؤنسمنٹ کا شعبہ اُن کے سپرد ہوا۔ اسی زمانے میں بانو قدسیہ سے شادی ہوئی۔ میاں بیوی نے مل کر لاہور سے ایک معروف ادبی رسالے 'داستان گو' کا اجرا کیا۔ ۱۹۶۸ء میں ایم اے (اردو) کرنے کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں بطور لیکچرار خدمات انجام دیں۔ ریڈیائی ڈراموں کے علاوہ پاکستان ٹیلی وژن کے لیے بیسیوں فیچر اور ڈرامے تخلیق کیے۔ کچھ عرصہ ڈائریکٹر آر سی ڈی ریجنل کلچرل انسٹی ٹیوٹ رہے اور بعد میں سنٹرل ترقی اردو بورڈ لاہور کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں حکومت پاکستان نے انھیں 'پرائڈ آف پرفارمنس' سے نوازا۔

'ایک محبت سو افسانے'، 'اجلے پھول' اور 'سفرِ مینا' اشفاق احمد کے افسانوی مجموعے ہیں۔ انھوں نے متعدد کتب کے تراجم بھی کیے۔ اشفاق احمد بظاہر سیدھی سادی کہانی لکھتے ہیں، لیکن ان کی کہانیوں کے موضوعات اُن کے گہرے فکری اعماق کا پتا دیتے ہیں۔ اُن کا اسلوب بالکل داستان گو کی طرح ہے۔ اُن کے افسانے پڑھیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خود اشفاق احمد قاری کو کہانی سُنا رہے ہوں۔ کرداروں کی جزئیات کو سمیٹنے میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ پورا وقوعہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ بحیثیت ڈرامہ نگار اُن کی کامیابی کا راز بھی اُن کا مخصوص افسانوی اسلوب ہے۔ وہ زندگی کی کہانی نہیں لکھتے، بلکہ اپنی کہانی خود تراش کر اُس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ 'عجیب بادشاہ'، 'امی'، 'حقیقت نیوش' اور 'گڈریا' اس حوالے سے اُن کی یادگار کہانیاں ہیں۔

۵.۱ دم [متن]:

مادھو کے مرنے میں صرف چند گھنٹے رہ گئے تھے اور اس کی جوان بہن پکی سڑک پر ننگے پاؤں کھڑی تھی .... گود میں مادھو تھا، آنکھوں میں آنسو، کانوں میں پیتل کے بندے اور ہاتھ میں پانی کی بھری ہوئی شیشی۔ وہ مرتے ہوئے مادھو کو اپنے سینے سے لگائے اور پانی کی شیشی پر نگاہیں جمائے کسی ایسی دردناک فلم کا اشتہار سی لگتی تھی،

جس کا آج آخری شو ہو۔

جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلے، تو سب سے پہلے گاگو کسائی نے گائتری کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے اُسے بلایا اور پھر کہنے لگا: ''کیا حال ہے پتر مادھو بیٹے کا؟'' گائتری سسکیاں بھر کر رونے لگی، تو گاگو بولا: ''ہے نا بے قوف، تھڑ دلی .... اللہ مولا نے کل سویر تک فضل کر دینا ہے اور اس نے بھاگتے پھرنا ہے''۔ پھر اس نے بسم اللہ پڑھ کر شیشی کے کھلے منہ میں پھونک ماری اور مادھو پر دم کر کے آگے بڑھ گیا۔

دوسرے نمازیوں میں سے بھی چند ایک بزرگوں نے شیشی پر دم کیا اور گائتری کے سر پر پیار دے کر آگے چلے گئے۔ میرے ابا جی چونکہ بوٹ پہن کر مسجد میں آتے تھے اور سیڑھیوں پر بیٹھ کر آرام سے تسمے کھولتے اور باندھتے تھے، اس لیے سب سے آخر میں ہم باہر نکلے۔ ابا جی نے آیت الکرسی پڑھ کر شیشی پر دم کیا اور تین مرتبہ یا حی یا قیوم اونچی آواز میں کہہ کر مادھو پر پھونک ماری۔

ہمارے قصبے میں اکثر، مغرب کے وقت بہت سی غیر مسلم عورتیں اور لڑکیاں پانی پر دم کرانے کے لیے مسجد کے دروازے پر موجود ہوتیں۔ نمازی ایک ایک کر کے ان کے گلاسوں، کٹوروں اور بوتلوں پر دم کرتے اپنی اپنی راہ نکل جاتے۔ میں اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اگر میرا ایک سال مارا نہ گیا ہوتا، تو میٹرک پاس کر چکا ہوتا، لیکن میری کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ ابا جی سے پوچھوں کہ مغرب کے وقت یہ عورتیں کہاں سے آ جاتی ہیں اور ان کے گھروں پر کیا، مصیبت ٹوٹی ہے، جو انھیں ہر روز ہی پانی دم کرا کے لے جانا پڑتا ہے؟ پھر دم کیے پانی سے یہ ضروری تو نہیں کہ مریض اچھا ہی ہو جائے؛ کئی مر بھی جاتے ہیں؛ کچھ دائم المرض بھی ہو جاتے ہیں؛ کئی ایک تھوڑا عرصہ تجربہ کرنے کے بعد چھوڑ بھی جاتے ہیں، لیکن یہ ساری باتیں میری استفسار کا حصہ نہ تھیں۔ میں اپنے ابا جی سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ دم کرانے آتے کیوں ہیں؟ مجھے ان کے چھوڑ جانے پر اعتراض نہیں تھا، ان کے چلے آنے پر تعجب تھا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے وہ ہماری طرف ہی کیوں چلے آ رہے ہیں، لیکن آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے اپنے ابا جیوں سے ایسے سوال پوچھے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ غیر ترقی یافتہ زمانہ تھا، اس لیے اپنے بڑوں سے غیر ضروری باتیں نہیں کی جا سکتی تھیں۔

اگلی شام میں نے گائتری کو پھر مغرب کے وقت مسجد کے دروازے پر کھڑے پایا۔ مادھو ابھی تک زندہ تھا اور ایک جونک کی طرح اس کے سینے سے لپٹا ہوا تھا۔ میرے حساب سے اسے رات کے وقت فوت ہو جانا چاہیے تھا، لیکن وہ بدستور سانس لے رہا تھا اور باقی تھا، گو اس کے تن بدن میں زندگی کے آثار موجود نہ تھے۔ نمازیوں نے

ایک بار پھر مادھو پر اور اس کے ساتھ آئی ہوئی شیشی پر دم کیا اور آگے نکل گئے۔

گائتری ہمارے قصبے کے وید جی ماتھر صاحب کی بیٹی تھی اور مادھو اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ ان کا چھوٹا سا گھرانا ایک چھوٹے سے گھر میں قیام پذیر تھا اور ماتھر صاحب اپنے گھر پر ہی مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ میں نے ان کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے کئی مرتبہ دور دراز سے لائے ہوئے مریضوں کو چارپائیوں پر اور ڈولیوں میں پڑے دیکھا تھا۔ ان کے لواحقین گلی میں زمین یا دیواروں کے ساتھ ڈھو لگائے کھڑے ہوتے اور ان کے چہروں پر مایوسی کے نقوش کے علاوہ اور کوئی لکھت نہ ہوتی اور ان کے بندھے ہوئے ہاتھوں کے رخ آسمان کے سوا اور کسی طرف نہ ہوتے۔

گائتری کی عمر مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ وہ سبز کناری کی میلی سی دھوتی باندھے اور بالوں میں پیتل کے کلپ لگائے مسجد کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس کی گود میں زندہ بچ جانے والا مادھو تھا، جس کے سر پر کیسری ٹوپی، پاؤں میں نیلے رنگ کے موزے اور گلے میں پرانی دھجی سے بندھا ایک میلا سا تعویذ تھا۔ آج اس کے ہاتھ میں شیشی کے بجائے پیلے کانچ کا ایک چھوٹا سا گلاس تھا اور پاؤں میں سلیپروں کے بجائے اپنے سائز سے ذرا بڑی چپل تھی۔ اس روز ابا جی کسی وجہ سے مسجد نہ آسکے تھے اور میں اکیلے ہی مغرب پڑھنے آیا تھا۔

جب سب نمازی گائتری کے گلاس پر دم کر کے آگے نکل گئے، تو مسجد کے دروازے پر میرے قدم من من کے ہو گئے اور زمین نے میرے قدموں کو چنبک کی طرح پکڑ لیا۔ سب نمازیوں کے چلے جانے کے باوجود گائتری اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے زور لگا کہ اپنی منمنی آواز میں کہا: ''ابا جی تو آج نہیں آئے''۔

مادھو ذرا سا ٹھنکا، تو اس نے اپنے بھائی کو گودی میں جھلا کر اپنا گلاس میرے آگے کر دیا۔ مجھے آتا تو سب کچھ تھا، لیکن پیلے کانچ کے بڑھے ہوئے گلاس کو دیکھ کر مجھے سب کچھ بھول گیا۔ میں نے پورا زور لگا کر ہولے سے گلاس میں ''پھو'' کیا، تو اس نے پہلو پھرا کر مادھو کو میرے آگے کر دیا۔ مادھو کمزور تو اب بھی تھا، لیکن اس کی صحت بحال ہوگئی تھی۔ کیسری ٹوپی میں وہ چھوٹا سا بوزنہ دکھائی دیتا تھا، جو اپنی بازی گر ماں کے کرتب دکھا چکنے کے بعد اس کے پیٹ سے دوبارہ چمٹ گیا تھا۔ میں نے الحمد شریف پڑھ کر مادھو کے سارے وجود پر لمبی [illegible]، تو گائتری کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

دوسری مرتبہ جب میں گائتری سے ملا، یہ گرمیوں کی چھٹیوں کی بات ہے اور میں شہر کے بڑے کالج سے تین مہینے کی چھٹیاں گزارنے گھر آیا تھا۔ جب میں آہستہ روی کے ساتھ ان کے دروازے کے اندر جھانکتا ہوا آگے

بڑھا، تو ماتھر جی نے آواز دے کر مجھے پکارا، میں پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ ماتھر جی نے گرج دار ہانگ لگا کر کہا: ''میاں اِدھر کدھر دیکھ رہے ہو، میں نے تمھیں پکارا ہے''۔

ماتھر جی ایک بڑے سے تسلے میں گرم گرم کاڑھا بانس کی کھپچی سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ گائتری ان کے پاس پیڑھی پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ململ کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا۔ مجھے آہستگی سے اندر آتے دیکھ کر انھوں نے 'سارا دن آوارہ گردی کرتے ہو، کچھ کام بھی کیا کرو۔ اس ڈبے پر بیٹھو اور ادھر یہ کپڑا پکڑو' گائتری نے اپنی پیڑھی چھوڑ کر کہا: 'آپ ادھر آ جائیں، ڈبے پر میں بیٹھ جاتی ہوں'۔

''جس کو میں نے جہاں کہہ دیا ہے، وہی جگہ اس کے لیے ٹھیک ہے''۔ ماتھر صاحب نے کھپچی باہر نکال کر گاڑھی دھار کو اپنی انگلی اور انگوٹھے سے چپچپایا اور پھر بولے: ''گھبرانا نہیں، گرم نہیں ہے اور کنارا چھوڑنا بھی نہیں ہے۔ پلو پکڑتے ہیں، تو خوب مضبوطی سے پکڑتے ہیں۔ سمجھے!''

میں نے کہا: ''جی سمجھ گیا''۔ ڈبے پر بیٹھ کر ایک طرف سے ململ کا کنارا میں نے پکڑا اور دوسری طرف سے گائتری نے۔ ماتھر جی نے کاڑھے کا ایک ڈونگا بھر کر ململ کی جھولی میں ڈالا اور بولے: ''یہ چیبن پراش ہے۔ اس کا نسخہ لکھنؤ میں بھی ملتا۔ ہمارے گھرانے کا خاص کمال ہے، بنگالیوں کو بھی اس کا علم نہیں''۔

گائتری نے مسکرا کر کہا: ''بابو جی کے گھرانے کا ہر کمال خاص کمال ہوتا ہے''۔

بابو جی نے ڈونگا روک کر کہا: ''پوچھ لے اپنی ماں سے کہ اس کے مقابلے میں ہمارا گھرانا کیسا تھا؟ میرے بابا تو یہاں نیوتہ نہیں دیتے تھے، پر گاؤں والوں نے انھیں مجبور کر دیا''۔

میں نے حوصلہ کر کے کہا: ''ماتھر جی! مجھے تو چاچی جی کے قد بت سے ان کا گھرانا بڑا معلوم ہوتا ہے''۔

ہنس کر بولے: ''اس کا قد بت تو ہمارے گھر آ کر بڑا ہوا، ورنہ گائتری کی پیدائش سے پہلے تو یہ بالکل چڑیا سی تھی، تمھاری چاچی''

گائتری نے کہا: ''باتوں میں نہ پڑ جائیں، کپڑے کی طرف بھی دھیان رکھیں۔ آپ کے ہاتھ سے پلو پھسلا جا رہا ہے''۔ میں نے چونک کر دیکھا، تو واقعی میری طرف سے کونے کی ایک چنٹ ڈھیلی ہو کر اوک سی بنائے کھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اوک کی طناب کھینچی اور چوکسی کے ساتھ کنارا مضبوطی سے پکڑ لیا۔

مادھو گلی ڈنڈا ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا، تو ماتھر جی نے کہا: ''اوئے ٹڈے سلام کر بھیا کو، جس کے پھونک سے تم کو نیا جیون ملا ہے''۔

میں نے کہا: ''ناں ماتھر جی، ناں۔ میں کون ہوتا ہوں جیون کو ہینڈل کرنے والا۔ اس کو نیا جیون تو اسی نے دیا ہے، جس نے پہلا جیون دیا تھا''۔

''پر آپ لوگوں نے پانی پر بھی تو اس کا نام پڑھ کر پھونکا تھا''۔ گائتری نے کہا۔ ''آپ لوگ نہ ہوتے، تو اس وقت مادھو بھی نہ ہوتا!''

''یہ لوگ بھی نہ ہوتے اور تیری دھروو تا بھی نہ ہوتی، تو میرا گھر اندھیرا گھپ ہو جاتا تھا۔ جس بنیتی کی مورت بن کر تو ہر شام مسجد کے دروازے کھڑی ہوتی رہی ہے، اس پر تو بھگوان کو ترس آنا ہی تھا......... میں تجھے برگد کی اوٹ سے ہر شام دیکھتا تھا اور روتا تھا''۔

''پھر تو آپ کے آنسو کام آئے بابو جی!'' گائتری نے چمک کر کہا۔

''میں مادھو کے لیے تھوڑی روتا تھا مورکھ'' ماتھر نے جی چڑ کر کہا۔ ''میں تو تیرے لیے روتا تھا کہ بھائی کے لیے کس طرح ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے''۔

''اتنی دیر کھڑے ہونا کون سا مشکل ہے ماتھر جی!'' میں نے شرارتاً کہا۔ ''مغرب کی نماز تو بہت مختصر ہوتی ہے''۔

ماتھر جی نے اچھی بھلی باتوں کے رخ کو موڑ کر اچانک مجھ سے پوچھا: ''اچھا جی! تم کیا پڑھ کے دم کرتے تھے مادھو پر''؟

میں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا: ''ماتھر جی! میں ہمیشہ الحمد شریف پڑھ کر ہی دم کیا کرتا تھا''۔

میں نے کپڑے کا کرتا پھر سے ٹھیک کیا اور کھسیانا ہو کر پوچھنے لگا: ''ماتھر جی! دم درود کا واقعی کوئی اثر ہوتا ہے یا انسان نے اپنے دل کی تسلی کے لیے یہ سہارا ڈھونڈ لیا ہے''؟

''ہمارا مادھو تو آپ کے سامنے ہے''۔ گائتری بولی: ''مہینا بھر بابو جی نے اس کا علاج کیا، پھر شہر لے جا کر ٹیکے لگواتے رہے، جو دوا جس نے بتائی، اس کو دی، پر یہ تو نکھرتا ہی چلا گیا''۔

''بات یہ ہے''۔ ماتھر جی نے ہماری جھولی میں کچھی پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب بھگوان کے بھید ہیں اور اصل علم اسی کے پاس ہے۔ جب کوئی اس کی چوکھٹ پر گھٹنے ٹیک کے اور سیس نوا کے اپنا آپ......... پورے کا پورا .... اس کے حوالے کر دیتا ہے، تو وہ اپنی مرضی بھی تبدیل کر لیتا ہے۔ ہم سے تو یہ کام نہ ہو سکا۔ نہ مجھ سے نہ اس کی ماں سے، پر گائتری نے بنیتی کر کے بھگوان کی اچھیا بدلوا لی''۔

میں ابھی کچھ دیر اور وہاں بیٹھتا، لیکن کاڑھا سارے کا سارا چھن گیا اور میرے کرنے جوگا اور کوئی کام باقی نہ رہا۔ میں اٹھنے لگا، تو گائتری نے کہا: ''میں آپ کے لیے مالٹے لاؤں؟ ہمارے گھر بہت ہی اچھے مالٹے آئے ہیں، ریڈ بلڈ''۔

میں نے کہا: ''مجھے کل سے زکام ہے..........''

''زکام ہے!'' ماتھر جی نے کڑک کر کہا: ''تو تمھارے لئے ہر کھٹی چیز منع ہے۔ سنگترے، مالٹے اور نیبو کے تو قریب بھی نہیں جانا؛ نام تک نہیں لینا ان کا۔ مالٹا تو ریشہ بڑھا دیتا ہے، سر اور گردن پکڑ لیتا ہے۔ اس کو اندر سے املتاش کی اوولیہ لا کر چٹاؤ''۔

گائتری املتاش کی جوارش لے کر آ گئی، تو وہ مجھے جوارش چٹانے لگی۔

پرسوں جب میری پوتی کی حالت بہت خراب ہوگئی، تو میں گھر سے کانچ کا ایک گلاس لے کر مسجد چلا گیا۔ وضو کی ٹونٹی سے اس میں پانی بھرا اور نماز کے بعد ہر نمازی سے اس پر دم کروایا۔

واپسی پر جب میں نے پڑھا ہوا پانی اپنی بہو کو دیا، تو اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بڑی محبت سے کہا: ''ابو! وائرس اور جراثیم پر یہ پانی کس طرح سے اثر انداز ہوسکتا ہے، اس کے تو اپنے بہت سے جراثیم ہوں گے۔ میں نینا کو ابلا ہوا پانی دیتی ہوں، وہ بھی نکال دیتی ہے۔ یہ پانی تو اس کے لیے بہت ہی خطرناک ہوگا''۔

جب میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، تو وہ احتراماً بولی: ''میں اس پانی کو زمین پر نہیں گراؤں گی، اپنے منی پلانٹ کے پودے میں ڈال دوں گی۔ مجھے پتا ہے پڑھے ہوئے پانی کو زمین پر نہیں پھینکا کرتے''۔

میں چپ چاپ اس کے کمرے سے یوں باہر نکل گیا، جیسے میں آخری مرتبہ گائتری کے گھر سے نکلا تھا!

۵.۲ مرکزی خیال:

اس افسانے میں اشفاق احمد نے ایک معدوم ہوتی روایت کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ موضوع بنایا ہے۔ اللہ کے کلام میں بڑی شفا ہوتی ہے۔ اس کلام کو پڑھ کر دم کیا گیا پانی مریض کو صحت یاب کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد کے دروازے سے نمازی ادئیگی نماز کے بعد جب باہر نکلتے ہیں، تو مسلمان کیا غیر مسلم بھی پانی کے گلاس یا کٹورے وغیرہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، نمازی کی پھونک وسیلہ صحت بن جاتی ہے، لیکن عہدِ جدید میں سائنس اور سماج کی ترقی کے باعث ان باتوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔

۵.۳ خلاصہ:

یہ بھلے زمانے کے بھلے لوگوں کی کہانی ہے۔ مادھو کے والد ماتھر جی خود ایک حکیم تھے۔ پورے قصبے میں اُن کے ہاتھ کی شفا مشہور تھی۔ اُن کا بیٹا مادھو جب بیمار پڑا، تو مہینا بھر خود ہی علاج معالجہ کرتے رہے۔ بات نہ بنی، پھر شہر جا کر ٹیکے بھی لگوائے، لیکن بیماری تھی کہ جانے کا نام نہ لیتی۔ اب بیماری سے بچاؤ کی صرف ایک ہی تدبیر تھی کہ جس سے پورا قصبہ آگاہ تھا۔ چنانچہ مادھو کی بہن گائتری اپنے ننھے بھائی کو سینے سے چمٹائے، پانی کی شیشی ہاتھ میں لیے مسجد کے دروازے پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ نمازی مسجد سے باہر نکلتے؛ آیات پڑھتے اور شیشی پر دم کر دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کے بقول: اُس کے علاج کا یہ طریقہ کئی سوالات کو جنم دیتا تھا، لیکن شاید اُن دنوں ایسے سوالات بڑوں سے پوچھنے کی اجازت نہ تھی۔ نمازِ مغرب کے بعد افسانہ نگار جب مسجد سے باہر نکلا، تو اس نے بھی اپنے ابا جی کی طرح الحمد شریف پڑھ کر مادھو کے سارے وجود پر پھونکی۔ اللہ کی قدرت دم توڑتا بچہ بھلا چنگا ہو گیا۔ ماتھر جی کو پورا یقین تھا کہ افسانہ نگار ہی کی پھونک سے مادھو کو نیا جیون ملا تھا۔ ماہ و سال بیتے؛ زمانہ بدلا، افسانہ نگار اب دادا بن چکا تھا، لیکن اُس کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ رہی کہ اللہ کے کلام میں ایسی برکت ہے کہ موت کے منہ میں جاتا کوئی بھی مادھو واپس آ سکتا ہے۔ جب افسانہ نگار کی پوتی بیمار پڑتی ہے، تو وہ بھی خود مسجد کے وضو کے پانی سے گلاس بھر کر نمازیوں سے دم کروا لایا اور بہو سے پوتی کو پلانے کے لیے کہا، لیکن بہو نے بڑی محبت سے کہا کہ اس پانی میں وائرس اور جراثیم ہیں، جبکہ نینا اُبلا ہوا پانی پیتی ہے۔ بہو اس پانی کو مقدس سمجھتی ہے اور اسے گرانے کی بجائے منی پلانٹ کے پودے میں ڈال دیتی ہے۔

خود آزمائی:

ا۔ درج ذیل خالی جگہوں کو پُر کریں۔

ا۔ گود میں مادھو تھا، آنکھوں میں آنسو، کانوں میں پیتل کے..........

ب۔ اللہ مولا نے کل سویر تک .... کر دینا ہے۔

ج۔ ماتھر صاحب اپنے گھر پر ہی .... کا علاج کرتے تھے۔

د۔ مسجد کے دروازے پر میرے قدم .... کے ہو گئے۔

ہ۔ یہ سب .... کے بھید ہیں۔

۲۔ درج ذیل کے مختصر جوابات تحریر کریں۔

ا۔ اپنے مرتے ہوئے بھائی کو سینے سے چمٹائے گائتری کس فلم کا اشتہار لگتی تھی؟

ب۔ غیر مسلم عورتیں پانی پر دم کرانے مسجد کے دروازے پر کس وقت آتیں؟

ج۔ ماتھر جی کا ذریعۂ معاش کیا تھا؟

د۔ افسانہ نگار کو دم کیے پانی کے اثرات پر کس حد تک یقین تھا؟

ہ۔ افسانہ نگار نے کیا پڑھ کر پانی پر دم کیا؟

و۔ ماتھر جی نے افسانہ نگار کو مالٹا کھانے سے کیوں منع کیا؟

ز۔ افسانہ نگار اپنی پوتی کے لیے مسجد سے پانی دم کروا کر کیوں لایا؟

ح۔ بہو نے دم والے پانی کی بابت کیا رائے دی؟

۳۔ درست جواب پر (✓) اور غلط پر (X) کا نشان لگائیں۔

ا۔ گاگوکسائی نے مادھو کے سر پر ہاتھ رکھا۔ (   )

ب۔ ابا جی ٹوپی پہن کر مسجد آتے تھے۔ (   )

ج۔ ابا جی نے الحمد شریف پڑھ کر شیشی پر دم کیا۔ (   )

د۔ گائتری ماتھر صاحب کی بہن تھی۔ (   )

ر۔ ماتھر جی گرم گرم کاڑھا چمچ سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ (   )

س۔ بہو کا خیال تھا کہ دم والے پانی میں وائرس اور جراثیم ہیں۔ (   )

۶۔ الطاف فاطمہ

الطاف فاطمہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا تعلق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نامور ہیرو اور مجاہد مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے گھرانے سے ہے۔ الطاف فاطمہ کے والدِ ماجد کا نام فضل امین تھا، جو علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد الطاف فاطمہ لاہور آ گئیں۔ اُس وقت وہ ایف اے کی طالبہ تھیں۔ لاہور میں انھوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایف اے اور پھر بی اے کیا۔ اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج کوپر روڈ میں پڑھانا شروع کیا اور ۱۹۸۸ء میں اسی کالج سے ریٹائر ہوئیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ اپوا کالج میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔

الطاف فاطمہ کے چار ناول شائع ہو چکے ہیں: 'نشانِ منزل'، 'دستک نہ دو'، 'چلتا مسافر' اور 'خواب گر'۔ اُن کے تین افسانوی مجموعے: 'وہ جسے چاہا گیا'، 'جب دیواریں گریہ کرتی ہیں' اور 'تارِ عنکبوت' شائع ہو چکے ہیں۔ الطاف فاطمہ زندگی کی کہانیاں لکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں گھڑی ہوئی دکھائی نہیں دیتیں۔ ان کے کردار ہمیں اپنے معاشرے میں چاروں اور چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ خود غرضی، ناانصافی، بے زاری اور سیاسی اور سماجی حالات کے سامنے بے بسی کی تصویر بنے انسان الطاف فاطمہ کے خاص موضوعات ہیں۔ کہیں کہیں الطاف فاطمہ کے افسانوں میں درد اور خلوص کی فضا شروع سے آخر تک چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ الطاف فاطمہ کا اسلوب دراصل کرداروں کی بول چال، اُن کے سماجی وثقافتی منظرنامے اور کرداروں کی نشست و برخاست سے متعین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الطاف فاطمہ کا ہر افسانہ اپنے اسلوب کی اِس صفت کے باعث اپنی مثال آپ ہے۔

۶.۱ کنڈیکٹر [متن]:

اب تو یہ سننے میں آتا ہے کہ اُس نے کراچی میں کوئی اچھی بزنس جما لی اور ایک اچھا معقول بنگلہ بنا لیا ہے۔
ایک مرتبہ بہت عرصہ پہلے یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ایک اسکول ٹیچر سے شادی کر لی ہے، جس پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اچھا، کوئی ایسی بھی حوصلے والی ہو سکتی ہے، جس نے نہ صرف ایک اندر میٹرک کی شریکِ حیات بننا قبول کیا، بلکہ ایک عرصے تک اُس کی زندگی کی چھکڑا گاڑی کا ایک مضبوط پہیا بن کر بڑی ہمواری سے چلنے میں مدد دیتی

رہی اور یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ چلو اب تو وہ بھی چین سے بیٹھی ہوگی۔

دراصل لالو کا کیا، کسی کا بھی حال ایسا خطِ مستقیم نہیں کہ جس پر سفر کر کے کوئی ناک کی سیدھ میں سفر کرتا جائے۔ زندگی تو ایک دلچسپ بھول بھلیاں ہے، جس میں بے شمار دائرے، بند راستے اور کئی اُلجھے ہوئے خطوط آتے ہیں اور اپنی راہ کی تلاش میں کوئی ان الجھے ہوئے خطوط کو کیوں کر سلجھاتا ہے اور اپنی راہ کا کھوج لگاتا ہے، یہ ہر شخص کا اپنا مسئلہ ہے۔

لالو کا مسئلہ بھی ایسا ہی تھا وہ اپنے گھرانے کا دوسرا بیٹا تھا اور اگر آپ تصور میں سید اور مغل خون کی آمیزش کی ایک تصویر بنا سکتے ہیں، تو بنا لیجیے، ورنہ میں تو یہ کام کرنے سے رہی کہ اُس کی اُس وقت اور آج کی تصویر میں بہت فرق پڑ گیا ہے۔ اُس وقت، یعنی جب وہ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُس کی تعلیمی رفتار سست اور مایوس کن تھی؛ اُس کے خدوخال پر حماقت کی چھاپ کسی دوسری کیفیت سے زیادہ نمایاں تھی اور اس پر تتلاہٹ۔ وہ بھی ایسی کہ کاف کو ٹاف اور گاف کو ڈاف کہتا۔ اُس نے اپنی پوری کنگ ریڈر اسی انداز میں رٹ رکھی تھی اور ہمارے مشترک ٹیوٹر، یعنی ماسٹر صاحب کا کہنا تھا کہ خبیث کو ایک لفظ نہیں آتا اور یہ اس نے صرف رٹ لیا ہے کہ وقتِ ضرورت کام آ سکے۔

لالو کا خاندان ہمارے چھوٹے سے گھر میں مقیم تھا۔ اُس کا دروازہ ہمارے صحن میں کُھلتا تھا۔ وہ اور اُس کا بھائی دونوں ہمارے ہی کمرے میں ساتھ بیٹھ کر ماسٹر صاحب سے پڑھتے، جو لالو سے حد درجہ مایوس تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ تم خاک پڑھو گے، تمھاری ڈوڈبھی ٹھالی رہے، تو تم پڑھو اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُس کے کولھے پر سدا ایک نہ ایک چھوٹا بچہ لدا رہتا کہ اُس کی والدہ نے اُس کا یہی مقدر تجویز کیا تھا۔

ماسٹر صاحب اُس کے بیری نہ تھے؛ بہی خواہ تھے، جبھی تو اُس کے کان نوچتے؛ ہاتھوں پر سنٹیاں مارتے اور صلواتیں سناتے: ارے! تم کیا پڑھو گے؟ گھاس کھودو گے۔ تم تو بہن بھائیوں کی چاکری کرو گے؛ بیرا بنو گے؟

اور اس پر اس نے کبھی کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ سَر جھکائے نیچی نظریں کیے یوں بیٹھا رہتا، گویا ماسٹر صاحب کی پیش گوئیوں سے اُسے سولہ آنے اتفاق ہو۔

البتہ جب یہی الفاظ اس کی ماں کی زبان سے نکلتے، تو وہ طنزیہ مسکراتا؛ کنکھیوں سے دیکھتا؛ چہرے پر کرب و بے بسی سے زیادہ ایک پُراسرار سی تمتماہٹ، جیسے اُس کا خون جوش مار رہا ہو اور اس کے اندر کوئی اسرار پَل رہا ہو۔ چھوٹے بھائی بہنوں کی نگہداشت کرتے کرتے اُس کا دل پڑھائی سے واقعی اُچاٹ تھا۔ بادی النظر میں

وہ نکھٹواور پڑھائی سے دل چرانے والا تھا۔

اور ہم لوگ اتنے کمینے تھے کہ اپنی برتری جتانے کے لیے اُس کا مذاق اڑاتے۔

مگر وہ .... وہ صرف ہمیں گھور کر دیکھتا اور کچھ نہ کہتا۔ ہمیں کیا معلوم تھا، وہ اپنے اندر ایک بہت بڑے راز کی تلاش اور جستجو میں ہے اور ایک زبردست اسرارنما حقیقت کے حوالے سے خود اپنا سراغ لگا رہا ہے۔

کبھی کبھی مَیں اپنی فوقیت کے احساس کی ترنگ میں آکر اپنی عمر کی بڑائی کے ساتھ ساتھ جماعتوں کی برتری جتاتی اور اُس کو سمجھانے کی کوشش کرتی: ''دیکھو لالو! تم بھی محنت سے پڑھ لیا کرو۔ ماسٹر صاحب تمھارے بھلے کو کہتے ہیں۔...........''

وہ بات کاٹ دیتا: ''محنت سے آپ لوگ پڑھو، ہمارا کیا ہے، ہم تو بڈھے ٹوٹے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مَیں اپنی عمر کے لحاظ سے بہت پیچھے ہوں۔'' پھر وہ اُلٹا ہمارا مذاق اُڑانا شروع کر دیتا:

ٹھیلو ڈے ٹو ڈوڈے تو ہنوڈے نواب

پڑھو ڈے لٹھو ڈے تو ہوڈے ٹھراب

اور ان خراب ہونے والوں میں اُس کے دو سال بڑے بھائی کی ذات بھی شامل ہوتی، جو آٹھویں جماعت میں ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔

مَیں اُس کی بات خاک جھٹلاتی، اس لیے کہ واقعی خراب تو ہم ہو رہے تھے کہ گرما کے طویل دن، برساتوں اور پھر سرما کے مختصر دنوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر آنے والا نیا دن وقت کی دہلیز پر گرز مار کر کہتا: ''امتحان! امتحان! امتحان!''

ہم سکڑتے اور سمٹتے جاتے تھے۔

پچھواڑے شاہ گنج کی گلی میں دھوبی ٹھیلیا اور چمٹا بجا کر کبیر اور تُلسی کے دوہے گاتے، تو ہم کان لگا کر نہ سُن سکتے کہ ہمارے سامنے ایشیا اور وسیع چراگاہوں کے نقشے پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر پانی پت اور دکن کے میدانوں میں رن پڑے ہوا کرتے اور ہم ایسٹ انڈیا کمپنی، لارڈ کلائیو اور کارنو اس کے ہم قدم تاریخ کی شاہراہ پر چہل قدمی کر رہے ہوتے۔ زندگی میں کون سا موسم ایسا نہیں آتا کہ جب فضا میں جلترنگ نہ بج رہے ہوں؛ فاختائیں نہ کوکتی ہوں؛ الغوزوں اور بانسری کی تانیں نہ لہراتی ہوں، مگر امتحان۔ امتحان تو ہمیں اعشاری کسور، سُودی نظام اور A+B کے چکر سے نکلنے ہی نہ دیتے۔

وقت اور زمانے سے ہمارے رابطے ٹوٹ رہے تھے، البتہ لالو۔ لالو کی بات اور تھی۔ گود کا بچہ سو رہا تھا، تو خود اُس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد نہ رہتا۔ بڑی الکسی سے انگلیاں چٹخاتا اور دانت بھینچ کر گنگنایا کرتا:

زندگی ہے پیار سے، پیار میں بتائے جا

وہ واقعی زندگی اور دھرتی کے رنگوں سے پیار کرتا؛ نیلے آسمان اور قوسِ قزح سے رابطہ قائم رکھتا؛ اُسے پتا ہوتا کہ آسمان پر کالی ٹانگوں اور سفید پروں والے بگلوں کی قطار میں آج کتنے بگلے تھے؛ آنگن میں کتنی لم ڈوریں اور گول گول آنکھوں والی ڈومن چڑیاں اُتریں۔

اکتاہٹ بڑھتی، تو وہ پتنگیں لوٹنے نکل جاتا یا پھر ڈربے میں سے پٹھور نے کھینچ کھینچ کے سب سے قوی اور جید مرغ سے لڑانے لگتا۔

ہم اس کو اپنی کنکھیوں میں رکھتے۔

جب ہی تو ہم نے اس کے اندر ایک واضح فرق محسوس کیا........ گردن اٹھا کر چلتا؛ وقار سے اپنی بات منواتا اور جب بڑے لوگ واقعاتِ عالم پر بات کرتے، تو بڑے اعتماد سے اپنے ٹاف ڈاف والے لہجے میں لقمے دیتا۔

اب مَیں سوچتی ہوں اُس نے اپنی منزل کا سراغ پالیا تھا۔ کسی بڑے اسرار کے حوالے سے جب ہی تو اکثر وہ کسی گہری سوچ میں بیٹھا، اُنگلیاں چٹخایا کرتا یا پھر کسی درخت کے سائے تلے چارپائی پر لیٹا نیم وا آنکھوں سے نیلے آسمان کو تکتا رہتا۔

ہم سمجھتے تھے کہ یہ بیکاری سے اُکتا رہا ہے۔

کسے خبر تھی کہ وہ انتظار کر رہا ہے۔

چند ہفتوں سے وہ بیٹھے بیٹھے غائب ہو جاتا اور پھر گھنٹوں واپس نہ آتا۔

اُس کی والدہ بیٹھی اُس کو کوستی کاٹتی رہتی اور اس پُر اسراریت کا کھوج لگا۔ نہ کی فکر میں رہتی۔

سرما کے کچھ اور دن چپکے سے سرک لیے تھے اور اب فضا میں عجیب سی آوازیں کانوں سے ٹکرانے لگیں:
نعرہ تکبیر اللہ اکبر؛ پاکستان زندہ باد؛ لے کے رہیں گے پاکستان؛ قائداعظم محمد علی جناح زندہ باد، پھر کوئی منچلا سریلی آواز میں لہکتا:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح

یہ صدائیں سُن سُن کر ہماری والدہ آبدیدہ ہو جاتیں۔ کبھی کبھی دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتیں اور کبھی آسمان

کو دیکھنے لگتیں۔ بالک لالو کی طرح مجھے یہ بھی یاد ہے کہ نعرے سُن کر بہت سے لوگ آبدیدہ ہوئے اور کچھ لوگ ہنس دیتے۔

یہ صدائیں ہمارے لیے نئی تھیں، اس لیے کہ ہمارے علاقوں میں ارتھیوں، جنازوں اور باراتوں کے جلوسوں کے سوا کسی دوسرے جلوس کا رواج نہ تھا۔ ہمارے باورچی خانے کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ کوئی جلوس گزرتا ،تو ہم سب بیک وقت کھڑکی میں گھس کر بیٹھ جاتے اور نظارہ کرتے۔

ان نعروں اور جلوسوں میں عجیب طرح کی کشش تھی کہ ہم امتحان کی ہیبت کے باوجود کتابیں کاپیاں چھوڑ چھاڑ کھڑکی کی طرف لپک لیتے۔

جب ہی ہم چاند تارے والے پرچم سے آشنا ہوئے، جب ہی پاکستان کا نام سُنا۔

''ارے، عجیب بات ہے! پاکستان ہے کہاں جو زندہ باد ہو؟''

لالو کا چہرہ ایک دَم سُرخ ہوگیا۔

''ہے ٹیوں نہیں، بالعل ہے۔ یہاں ہے، یہاں!'' اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''تم، لالو! تمھارے اندر..........'' ہم نے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں..........'' اُس نے کہا۔ کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور جلوس میں شریک ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اُسے ہم سب پر برتری حاصل ہو چکی تھی۔ وہ بہت کچھ جانتا اور سمجھتا تھا۔

اور ہم! ہم تو بقول اُس کے: ''ٹھراب'' ہو رہے تھے۔

"A" is Equal to "X" کے پھیر سے نکلے، تو پلاسی اور سرنگا پٹم کے میدان میں اپنی شکست کے اسباب ڈھونڈنے جا کھڑے ہوئے۔ اب ایسے میں ہمیں کیا پتا چلتا کہ شملہ کانفرنس ہو کس شہر میں رہی ہے؟ لارڈ ویول اچانک کب اور کیوں رخصت ہوا اور برطانوی راج کا انیسواں خوبرو وائسرائے لوئی ماؤنٹ بیٹن کس مقصد اور غرض سے تشریف لایا؟

کون سا وقت آ رہا ہے، کون سا لمحہ جا رہا ہے؟

آدھی رات کو گجر چوکیدار کی: 'جاگتے رہو، خبردار'؛ مسجدوں کی اذان کا سحر؛ مندروں کی گھنٹیوں کی باج ہنسیں تو ایک بہت چھوٹے سے امتحان کی خبر دیتی۔

ایک رات اور بیتی؛ ایک سحر اور طلوع ہوئی، امتحان ایک دن اور قریب ہوا۔

مگر لالو.......... اُس کے تو دل کی ہر دھڑکن اُس کو ایک بڑے امتحان؛ ایک بڑی آزمائش کی خبر دیتی تھی، جب ہی تو ہمارے چہروں پر وحشت کی پھٹکار تھی اور اُس کے چہرے پر طمانیت کا وہ نور کہ نُورِ سحر کو شرما دے۔

وہ اب اکثر اسکول نہ جاتا، رستے ہی میں غائب ہو جاتا۔ اُس کا بھائی کہتا: ''اماں سے نہ کہنا۔ یہ اب مسلم لیگ کے دفتر پہنچ جاتا ہے۔ ماریں گی اُسے۔''

تو گویا رفتہ رفتہ وہ بھی سازش میں شریک ہو رہے تھے۔ مجھے وہ دن کبھی نہ بھولے گا، جب لالو اور اُس کا بھائی صبح نکلے اور دوسری صبح تک نہ پہنچے۔

تمام رات اُن کی ماں روتی رہیں۔

''ارے! میرے دونوں مٹ گئے، اب تو لاشیں ہی آئیں گی۔'' تمام رات ہماری والدہ انھیں تسلیاں دیتی رہیں؛ چہرہ اُن کا بھی فق تھا، ہمیں بھی یہ رنج کھائے جاتا تھا، کاہے کو اُسے چھیڑتے تھے۔

دن چڑھا، تو ماسٹر صاحب پڑھانے آئے۔ ہم نے ہونق صورتوں کے ساتھ لالو اور اس کے بھائی کی گمشدگی کی خبر سنائی اور وہ الٹے قدموں لوٹ گئے۔ چار بجے ماسٹر صاحب اس شان سے نمودار ہوئے کہ ایک ہاتھ میں ایک کی، دوسرا ہاتھ دوسرے کی گردن پر۔

''یہ لیجیے! یہ آپ کے صاحبزادگان لیڈری فرما رہے تھے اور پاکستان بنا رہے تھے۔''

''اے ماسٹر صاحب! آپ ہی نے تو ان کے سروں میں یہ خناس بھر دیا ہے، خود ہی تو پٹیاں پڑھائی ہیں۔ ارے! اب یہ گئے دونوں امتحان سے۔'' وہ الٹا ماسٹر صاحب کے سر ہو گئیں۔

ماسٹر بوکھلا کر بولے: ''ارے! اب یہ تھوڑی کہا تھا کہ عین امتحان کے نزدیک تم جلوس میں لگ جاؤ۔ اب جو دیکھتے ہیں، کیا نظر آیا کہ لیاقت علی خان کا جلوس رواں ہے اور یہ مغلیہ شہزادے ہاتھیوں پر سوار گلے میں ہار؛ نعرے پر نعرہ لگا رہے تھے۔''

اور اب ان کی والدہ اور جوش میں آ گئیں۔

''ماسٹر صاحب! آپ کو خدا کی قسم! انھیں اتنا ماریے کہ ان کی ساری لیڈری ناک سے نکل جائے؛ ان کی جان نکل جائے۔''

لالو نے ایک باغیانہ نظر ڈالی: ''لیڈری نکل جائے، جان نکل جائے، پاکستان نہیں نکل سکتا۔''

اور یہ ایک بڑی اہم تبدیلی تھی۔ لالو پاکستان کے بجائے پاکستان کہہ رہا تھا۔

مجھے کبھی نہ بھولے گا، ماسٹر صاحب نے دونوں کو لٹا لٹا کر مارا اور ہم سب کو حکم دیا: ''چلو کم بختو! اپنی کتابیں نکالو۔''

جتنی دیر انھوں نے پڑھایا، لالو کے کان مسوس مسوس کر ہم سب کو لیکچر دیتے رہے۔

''ارے! تو کیا تم جاہلوں کے لیے بنے گا پاکستان؟ تم پاکستان کے قابل ہو۔''

وہ چلے گئے، تو میں نے لالو کو قائل کرنا چاہا۔

''ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔''

پھر اُس نے لکھنا شروع کیا، پاڈل ہو، تو بھی ان ہی ٹی ٹرح۔ اب امتحانوں ٹاوٹٹ نہیں۔

ماریں گے مرجائیں گے، پاکستان بنائیں گے۔''

غرض اب وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ دیوانہ وار کہہ سُن کر مسلم لیگ کے دفتر جاتا، شہر کی دیواروں پر پوسٹر چپکاتا۔ اب تو اس کے گیتوں کے بول بھی بدل گئے تھے۔ لہک کر کہتا:

ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

جب اُس کی والدہ نے اُس کو تنبیہ کرنے کی فرمائش اس کے والد سے کی، تو وہ ہنس کر بولے: ''اب ہم کس کس کو روکیں گے؟ یہ تو وقت کی آواز ہے؛ زبانِ خلق ہے۔ ارے! تم تو اندر گھر میں بیٹھی ہو، ہم سے پوچھو، ملازمت کی وجہ سے اپنے آپ کو کس کس طرح روکتے ہیں۔''

لالو اب بھی تتلاتا تھا، لیکن پاکستان اور قائداعظم دو لفظ ایسے تھے، جن کا صحیح تلفظ بڑی مشقت سے کرتا تھا۔ یہی اُس کا نذرانۂ عقیدت تھا۔

امتحان بھی ختم ہو لیے، تو بدلتی رُتوں کا پھر سے احساس ہوا۔ ساری فضا اور ماحول میں ایک عجیب سی کیفیت بڑھ رہی تھی، جیسے ماحول کو بھی لالو کی طرح کسی بات کا انتظار ہو۔

پھر وہ رات گزری؛ مرغِ سحر بولا؛ مسجد کے مناروں سے جانی پہچانی صدا ایک نئے لحن سے گونجی: ''اللہ اکبر!''

یہی وہ صبح تھی، جب ہم نے وہ نئی خبر سُنی۔

بھئی، مبارک! ہر شخص لولا کو مبارک باد دے رہا تھا اور وہ سچے فاتح کی طرح سر اٹھائے نہیں؛ سر جھکائے کھڑا تھا۔ سب حیران تھے؛ سب چہک رہے تھے؛ سب اکسائیٹڈ تھے، بجز لالو کے جو پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ دن آئے گا۔

چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی اس صبح مجھے نئی تاریخ سے بالکل ہیبت نہ آئی کہ لولو اور مواد بڑھ گیا رٹے لگانے کو۔
مجھے تو عجیب سا احساس ہو رہا تھا، جیسے بہت اُوپر سے کوئی گاتی گنگناتی آبشار آ رہی ہو کہ اچانک ہی سمندر نے اپنا رخ بدلا اور آبشار کے نیچے سے موجیں مارتا؛ شور مچاتا آگے بڑھنے لگا ہو۔
ہم پاکستان ۱۹۴۷ء میں آئے۔
لالو کی کوئی خبر نہ ملی۔
البتہ ہر اگست کی چودہ تاریخ کو اس کا خیال ضرور آتا۔
''لے کے رہیں گے پاکستان
بن کے رہے گا پاکستان''
پھر ایک شادی میں کراچی جانا ہوا، تو ڈھول ڈھمکوں کے درمیان ہم شادیا کے گانوں میں مصر
کسی بچے نے آ کر کہا: ''آپ کو کچھ لوگ باہر بلا رہے ہیں۔''
''کون لوگ ہیں؟''
میں حیران ہوتی شامیانے میں آئی۔ ایک صف میں بچھی کرسیوں پر نوجوان لڑکوں کی قطار کی قطار بجی تھی۔
ہم سبق، ہم جولی، کرکٹ اور ہاکیوں کے ساتھی۔ سب ہی 'ہمیں پہچانا، ہمیں پہچانا' کہہ کر کھڑے ہو گئے۔
''ارے بھائی! ہر چیز اتنی بدل گئی، کس کس کو پہچانیں''۔ میں ہنس پڑی۔ اُن میں لالو بھی تھا۔
''مجھے بھی پہچانا؟''
میں نے پہچاننے کی کوشش کی۔
''وہ لیاقت علی خان کے جلوس؛ ماسٹر صاحب سے پٹائی، کچھ یاد نہیں؟''
''ارے لالو! تم! تم۔'' پھر میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا:
''آج کل تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟''
''میں بس کا کنڈیکٹر ہوں۔''
''مذاق کرتے ہو۔''
''بالکل نہیں۔ بھائی! اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ یہ ہمارا پاکستان ہے نا، یہ ایک بڑی سی بس تو ہے۔ ہم سب جو کچھ بھی کریں، اس کے کنڈیکٹر ہی تو ہیں۔ بس یہی خیال رکھنا ہے کہ گاڑی چلتی رہے۔''
''بڑی زبردست بات کہہ دی تم نے۔ ارے! اُس وقت بھی ہمارے حلقے کی ایک تم ہی نمائندگی کر رہے

تھے۔ہم سب تو خراب ہو رہے تھے"۔

بڑی دیر تک ہم قہقہے لگا لگا کر ماضی کی باتیں کرتے رہے۔ کراچی جانا ہی نہیں ہوتا۔ کئی کئی سال بس خبریں ملتی ہیں۔ لالو کی ایک خبر ملی کہ پہلے نائٹ اسکول؛ پھر کالج جوائن کر لیا ہے؛ ایک ٹیچر سے بیاہ رچا لیا ہے۔

اور اب یہ خبر ملی ہے کہ گھر بنا لیا ہے۔

تو میں سوچ رہی ہوں کہ اُس کا گھر تو کب کا بن گیا تھا؟ چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو کہ وہ ایک بلندی پر کھڑا تھا۔ ایک گاتی گنگناتی آبشار تھی کہ نیچے کو آئی تھی اور مواج سمندر تھا کہ اس کے قدموں میں پہنچا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے تاریخ ساز قدموں میں اور اب؟ اب تو ہم سب ایک بڑی سے بس میں سفر کر رہے ہیں، جس کے ہر دروازے پر اُس کا ہم شکل کنڈیکٹر مستعدی سے کھڑا ہے۔

سمندر، آبشار اور چلتی بس کی آوازوں کے درمیان کتنا سکون ہے اور کتنی کشش! [تارِ عنکبوت]

۶.۲ مرکزی خیال:

وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے، جب تک یہ محبت کسی قوم کے افراد میں قائم رہتی ہے، وہ قوم ترقی اور خوشحالی کی منزلیں طے کرتی رہتی ہے اور اگر وطن کی محبت لوگوں کے دلوں سے اُٹھ جائے، تو وطن کے ساتھ ساتھ قوم بھی شکست اور زوال سے دوچار ہو جاتی ہے۔ الطاف فاطمہ کا کردار 'لالو' ایک محبِ وطن شخص کی علامت ہے کہ جو اپنی حیثیت اور مقام پر قومی زندگی کے مقام و مرتبے کو ترجیح دیتا ہے۔

۶.۳ خلاصہ:

الطاف فاطمہ کا خیال ہے کہ وطن کی محبت کا تعلق براہِ راست دل کے ساتھ ہوتا ہے، انسان کے معاشرتی رتبے، دولت اور اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے ساتھ نہیں ۔ لالو ایک ایسا لڑکا تھا کہ جو شروع ہی سے تعلیم میں کمزور اور صورت سے احمق دکھائی دینے کے علاوہ بولنے میں تتلاہٹ بھی رکھتا تھا، جو کاف کو ٹاف اور گاف کو ڈاف کہتا تھا۔ امتحان سر پر آتے، تو اس کے بہن بھائی خوب جی جان سے پڑھنے میں مصروف ہوتے اور لالو بے فکری کے ساتھ پتنگیں لوٹتا یا مرغ لڑا رہا ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک پڑھنا لکھنا بیکار تھا، لیکن جب دھیرے دھیرے تحریکِ پاکستان نے گلیوں اور محلّوں میں بھی سر اٹھانا شروع کر دیا، تو لالو کے ننھے دل میں بھی وطن کی آرزو نے گھر کر لیا۔ اب وہ

سکول جانے کی بجائے مسلم لیگ کے جلسوں اور جلوسوں میں بھی شریک ہونے لگا۔ ماسٹر صاحب کے نزدیک: امتحان اہم تھا، لیکن لالو کے لیے اب پاکستان اہم تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی کہ جس نے اُسے اُس کے دوستوں اور بہن بھائیوں میں ممتاز کر دیا تھا۔ پاکستان اور قائداعظم سے محبت کی جو شمع اس کے دل میں فروزاں تھی، اس کی روشنی کا عشرِ عشیر بھی ہم جولیوں کو میسر نہ تھا۔ لالو کو اپنی فتح کا جو یقین تھا، اس کے ہم عصر اس یقین اور اعتماد سے محروم تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء اس کے دوستوں کے لیے رٹا لگانے کی ایک نئی تاریخ تھی، جبکہ لالو کے لیے یہ آزادی کی صبح تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد پتا چلا کہ وہ کسی بس میں کنڈیکٹر لگا ہوا ہے۔ وہ پاکستان کو ایک بہت بڑی بس قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم جو کچھ بھی کریں، ہم سب اس بس کے کنڈیکٹر ہیں اور ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ بس ہمیشہ چلتی رہے۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نے کالج میں تعلیم بھی حاصل کی اور ایک ٹیچر سے بیاہ کر کے گھر بھی بنا لیا۔ لالو کی ترقی کا سفر جاری رہتا ہے۔

خود آزمائی:

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔

(i) الطاف فاطمہ کا افسانہ 'کنڈیکٹر' ان کے کس افسانوی مجموعے سے لیا گیا ہے؟

(ii) افسانہ نگار نے لالو کی شخصیت کو کیسے نمایاں کیا ہے؟

(iii) لالو اپنے بہن بھائیوں اور دوستوں سے مختلف کیوں تھا؟

(iv) لالو کا مذاق کیوں اڑایا جاتا تھا؟

(v) 'پاکستان کہاں'؟ اس سوال کا جواب لالو نے کیا دیا؟

(vi) جلسے جلوسوں میں لالو کی شرکت پر ماسٹر صاحب لالو سے کیوں ناراض تھے؟

(vii) قیامِ پاکستان کے بعد لالو نے پاکستان کو کیا قرار دیا؟

(viii) آزادی کی صبح لالو کے دوستوں کے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی؟

۲۔ حُبِّ وطن کے موضوع پر دو صفحات پر مشتمل ایک مضمون تحریر کریں۔

۳۔ لالو کے کردار پر ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں۔

آمیزش ۔مقیم۔ پراسرار۔ترنگ ۔چہل قدمی ۔قوسِ قزح

۵۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لغت سے دیکھ کر لکھیں۔

خبیث ۔ چاکری ۔فوقیت ۔رن ۔الغوزہ۔الکسی ۔کنکھیوں۔

٦۔ درج ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

زبانِ خلق ۔نذرانۂ عقیدت ۔نورِ سحر، خطِ مستقیم ،ردِّ عمل

یونٹ نمبر......۴

شخصیت نگاری

تحریر: شیراز بن عطا

فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

فہرستِ مضامین

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

اس یونٹ میں آپ تین منفرد اور ممتاز خاکہ نگاروں کے تحریر کردہ خاکوں کا مطالعہ کریں گے۔ خاکہ نگاری اردو کی ایک اہم صنفِ ادب ہے۔ خاکہ نگار پیشِ نظر شخصیت کے محاسن اور معائب کو اس طرح اپنے خاکے کا موضوع بناتا ہے کہ وہ شخصیت اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ انھوں نے مولوی وحید الدین سلیم کی شخصیت کو اپنے خاکے کا موضوع بنایا۔ اس خاکے کے مطالعے سے مولانا کے شخصی رویے زندگی کی آب وتاب کے ساتھ جلوہ نما ہوئے ہیں۔ اسی طرح چراغ حسن حسرت نے علامہ اقبال کے شخصی اوصاف کو بیان کیا ہے۔ علامہ اپنی شاعری کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اپنی شخصی محبوبیت کی وجہ سے بھی مرجع خلائق رہے۔ ان کا گھر کیا تھا؟ ایک آستانِ محبت تھا کہ اہلِ لاہور کے ساتھ ساتھ لاہور وارد ہونے والے لوگ بھی اس آستانے پر حاضری کو لازمی گردانتے تھے۔ فارغ بخاری نے معروف افسانہ نگار کرشن چندر کا خاکہ لکھا۔ یہ خاکہ کرشن چندر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے بنیادی کی حیثیت رکھتا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، چراغ حسن حسرت اور فارغ بخاری کے احوال وآثار سے روشناس ہوسکیں۔

۲۔ شاملِ نصاب شخصیتوں کے شخصی اور ذاتی رویوں سے آگاہ ہوسکیں۔

۳۔ یہ جان سکیں کہ خاکہ نگار کس طرح اپنی پیشِ نظر شخصیت کے باطن میں میں اُتر کر اس کے معنوی اور جمالیاتی حسن کی رعنائی کا پیکر تراشتا ہے۔

۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ

فرحت اللہ بیگ ۱۵ اگست ۱۸۸۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا حشمت علی بیگ تھا۔ اُن کی والدہ اس وقت فوت ہوگئیں، جب وہ ابھی بچے تھے۔ ان کی پرورش اُن کی پھوپھی نے کی۔ وہ بچپن ہی سے ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ انھوں نے قرآنِ پاک اور چند فارسی کی کتابیں گھر پر حافظ قاسم رضا صاحب سے پڑھیں، پھر اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول محلہ کشمیری دروازہ دہلی سے اوّل پوزیشن کے ساتھ پاس کیا اور نقرئی تمغا حاصل کیا۔ انٹرمیڈیٹ ہندو کالج کناری بازار سے کیا اور پھر سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس کالج میں پہلے انھوں نے ریاضی اور سائنس پڑھنا شروع کی، مگر بعد میں اپنے دوست غلام یزدانی کے اصرار پر سائنس چھوڑ کر عربی پڑھنے لگے۔ عربی میں انھیں ڈاکٹر نذیر احمد کی شاگردی نصیب ہوئی اور اس شاگردی کی بنیاد پر انھوں نے 'نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی' کی تخلیق کی، جو اردو ادب کے بہترین خاکوں میں سے ایک ہے۔

انھوں نے ۱۹۰۵ء میں بی اے پاس کیا اور مالی مسائل کے باوجود ایم اے میں داخلہ لے لیا، تاہم زیادہ توجہ نہ دے سکنے کی وجہ سے کچھ مضامین میں ناکام رہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیلوں سے بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ کبڈی، فٹ بال، ٹینس اور کرکٹ کے میچوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ کالج کے زمانے میں وہ کرکٹ ٹیم کے کپتان اور بہترین باؤلر تھے۔

فرحت اللہ بیگ کی گفت گو میں بھی خاصی شوخی اور ذہانت پائی جاتی تھی۔ کالج کے دنوں میں تقریری مقابلوں اور ڈراموں میں، اکثر حصّہ لیتے تھے۔ وہ مہم جُو طبیعت کے مالک تھے۔

۱۹۱۰ء میں انھوں نے جوڈیشل امتحان پاس کیا اور حیدر آباد دکن کے عدالتی نظام سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں ہائی کورٹ کے رجسٹرار ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں ہائی کورٹ میں ہی انسپکٹنگ افسر بن گئے۔ ۱۸ مئی ۱۹۴۲ء میں ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ وہ ایک قابل اور فرض شناس افسر تھے۔

۲۶ اور ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات نیند کی حالت میں انتقال کر گئے اور حیدر آباد میں سپردِ خاک ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھنے لکھانے کا کام زمانۂ طالب علمی سے شروع کیا اور عمر کے آخری حصّے تک تصنیف و تالیف کا کام نہیں چھوڑا۔ انھوں نے خاکے، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین، سنجیدہ ادبی اور معاشرتی مضامین، تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور ڈرامے وغیرہ لکھے۔ اُن کی مشہور تصانیف میں: مضامینِ فرحت اللہ بیگ (سات جلدوں میں)، دیوانِ

یقین، میری شاعری، نظیر اکبر آبادی، چار کہانیاں اور میری داستان (خودنوشت) ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی گفت گو کی شوخی اُن کی تحریر میں بھی بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اُن کی نثری تصانیف میں رومانویت، احیائے مذہب، یادِ ماضی، اخلاقیات، طنز و مزاح اور تہذیب و تمدن سے وابستگی جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اُن کی شاہکار تحریروں دہلی کا یادگار مشاعرہ، پھول والوں کی سیر اور نذیر احمد کی کہانی وغیرہ میں رومانویت کا عنصر غالب ہے۔ [illegible] تصویر کشی کی روایت نمایاں ہے۔

فرحت اللہ [illegible] اقدار [illegible] اور یوں احیائے مذہب کے ذریعے مسلمانوں کی زندگی میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں دہلی کے شب و روز نہیں بھولتے، لہٰذا وہ اپنی تحریروں میں وہاں کے حوالے بار بار لے آتے ہیں۔ دہلوی تہذیب و تمدن کے تمام رنگ اُن کی تصانیف میں جا بہ جا نہایت خوب صورتی کے ساتھ بکھرے پڑے ہیں۔ اُن کا ماضی اُن کی تحریر کی موضوعاتی تقسیم میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ فرحت اللہ بیگ کی تحریر شگفتہ، چلبلی اور مزاح سے یوں عبارت ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مقام آئے، جب قاری بوریت کا شکار ہو۔ ان کی تحریریں زندگی سے یوں بھرپور ہیں کہ اکثر اوقات قاری خود کو مضمون کے ماحول اور تصویر کا حصہ محسوس کرتا ہے۔

1.1 ایک وصیت کی تعمیل [متن]:

1.1 ایک وصیّت کی تعمیل

میں مدت سے حیدر آباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی، مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل ابھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ٹرین کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر

کھڑے گپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے؛ بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آ رہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پاجامہ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں، اس وقت انھوں نے فرمایا: ''میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں، مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا۔ مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے، ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا، جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا''۔

میں پریشان تھا کہ یا اللہ! یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر میری زبان کب رُکتی ہے؟ میں نے کہا: ''مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے؛ مر جائیے، مضمون میں لکھ دوں گا''۔

کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں، تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی؛ میں نے معذرت کی۔ وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا، بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کا سامان لا، میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی اور اُدھر ان کی زبان چلی۔ رات [illegible] صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجۂ اوّل میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سو گئے، ہم دونوں نے باتوں میں صبح کر دی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے؛ اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا؛ اصطلاحاتِ زبانِ اردو پر بحث ہوتی رہی؛ شعر و شاعری ہوئی؛ دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں؛ اپنی تعریفیں ہوئیں؛ مولوی عبدالحق کو بُرا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹا بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کر دی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے؛ پھبتیاں اڑیں؛ اس کو بے وقوف بنایا، اس کی [illegible] اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑا رہا۔

میں شاعر نہیں ہوں۔ ہاں! بعض دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا، جب مولوی صاحب نے کہا: ''فرحت! تو شاعر ہے، کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے، ہو سکے تو کچھ کہہ لیا کر''۔ میرے ایک قطعۂ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اسی وقت اٹھ؛ قلم دوات نکال، وہ قطعہ لکھ لیا۔ آپ بھی سُن لیجیے: کہتے ہیں نئی طرز کی تاریخ ہے۔ ہو گی، ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی اور نہ اس کی کوئی قدر ہے۔ ہاں! قطعے سے پہلے اس کی شانِ نزول سُن لیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے۔ پیسا پاس نہیں تھا، مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھریں اور وہ بھی اس طرح نہیں، جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں، بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے۔ اِدھر کوشش کی، اُدھر کوشش کی، آخر سرکار سے منظوری ہو ہی گئی۔ ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا؛ شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لیے؛ عراق، عرب، شام، ترکی غرض سیکڑوں ملکوں کی سیر کی۔ آئے اور بڑی دھوم دھام سے آئے۔ وہ نام پیدا کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ دوستوں نے مجھ سے تاریخ کہنے کا تقاضا کیا۔ مار مار کر شاعر بنایا، تاریخ ہوئی ہے:

پھر پھرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے
بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر
دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو
میں بھی شاعر ہوا، اللہ کی قدرت ہے مگر
میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں
اس لیے لکھتا ہوں تاریخ بہت ڈر ڈر کر
ایک طائر کو قفس میں تھا خیالِ گلشن
پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تا جھکائے ہوئے سر
رحم کچھ آ گیا صیاد کے دل میں شاید
ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے در
در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا
پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر
خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے، لیے

خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر
بچتا وہ گردشِ افلاک سے آخر کب تک
ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیر کا اثر
آب و دانہ اسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام
باندھے صیاد نے پھر طائرِ آزاد کے پر
لکھی فرحت نے ہے کس زور سے فصلی تاریخ
پھر وہی کنجِ قفس پھر دی یاد کا گھر

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے،لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جورائے ان کے متعلق قائم کی ہے، وہ سُن لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا،لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کسی کو بُرا بھی کہتے،تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی اور جب کہنے پر آتے،تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں؟ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا، جو سچے دل سے ان کو چاہتا ہو۔ ان کے علم؛ ان کی سمجھ؛ ان کی زود فہمی اور ان کی طبعِ رسا کی سب تعریف کرتے ہیں، لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔

بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا،تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے،تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا، انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا: ”ارے میاں! گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا اور دیکھو،تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی؛ اس اخبار کی ایڈیٹری کی؛ اُس رسالے کے منیجر ہوئے؛ سرسید کی خدمت میں سر گاڑی، پاؤں پہیا کیا، اب جو چند روپلی مل رہے ہیں،تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے،تو گلا ہی گھونٹ دیتے“۔

میں نے کہا: ”مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے، ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں؟ جو اللہ نے دیا ہے، بہت ہے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ مزے کیجیے؛ بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے؛ ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے“۔

وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے۔ ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی۔ نااہلوں کو آرام و آسایش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دیا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا؛ جتنی ان کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اتنی ہی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا، جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب! آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا، مگر خرچ کی پوچھو، تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اس کی صراحت، میں آگے چل کر، کروں گا۔ ہاں! ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے؟ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہرحال یونہی ہنستے بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا، اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی؛ راستے کی [illegible] کے جاگنے سے اور خراب ہو گئی؛ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا، تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔

دوسرے روز ان کا لکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی، پھر بھی بڑے میاں کو جوش آ گیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا؛ ریشمی شیروانی نکالی؛ نئی ترکی ٹوپی نکالی؛ اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک؛ نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا، اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے، مگر مولوی صاحب کے طرزِ ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ ان کے پڑھنے میں بھی وہی، بلکہ اس سے زیادہ زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا

کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا، مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے، تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست؛ زبان کی روانی؛ آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آ رہا ہے یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے۔ برس روز ہو چکا ہے، مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے، مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا، میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے یا تو لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد قابلیت تھی، جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو، اس میں ان کا مدِ مقابل نایاب نہیں، تو کمیاب ضرور ہے۔

اسی روز ایک واقعہ پیش آیا کہ اس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔'۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ' اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں، آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا، کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا: "یارو! ذرا جلدی کرو؛ دیر ہو رہی ہے، مزا کرکرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں، تمھارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا، میں اپنی اسپیچ ختم کر دوں گا"۔ اتنا کہہ میں چٹ باہر پردے کے سامنے آ گیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کر دوں۔

جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ مَیں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف 'طبقات الشعرائے ہند' سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انھی کے مکان پر نواب زین العابدین خان عارف کی مدد سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتداً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر ان کے دہلی میں آ کر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعرا اس میں جمع ہوئے۔

میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہوگیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنے پیدا کر لیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی، اب جو ہے، وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے: ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟''

مولوی صاحب کا تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹتے رہے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں، تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے: ''فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا''۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا؛ پان بنا کر دیا؛ سگریٹ پیش کیا، جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔

میں نے کہا: ''مولوی صاحب بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہوسکتی تھی۔ اوّل تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا، دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے؛ کہاں کے تھے؛ دہلی آئے بھی تھے یا نہیں؛ کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے''؟

کہنے لگے: ''تو گھڑی گھڑی، ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیوں کرتا تھا''؟ میں نے کہا: ''مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بہ خود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں، تو اس میں میرا کیا قصور ہے''؟

بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا: ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟'' یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے؛ کبھی صرف جھڑک دیتے؛ کبھی جل کر کہتے: ''جی ہاں! میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے''۔

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہوگیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے؛ تعریفیں کرتے؛ دل بڑھاتے۔ ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال، نہ بچہ، نہ نوکر، نہ ماما۔ میں گیا،

باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی: ''کون''؟

میں نے کہا: ''فرحت''۔ اسی وقت کرتا پہنے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ ود چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں؛ کنارے جھڑی رکابیاں؛ ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں؛ دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے! مولوی صاحب کے گھربار کا یہ خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے۔ چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے، نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا؟ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے ہیں۔

کبھی میں گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ: مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں۔ کہنے لگے: ''نہیں بھئی! میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے، صرف چائے پر گزران ہے''۔

تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنائی، پی لی۔ اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے، بان کی کھرّی چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔

ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو، تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے؟ کسی کے پاس بھی ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی

نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر جمع کرتے جاتے، انھی کاغذوں پر خط لکھتے؛ غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا؛ بس انھیں کاغذوں پر ہوتا، خدا معلوم ایسے جھرجھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے؟

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں! ڈرتے تھے، تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے، تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر ان ہی کے الفاظ میں لکھوں، تو ابھی فوج داری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اُتارتے کہ باید وشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا، یا واقعی اس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا، تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہ ہی نہیں، بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں؛ ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنے ہیں؟ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، انھیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا، اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا، ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو ان کے لیے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔

مولوی صاحب کیا مرے، زبان اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصّے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے، مگر عثمانیہ یونی ورسٹی کے اربابِ حل وعقد لکھ رکھیں کہ چاہے اِس سرے سے اُس سرے تک، ہندوستان چھان مارو، مولوی وحید الدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے، ان کا پاسنگ بھی مل جائے، تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔ [مضامینِ فرحت اللہ بیگ]

۱.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

چل چلاؤ:	مُرادموت، انتقال	غپیں:	گپیں، باتیں
یورش:	یلغار، حملہ، ہلّہ	شاکی:	شکوہ کرنے والا
بے نقط:	کھری کھری	اسپیچ:	تقریر
وحشت زدہ:	خوف زدہ	قفل:	تالا
اطلس:	ایک قسم کا ریشمی کپڑا	دسترس:	عبور، ملکہ
اڑواڑ لگانا:	ٹیک لگانا		

۱.۳ خلاصہ:

مصنف کہتے ہیں کہ وہ کافی عرصے سے حیدرآباد میں تھے، مگر انھیں مولوی وحیدالدین سلیم سے ملنے کا اتفاق اُن کی زندگی کے آخری دنوں میں ہوا۔ اُن سے پہلی ملاقات حیدرآباد کے اسٹیشن پر اُس وقت ہوئی، جب وہ اور مصنف مولوی عبدالحق کی دعوت پر اورنگ آباد جارہے تھے۔ وہیں مولوی وحیدالدین نے نذیراحمد کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے کہا کہ کاش اُن کا بھی کوئی شاگرد مصنف جیسا ہوتا، جو اُن کی وفات کے بعد اُن پر مضمون لکھتا۔ یہ سُن کر مصنف نے ایسا کرنے کا وعدہ کرلیا، بہ شرطے کہ مولوی صاحب مرکے دکھائیں۔

مولوی صاحب ایک سال کے اندر ہی وفات پاگئے اور مصنف نے اُن کی وصیّت کی تعمیل میں یہ مضمون لکھا۔

اسٹیشن کی ملاقات کے بعد مصنف ریل کے سفر کا حال بیان کرتے ہیں۔ جب مولوی صاحب مسلسل بولتے رہے۔ انھوں نے اپنے حالاتِ زندگی بتائے؛ علمی کارنامے بیان کیے؛ شعروشاعری کی؛ دوسروں کی بُرائیاں کیں اور یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اسی دوران انھوں نے مصنف کو مشورہ دیا کہ وہ شاعری کے جوہر کو ضائع نہ ہونے دے۔

مُصنف کی کھوج کے مطابق: ان کے اندر ظرافت کا مادہ تھا، تاہم زمانے کی ٹھوکریں کھا کر اُن کے لہجے میں کچھ تلخی آ گئی تھی۔ شاید اسی وجہ سے کوئی بھی دلی طور پر اُن کو نہیں چاہتا تھا۔ مصنف کہتے ہیں کہ جب بھی گفتگو کے دوران بڑے لوگوں کا ذکر آیا، تو کہنے لگے کہ وہ گدھے ہیں۔ یوں بے نقط سُنا کر وہ اپنے دل کو ٹھنڈا کر لیتے تھے۔ زمانے کی تلخیوں نے مولوی صاحب کو کنجوس بھی بنا دیا تھا۔ وہ جتنا کماتے، اس سے کئی گنا کم خرچ کرتے۔

مصنف کہتے ہیں کہ اگلے دن دو بجے وہ سب لوگ اورنگ آباد پہنچ گئے، تاہم راستے بھر کی بے آرامی کی بہ دولت مولوی صاحب کو بخار ہو گیا۔ دوسرے دن طبیعت خراب ہونے کے باوجود انھوں نے خوب بن سنور کر اپنا لیکچر دیا۔ ان کے پڑھنے کے انداز میں بہت روانی تھی اور ایسا شاید اس وجہ سے تھا کہ سرسید احمد خان اپنی عمر کے آخری زمانے میں اپنے لیکچر مولوی وحیدالدین صاحب سے پڑھواتے تھے۔ مصنف نے اورنگ آباد میں ہونے والا ایک دل چسپ واقعہ بھی پیش کیا، جس کے مطابق وہیں ۱۲۶۲ھ کا ایک مشاعرہ زندہ کیا گیا۔ مصنف نے سٹیج پر آ کر اس مشاعرے کو ''طبقات الشعرائے ہند'' کے مؤلف مولوی کریم الدین صاحب سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا کہ یہ مشاعرہ انھی کے مکان پر نواب زین العابدین خان عارف کی مدد سے ہوا تھا۔ یوں اُن کی تقریر میں جہاں جہاں مولوی کریم الدین صاحب کا نام آیا، وہاں وہاں اُن کا ہاتھ غیرارادی طور پر مولوی وحیدالدین صاحب کی طرف کو اُٹھتا، جس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے مولوی وحیدالدین سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ کیا مولوی کریم الدین آپ کے والد تھے؟ اس پر مولوی صاحب بہت بپھرے اور انھوں نے اسے مرزا فرحت اللہ کی شرارت جانا۔

مولوی صاحب ایک بڑے سے گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ گھر میں سامان بھی کم رکھا تھا۔ چائے پینا اور دوسروں کو پلانا اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کھانے کے بارے میں پوچھو، تو مولوی صاحب کہتے: ''نہیں بھئی! میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے، صرف چائے پر گزران ہے''۔ تاہم مصنف نے انھیں خوب کھاتے دیکھا تھا۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے۔ شکر خور تھے اور یار، دوست، شاگرد وغیرہ اُن کو مٹھائی لا کر پیش کرتے رہتے۔ مولوی صاحب گھر کے بیشتر کام خود کرتے تھے۔ ان میں سے ایک اپنی بان کی چارپائی کی ادوان کھینچنا تھا، جسے وہ ایسا کھینچتے کہ ہاتھ مارو، تو طبلے کی آواز آئے۔ مصنف کے مطابق: مولوی صاحب کو اصطلاحات بنانے پر خوب مہارت حاصل تھی۔ اس وقت سب کی یہی رائے تھی کہ اصطلاحات بنانے میں مولوی وحیدالدین اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مولوی صاحب کی وفات کو مصنف اردو زبان کا ایک ستون گر جانے کے مترادف سمجھتے ہیں اور ان کے مطابق: اُن کے بعد اُن جیسا پروفیسر ملنا ناممکن ہے۔

۱.۴ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''مولوی صاحب دنیا میں.........................فوج داری ہوئے''۔

تشریح: یہ اقتباس مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون 'ایک وصیت کی تعمیل' سے لیا گیا ہے۔ مولوی وحیدالدین صاحب

کے نڈر ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ وہ دنیا بھر میں کسی سے بھی نہیں ڈرتے تھے، لہٰذا وہ سب کے بارے میں اپنی ناقابلِ بیان رائے دیتے رہتے تھے۔ ہاں! اگر انھیں کسی کا ڈر تھا، تو وہ مولوی عبدالحق صاحب تھے۔ مصنف نے کئی بار کوشش کی کہ وہ مولوی عبدالحق کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے معلوم کریں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح بات کو ٹال جاتے۔ ان کے ٹال جانے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی رائے مولوی صاحب کے بارے میں بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، ہاں! ادب لحاظ اتنا کرتے تھے کہ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اِدھر مصنف کے ارادے بھی اس قدر پختہ تھے کہ اگر مولوی صاحب چند دن مزید زندہ رہتے، تو وہ مولوی عبدالحق کے بارے میں بھی ان کی رائے جان لیتے۔ تاہم دوسرے لوگوں کے بارے میں ان کی رائے ناقابلِ بیان تھی اور اگر ان ہی کے الفاظ میں پیش کی جائے، تو فوج داری مقدمہ ہو جائے۔

۲۔ چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت ۱۹۰۴ء میں کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے، جو بارہ مولہ کے قریب واقع ہے۔ ان کے والد کا نام بدرالدین اور والدہ کا نام فضل بی بی تھا۔ چراغ حسن حسرت کو ان کے نانا حسن علی نے گود نے لے لیا اور کچھ عرصے بعد پونچھ کی طرف ہجرت کر گئے۔ حسرت نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے نانا حسن علی ہی کے دامنِ شفقت میں رہ کر حاصل کی۔ گھر میں فارسی کی بنیادی تعلیم حاصل کی اور پھر اسکول میں داخل ہوئے، جہاں انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ پونچھ کے اسلامیہ اسکول میں انھوں نے مڈل تک اور وکٹوریہ جوبلی اسٹیٹ ہائی اسکول سے میٹرک کی تعلیم حاصل کی۔ والد کی وفات کی وجہ سے حسرت کو میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی تدریس شروع کرنا پڑی۔ میٹرک کے بعد وہ منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہوئے۔ پھر بی اے کے امتحان کی تیاری بھی کی، مگر نامساعد معاشی حالات کے سبب وہ اس میں شامل نہ ہو سکے۔

حسرت طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و شاعری سے رغبت رکھتے تھے۔ انھیں پہلی ملازمت اسلامیہ انگریزی مڈل اسکول میں اورینٹل ٹیچر کی حیثیت سے ملی۔ ۱۹۲۱ء میں وہ پونچھ چھوڑ کر لاہور آئے، کچھ دن یہاں رُکے اور پھر شملہ چلے گئے، جہاں انھیں بشپ کاٹن اسکول میں فارسی اور اردو کے استاد کی حیثیت سے نوکری ملی۔ اُن کے شملہ میں قیام کے دوران پونچھ میں اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ شملہ چھوڑ کر واپس وطن آ گئے۔ انھوں نے درس و تدریس کا پیشہ ترک کر دیا اور ۱۹۲۵ء میں کلکتے میں جا کر صحافت کی وادی میں قدم رکھا۔

کلکتے میں انھوں نے ایک مقامی اخبار 'نئی دنیا' میں 'کولمبس' کے قلمی نام سے 'کلکتہ کی باتیں' کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا، جس کی تعریف مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اخبار نویسوں نے کی۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے ایک ادبی رسالہ 'آفتاب' کے نام سے جاری کیا، جو دو سال تک بڑی آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ وہ 'عصرِ جدید' اور 'جمہور' سے بھی وابستہ رہے۔

۱۹۲۹ء میں وہ لاہور چلے آئے۔ یہاں وہ علمی حلقے 'نیاز مندانِ لاہور' سے وابستہ رہے اور اردو روزناموں: 'زمیندار'، 'احسان'، 'شہباز' کے علاوہ کچھ دوسرے اخبارات کے لیے کام کیا۔ ۱۹۴۰ء میں حسرت آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں دتی چلے گئے۔ ریڈیو سے فارغ ہونے کے بعد حسرت کچھ عرصہ لاہور میں اشاعتی کاموں میں مصروف رہے اور پھر فوجی اخبار کے ایڈیٹر بن کر کپتان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد وہ میجر بن کر سنگاپور چلے

گئے اور وہاں فوجی اخبار 'جوان' کی ادارت کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں واپس لاہور آ کر 'امروز' کی ادارت سنبھالی۔

۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو اتوار کے دن چراغ حسن حسرت دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ حسرت کی مطبوعہ تصانیف میں: مردمِ دیدہ 'بغاوتِ عرب اور کرنل لارنس'، 'سرگزشتِ اسلام'، 'حیاتِ اقبال'، 'جدید جغرافیہ پنجاب'، 'کشمیر'، 'قائداعظم' اور کچھ دوسری کتب شامل ہیں۔

چراغ حسن حسرت بامحاورہ اور بہت دل آویز اُردو لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔

اگرچہ چراغ حسن حسرت معاشی ضروریات کے تحت صحافت کی دنیا میں چلے گئے، پھر بھی وہ بنیادی طور پر ادیب تھے اور اُن کا ادبی تخلیقی رنگ اُن کی صحافتی تحریروں میں بھی جھلکتا ہے۔ صحافت کو زیادہ وقت دینے کی وجہ سے ان کا بیشتر نثری سرمایہ صحافت ہی سے متعلق ہے۔ ان تحریروں کا استدلال اور معلومات سے بھرپور ہونا صحافتی، جب کہ زبان کی شائستگی، تخلیقی جدّت، طنزیہ عنصر اور فکشن کی آمیزش ادبی اسلوب کا مظہر ہیں۔ انھوں نے صحافت نگاری، شوخ نگاری، خاکہ نگاری اور ظرافت نگاری جیسے اسالیب کو اپنی ادبی وصحافتی تحریروں میں استعمال کیا۔ اُن کی کچھ تحریروں میں رومانوی انداز بھی جھلکتا ہے، تاہم صحافتی تحریر چوں کہ حقیقت نگاری میں مقید ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے اپنے کالموں میں حالاتِ حاضرہ کو پیشِ نظر رکھا۔

چراغ حسن حسرت کی زبان سادہ، عام فہم اور رواں دواں ہے، تاہم چند ہم عصر ادبی رہ نماؤں کے اسلوب سے اثر لے کر وہ کبھی کبھی غالب ادبیت (Literariness) کو بھی استعمال میں لاتے ہیں۔

۲.۱ علّامہ اقبال [متن]

میکلوڈ روڈ پر لکشمی انشورنس کمپنی کی عمارت سے کچھ آگے سینما ہے۔ سینما سے اُدھر ایک مکان چھوڑ کے ایک پرانی کوٹھی ہے، جہاں آج کل آنکھوں یا دانتوں کا کوئی ڈاکٹر رہتا ہے، کسی زمانے میں علامہ اقبالؒ یہیں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں یہیں پہلی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب بھی میں اس طرف سے گزرتا ہوں، تو اس کوٹھی کے قریب پہنچ کر قدم رکتے معلوم ہوتے ہیں اور نظریں بے اختیار اس کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

کوٹھی اچھی خاصی تھی، صحن بھی خاصا کشادہ۔ ایک طرف شاگرد پیشہ کے لیے تین کمرے بنے ہوئے تھے، جن میں علّامہ اقبالؒ کے نوکر چاکر علی بخش، رحمان، دیوان علی وغیرہ رہتے تھے، لیکن کوٹھی کی دیواریں سیلی ہوئی؛ پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا؛ چھتیں ٹوٹی پھوٹی؛ منڈیر کی کچھ اینٹیں اپنی جگہ سے اس طرح سرکی ہوئی تھیں کہ ہروقت منڈیر کے زمین پر آ

رہنے کا اندیشہ تھا۔ میر کا مکان نہ سہی، بہرحال غالب کے بَلّی ماروں والے مکان سے ملتا جلتا نقشہ ضرور تھا۔

کوٹھی کے صحن میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر اُجلی چادر، اس پر علاّمہ اقبال ململ کا کُرتا پہنے؛ تہ بند باندھے؛ تکیے سے ٹیک لگائے حقہ پی رہے تھے۔ سرخ و سپید رنگت، بھرا ہوا جسم، سر کے بال کچھ سیاہ کچھ سپید، ڈاڑھی گھٹی ہوئی، چارپائی کے سامنے کچھ کرسیاں تھیں۔ ان پر دو تین آدمی تھے۔ دو تین اٹھ کے جا رہے تھے۔ سالک صاحب میرے ساتھ تھے۔ علاّمہ اقبال نے پہلے ان کی مزاج پُرسی کی، پھر میری طرف توجہ فرمائی۔

ہم جب گئے تھے، تو سورج چھپنے میں کوئی آدھ گھنٹا باقی تھا، مگر اُٹھے، تو اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ مجھے لاہور آئے ہوئے سوا سال سے اوپر ہو چکا تھا، لیکن زیادہ لوگوں سے ربط نہیں تھا، یا تنہا گھر میں بیٹھا ہوں یا سالک صاحب کے ہاں۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ حکیم فقیر محمد چشتی صاحب کے ہاں بھی چلا جاتا تھا، لیکن اب جو علاّمہ اقبال کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا، تو ایک اور ٹھکانا ہاتھ آ گیا۔ کچھ دنوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ اوّل تو دوسرے تیسرے روز، ورنہ ساتویں آٹھویں ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا۔ کبھی کسی دوست کے ساتھ؛ کبھی اکیلا، مگر جب جاتا تھا، گھنٹا دو گھنٹا ضرور بیٹھتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بارہ بجے تک برابر محفل جمی ہے۔ لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ادب، شاعری، سیاست، مذہب پر بحثیں ہو رہی ہیں، لیکن ان محفلوں میں سب سے زیادہ علاّمہ اقبال باتیں کرتے تھے، دوسرے لوگوں کی حیثیت زیادہ تر سامعین کی ہوتی تھی۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو بات کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے، یا بات کاٹ کے بولنا شروع کر دیتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر مسئلے کے متعلق ان کی معلومات دوسروں سے زیادہ ہوتی تھیں اور اہلِ محفل کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ چند جملے کہہ کے چپکے ہو رہیں۔

ان کے مکان کے دروازے غریب و امیر، ادنیٰ و اعلیٰ سب پر کھلے تھے، نہ کوئی حاجب نہ دربان؛ نہ ملاقات کے لیے کارڈ بھجوانے کی ضرورت؛ نہ تعارُف کے لیے کسی واسطے کی حاجت، جو آتا ہے کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا ہے اور یا تو خود اپنا تعارف کرا دیتا ہے یا چپ چاپ بیٹھا باتیں سنتا رہتا ہے۔ علاّمہ اقبال باتیں کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے رکتے ہیں، تو اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور پوچھتے ہیں: ''فرمائیے! کہاں سے آنا ہوا؟'' وہ اپنا نام بتاتا ہے، کوئی حاجت ہوتی ہے، تو بیان کر دیتا ہے۔

ان سے جو لوگ ملنے آتے تھے، ان میں کچھ تو روز کے آنے والے تھے۔ کچھ دوسرے تیسرے اور کچھ ساتویں آٹھویں آتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے، جنھیں عمر بھر میں صرف ایک آدھ مرتبہ ان سے ملنے کا موقع ملا، پھر بھی ان کے ہاں ہر وقت میلا سا لگا رہتا تھا۔ جب جاؤ دو تین آدمی بیٹھے ہیں۔ کوئی سفارش کرانے آیا ہے؛ کوئی کسی

شعر کے معنی پوچھ رہا ہے؛ کسی نے آتے ہی سیاسیات کے متعلق بحث چھیڑ دی ہے اور کوئی مذہب کے متعلق اپنے شکوک بیان کر رہا ہے۔

اکثر لوگ جو باہر کے کسی شہر سے لاہور کی سیر کرنے آتے تھے۔ ان کی کوٹھی پر حاضر ہونا واجبات میں سے سمجھتے تھے، کیونکہ لاہور آ کے ڈاکٹر اقبالؒ کو نہ دیکھا، تو کیا دیکھا۔ ایسے لوگ بھی تھے، جو ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا دیکھ کر ان سے علاج کرانے آ جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص ان سے دانت نکلوانے چلا آیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا ڈاکٹر اقبالؒ علاج کرنا نہیں جانتے، تو وہ بہت حیران ہوا۔ اور کہنے لگا: یہ کیسے ڈاکٹر ہیں، جنھیں دانت نکالنا بھی نہیں آتا!

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں، جنھیں علّامہ اقبالؒ سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا اشتیاق عمر بھر رہا، مگر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو ان کی طبیعت کا حال معلوم نہیں تھا۔ وہ ان کی عظمت کے ذکر اذکار سُن کر اور اِن کے نام کے ساتھ سر جیسا پُر رعب خطاب دیکھ کر دل میں سمجھتے تھے کہ ان کے حضور میں ہم ایسے غریب لوگوں کی رسائی کہاں؟ میرے ایک عزیز دوست جو علّامہ اقبالؒ کے سچے عقیدت مند ہیں، ان کی وفات سے کوئی دو مہینے کے بعد مجھ سے ملنے آئے اور جب تک بیٹھے رہے، انھیں کا ذکر کرتے رہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ علّامہ اقبالؒ سے ہر شخص مل سکتا تھا، تو انھوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے: ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ مجھے کئی سال سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا تھی، مگر حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ جی میں سوچتا تھا: کسی تقریب کے بغیر کیسے ملوں؟ کیا عجب ہے کہ وہ ملنے سے انکار ہی کر دیں۔ کئی دفعہ اس شوق میں ان کی کوٹھی تک گیا، مگر اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑی، اس لیے باہر سے ہی الٹے پاؤں لوٹ آیا''۔

علّامہ اقبالؒ بہت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں تو وہ ہمیشہ تہ بند اور کُرتے میں نظر آتے تھے۔ البتہ باہر نکلتے، تو کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے؛ کبھی فراک کوٹ کے ساتھ شلوار اور ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ ولایت جانے سے پہلے وہ پنجابیوں کا عام لباس پہنتے تھے، یعنی کبھی مشہدی لنگی کے ساتھ فراک کوٹ اور شلوار؛ کبھی سپید ململ کی پگڑی۔ وہ شیروانی اور چُست گھٹنا بھی پہنتے رہے ہیں، مگر بہت کم۔ میں نے اس لباس میں انھیں دیکھا تو نہیں۔ البتہ قیاس کہتا ہے کہ شیروانی اور چُست گھٹنا ان کے جسم پر بہت کھِلتا ہوگا۔

وہ کھانا کم کھاتے تھے، مگر ہمیشہ اچھا کھاتے تھے۔ مدت سے ان کا یہ دستور تھا کہ رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے، صرف نمکین کشمیری چائے پر اکتفا کرتے تھے۔ دستر خوان پر ہمیشہ دو تین سالن ضرور ہوتے تھے۔ پلاؤ اور کباب انھیں بہت مرغوب تھے۔ شب دیگ بھی بہت پسند تھی۔ جاڑے کے دنوں میں بڑے چاؤ سے شب دیگ پکواتے تھے اور خشکے کے

ساتھ کھاتے تھے۔ پھلوں میں صرف آموں سے رغبت تھی۔ آموں کی فصل میں لگن اور سینیاں بھر کے بیٹھ جاتے۔ خود کھاتے؛ احباب کو کھلاتے؛ لطیفے کہتے؛ آپ ہنستے، دوسروں کو ہنساتے تھے۔

جوانی کے زمانے میں ان کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کے نماز پڑھتے؛ قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے، پھر ورزش کرنا شروع کر دیتے۔ ڈنٹر پیلتے؛ مگدر ہلاتے اور جب سارا جسم ۶ ق ۶ ۃ ہو جاتا، تو مگدر ہاتھ سے چھوٹتا۔ سن زیادہ ہو گیا، تو ورزش چھوٹ گئی، البتہ قرآنِ کریم کی تلاوت آخر تک جاری رہی۔

علاّمہ اقبالؒ جوانی میں کبھی کبھار مشاعروں میں بھی شریک ہو جاتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ انھیں اس قسم کے اجتماعات سے نفرت سی ہو گئی۔ ایک دن مشاعروں کا ذکر آ گیا۔ فرمایا: ''اردو شاعری کو ان مشاعروں نے کھویا''۔ میں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟'' کہنے لگے: ''مشاعروں میں بُرے بھلے سب شریک ہوتے ہیں اور داد کو شعر کے حُسن و قبح کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری نے عوام کے مذاق کو اپنا رہنما بنا لیا''۔ میں نے عرض کیا: ''ان مشاعروں نے تو اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا ہے''۔ فرمایا: ''ہاں زبان کو فائدہ پہنچایا اور شاعری کو غارت کر ڈالا''۔

مرحوم کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ خشک فلسفیانہ مسائل کو بھی وہ لطیفوں اور پھبتیوں سے ایسا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ جی چاہتا تھا، پہروں بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہیں۔ یوں تو ہر روز دو تین لطیفے ہو جایا کرتے تھے، لیکن جو پھبتیاں انھوں نے سر شہاب الدین کے متعلق کہی ہیں، انھیں تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انھیں دیکھ کر علاّمہ اقبالؒ کو لطیفوں اور پھبتیوں کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ سر شہاب الدین کی رنگت سیاہ ہے۔ ایک دفعہ وہ سیاہ سوٹ پہن کر اسمبلی میں تشریف لے آئے۔ علاّمہ اقبالؒ نے انھیں دیکھا، تو ہنس کے فرمایا: ''چودھری صاحب! آج تو آپ ننگے ہی چلے آئے''۔

چودھری صاحب نے غور کیا، تو معلوم ہوا کہ لباس کے انتخاب کا معاملہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ سیاہ رنگت پر سیاہ سوٹ واقعی بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ لوگوں کو یہ معلوم کرنے میں دقت ہوتی ہے کہ کوٹ کا کالر کہاں ہے اور ٹھوڑی کہاں؟ یہ سوچ کے سیاہ سوٹ کے بجائے سپید سوٹ پہننا شروع کر دیا۔ سپید پتلون؛ سپید کوٹ؛ سپید قمیض؛ سپید پگڑی۔ علاّمہ اقبالؒ نے انھیں دیکھا، تو سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور بے اختیار ہنس پڑے۔ چودھری صاحب نے جھنجھلا کے کہا: ''آپ ہنسے کیوں ہیں؟'' ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ آپ ہیں یا کپاس کے کھیت میں اَرنا بھینسا''۔ ایک مرتبہ پھر ایسا ہی موقع پیش آیا، تو مرحوم نے ان پر بجھے ہوئے سگریٹ کی پھبتی کہی۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ان سے ہر قسم کے لوگ ملنے آتے تھے اور وہ سب کی باتیں غور سے سنتے اور ان کا

جواب دیتے تھے۔ دوسرے تیسرے، کالجوں کے کچھ طلبہ بھی آ جاتے تھے۔ ان میں کوئی ان کے اشعار کے معنی پوچھتا تھا؛ کوئی مذہب کے متعلق سوالات کرتا تھا؛ کوئی کسی کی بحث لے بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے چار پانچ طالب علم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کالج کی مخلوق میں بننے سنورنے کا شوق زیادہ ہے۔ پوڈر اور سرخی کا استعمال روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ابروؤں کو خم دینے؛ زلفوں میں بل ڈالنے؛ ہونٹوں کو سرخی کے استعمال سے 'نعلین' بنانے کا شوق زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ چاروں پانچوں گل چہرہ اور نازک اندام، اس پر بناؤ سنگھار کا خاص اہتمام۔ انھوں نے آتے ہی پردے کی بحث چھیڑ دی اور ایک نوجوان کہنے لگا: ''ڈاکٹر صاحب! اب مسلمانوں کو پردہ اٹھا دینا چاہیے''۔ ڈاکٹر صاحب مسکرا کے بولے: ''آپ عورتوں کو پردے سے نکالنا چاہتے ہیں اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے''۔

علی بخش ان کا پرانا نوکر ہے اور کوئی چالیس سال تک برابر ان کے ساتھ رہا۔ ملازمت اختیار کی، تو مسیں بھی نہیں بھگی تھیں۔ اب ڈاڑھی مونچھیں سپید ہو چکی ہیں ڈاڑھی تو خیر منڈا دی اور پردہ ڈھک گیا۔ مونچھوں کو خضاب کیا، مگر چند دنوں میں خضاب اڑ گیا اور مونچھوں کی رنگت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ اردگرد کچھ بے تکلف احباب بیٹھے تھے۔ علی بخش پاس کھڑا تھا کہ اس کی مونچھوں کی رنگت کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک صاحب کہنے لگے: ''یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر علی بخش کی مونچھوں کی کیا رنگت ہے؟'' دوسرے بولے: ''خاکستری؟'' ایک اور صاحب نے کہا: ''خاکستری نہیں، اگرئی'' ڈاکٹر صاحب بھی سُن رہے تھے، مسکرا کے بولے: ''نہ اگرئی، نہ خاکستری، مچھئی کہو، مچھئی''۔

مرحوم زندگی کے بعض معاملات میں خاص ضابطوں کے پابند تھے۔ وہ گھر کا سارا حساب کتاب باقاعدہ رکھتے تھے اور ہر شخص کے خط کا جواب ضرور دیتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص ان سے سند یا کسی تصنیف پر ان کی رائے لینے آتا تھا، تو کہتے تھے: خود لکھ لاؤ، میں دستخط کر دوں گا اور یہ بات صرف ٹالنے کی غرض سے نہیں کہتے تھے، جو کچھ کوئی لکھ لاتا تھا، اس پر دستخط کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ ایک ایک نشست میں دو دو سو شعر لکھ جاتے تھے۔ پلنگ کے پاس ایک تپائی پر پنسل اور کاغذ پڑا رہتا تھا۔ جب شعر گوئی پر طبیعت مائل ہوتی تھی، لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی خود لکھتے تھے، کبھی کسی کو لکھوا دیتے تھے۔ عشقِ رسولؐ نے ان کے دل کو گداز کر رکھا تھا۔ نبی کریمؐ کا نام لیتے وقت، ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں اور قرآن پڑھتے پڑھتے بے اختیار رو پڑتے تھے۔ غرض ان کی شخصیت بے حد دل آویز تھی، جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے اور ان سے ملے نہیں، وہ اقبال کے اعلیٰ کمالات سے بے خبر ہیں۔

موت سے کوئی ڈھائی سال پہلے وہ میو روڈ پر اپنی نو تعمیر کوٹھی میں اٹھ گئے۔ وہاں گئے ابھی تھوڑے دن ہوئے

تھے کہ ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ انھیں اس واقعے کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے اس حالت میں انھیں دیکھا کہ مرحومہ کی قبر کھودی جا رہی ہے اور وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے معلوم ہو رہے تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی اور چہرہ زرد۔ اس واقعے کے بعد ان کی صحت برابر بگڑتی چلی گئی۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کیا اور شاہی مسجد کے باہر دفن ہوئے۔ [مَردمِ دِیدہ]

۲.۳ مشکل الفاظ کے معانی:

حاجب:	دربان، چوب دار	کشادہ:	وسیع، کھلا
عرق عرق ہونا:	پانی پانی ہو جانا مراد بہت زیادہ پسینہ آنا	مُگدر:	وہ ڈنڈا جو ورزش کے لیے ہاتھوں سے ہلاتے ہیں
گھٹنا:	گھٹنوں تک پاجامہ جو جانگھیے سے بڑا ہوتا ہے	نازک اندام:	چھریرے بدن کا، نازک جسم والا

۲.۴ خلاصہ:

علّامہ اقبال میکلوڈ روڈ پر ایک پرانی کوٹھی میں رہائش پذیر تھے، یہیں ۱۹۳۰ء میں مصنف کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہُوا۔ یہ کوٹھی بڑی تھی، لیکن پلستر اکھڑا ہوا اور چھتیں ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ صحن میں ایک چارپائی پر کُرتا پہنے، تہ بند باندھے علامہ اقبال بیٹھے حُقہ پی رہے تھے۔ چارپائی کے پاس کچھ کرسیاں تھیں، جن پر دو تین آدمی بیٹھے تھے۔ مصنف اور اُن کے دوست جب وہاں گئے، تو سورج غروب ہو رہا تھا، مگر اٹھے تو اچھی خاصی رات ہو گئی تھی۔ مصنف جو لاہور میں سوا سال سے رہ رہے تھے، کہیں کم ہی آتے جاتے تھے۔ اقبالؒ کے ہاں تو جیسے انھیں ٹھکانہ ہی مل گیا ہو۔ ویسے بھی علّامہ اقبال کے گھر کے دروازے غریب امیر، چھوٹے بڑے سب کے لیے کھلے تھے۔ ان سے ملنے آنے والوں میں کچھ روزانہ کے آنے والے تھے، کچھ دوسرے تیسرے اور کچھ ساتویں آٹھویں آتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے، جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ہی مل پائے۔ باہر سے لاہور آنے والوں میں سے اکثر لوگ علّامہ اقبالؒ کو دیکھنے ضرور آتے۔ کچھ تو ان کے نام کے ساتھ 'ڈاکٹر' دیکھ کر علاج کرانے بھی چلے آتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے، جنھیں علّامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی، کیوں کہ ان کے خیال میں غریب لوگوں کی علّامہ اقبالؒ تک

رسائی کہاں؟

علاّمہ اقبالؒ بہت سادگی پسند تھے۔ گھر میں ہوتے ،تو تہ بند اور کُرتے میں نظر آتے۔ کھانا کم کھاتے تھے،مگر ہمیشہ اچھا کھاتے تھے۔ پھلوں میں آم بہت شوق سے کھاتے۔ جوانی میں وہ صبح اُٹھ کر تلاوتِ قرآنِ پاک کرتے اور پھر ورزش بھی کرتے۔ بڑھاپے میں ورزش تو چھوڑ دی، مگر تلاوت جاری رہی۔ علاّمہ اقبال مشاعروں کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ ہر روز ان کی گفت گو میں سے کئی لطیفے نکل آتے تھے۔

علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے کچھ معاملات میں خاص ضابطوں کے پابند تھے، مثلاً: وہ باقاعدگی سے گھر کا حساب کتاب رکھتے اور کسی شخص کے خط کا جواب دینا نہ بھولتے۔ شعر کہنے میں اتنی مہارت تھی کہ ایک ہی نشست میں دو دو سو شعر کہہ دیتے۔ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ حضورؐ کا نام لیتے وقت آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اسی طرح قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہوئے بھی بے اختیار رو پڑتے۔ ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا، تو ان کی طبیعت بگڑتی گئی اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کیا۔

۴.۳ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''اُن سے جو لوگ ملنے آتے۔۔۔۔ اور کوئی مذہب کے متعلق اپنے شکوک بیان کر رہا ہے''۔

تشریح: یہ اقتباس چراغ حسن حسرت کے تحریر کردہ خاکے 'علاّمہ اقبالؒ' سے لیا گیا ہے۔ مصنف علاّمہ اقبالؒ کی رہائش گاہ کا نقشہ کھینچنے اور اپنی پہلی ملاقات کی روداد سنانے کے بعد یہ بتاتے ہیں کہ اقبالؒ سے کس قسم کے لوگ ملنے آتے ہیں۔

مصنف کے مطابق اقبالؒ کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے کھلے رہتے تھے۔ اُن سے ملنے کے لیے آنے والوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کچھ وہ تھے جو ہر روز بلاناغہ ان سے ملنے آتے، کچھ لوگ دوسرے تیسرے روز ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور بعض ہفتہ وار حاضری کا شرف حاصل کرتے۔ ان لوگوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے، جو اپنی ساری زندگی میں علاّمہ اقبالؒ سے صرف ایک آدھ بار مل پائے۔ تاہم اُن کے ہاں ہر وقت ایک میلا سا لگا رہتا اور محفل جمی رہتی۔ جب جائیں دو چار لوگ بیٹھے ہوتے تھے اور ان میں ہر قسم کے لوگ ہوتے۔ سفارش کرانے والے، اشعار کے معنی سمجھنے والے، کچھ سیاست سے دل چسپی رکھنے والے اور بعض مذہب پر اقبالؒ سے رہنمائی لینے والے۔ الغرض علاّمہ اقبالؒ ہر طرح کے لوگوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتے اور ان کی مدد کرتے۔

۳۔ فارغ بخاری

فارغ بخاری ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۵ء کو گور گھٹڑی پشاور شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول پشاور سے حاصل کی اور ملازمت کی غرض سے کلکتہ اور برما روانہ ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء کو پشاور واپسی ہوئی، تو رضا ہمدانی سے مل کر محافلِ شعر وسخن برپا کرنے کے ساتھ مختلف ادبی تنظیموں کو فعال کیا اور صوبہ سرحد کے ادب کے حوالے سے تحقیقی کام کا سلسلہ شروع کیا۔

'کیسر کیاری'، 'المشرقی'، 'البلاغ'، 'انجام'، 'نغمۂ حیات'، 'مصورِ شباب' اور 'سنگِ میل' جیسے رسائل میں صحافتی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۹ء میں پشاور سے لاہور اور پھر کراچی کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ اپنے صحافتی اور ادبی سفر میں فارغ بخاری نے قید و بند اور جلاوطنی کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے پشتو فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات بھی پاس کیے۔

فارغ بخاری ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے۔ اپنی ادبی زندگی میں فارغ بخاری نے متعدد رسائل و جرائد میں ادارت کی خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ رضا ہمدانی کے ہمراہ پشتو اور ہندکو ادبیات کے حوالے سے تحقیقی کاوشیں بھی کیں۔ ۱۹۳۹ء میں فارغ بخاری کے مقالے کو بہترین مقالہ قرار دیتے ہوئے ایوارڈ بھی دیا گیا۔ انھوں نے افسانے بھی اور شاعری بھی کی۔ خاکے بھی لکھے اور خودنوشت بھی تحریر کی۔ ۱۴۔ اپریل ۱۹۹۷ء کو پشاور میں اردو ادب کی یہ ہمہ جہت ادبی شخصیت ہم سے رخصت ہوگئی۔

فارغ بخاری نے تحقیق، شاعری اور ادبی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، ان میں: عورت کا گناہ (افسانے) آیاتِ زندگی (منقبت) پشتو لوک گیت (تحقیق) زیر و بم (شاعری) ادبیات سرحد (تحقیق) نویاں راہواں (ہندکو انتخاب) شیشے کے پیراہن (شاعری) خوشبو کا سفر (شاعری) البم، دوسرا البم (خاکے) غزلیہ (شاعری)، پیاسے ہاتھ (شاعری) آئینے صداؤں کے (شاعری) محبتوں کے صنم خانے (شاعری) بے چہرہ سوال (شاعری) لوحِ غیر محفوظ (رپورتاژ) مسافتیں (خودنوشت) پشتو ادب کی تاریخ (تحقیق) ہندکو ادب (تحقیق) رحمان بابا، اٹک کے اس پار (تحقیق) جیسی تصانیف شامل ہیں۔

۱.۳ اَن داتا [متن]:

قلمی خاکوں کے سلسلے میں ہر فنکار کے خاکے کو عنوان دینے کا جو بکھیڑا میں نے پالا (بعض ہوش مند خاکہ نگار اس جھنجٹ میں نہیں پڑے۔ ان کے نام دے کر مفت کی مغز ماری سے بچ گئے۔)، اس سے کچھ خاکوں کی سرخی سوچنے میں خاصی کوفت ہوئی، یعنی خاکہ لکھ لیا اور کوئی عنوان ہی لگا نہیں کھاتا، لیکن کرشن چندر کے معاملے میں مختلف قسم کی مشکل میں پھنس گیا۔ عنوانوں کا کیو لگا ہے، ہر عنوان فٹ بیٹھ رہا ہے؛ انتخاب کرنا ایک مسئلہ ہو گیا۔ دیوتا کرشن مہاراج کے ہم نام ہونے کی اور فرشتہ خصلت ہونے کی مناسبت سے سوجھا، لیکن دیوتاؤں کا وہ قائل نہ تھا۔ ایک دفعہ کسی دوست نے پوچھا: ''کرشن مہاراج اور کرشن چندر میں کیا فرق ہے؟''

برجستہ جواب ملا: ''کرشن مہاراج مکھن چراتے تھے، میں مکھن نہیں چراتا۔ تم خود فیصلہ کر لو، ہم دونوں میں شریف کون ہے؟''

تقسیمِ ملک سے پہلے دہلی ریڈیو اسٹیشن پر اکبرِ اعظم کے دربار کی طرح اردو ادب کے نورتن: منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک جمع ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد منٹو کو کسی فلم کمپنی نے بمبئی بلا لیا۔ دوستوں میں خط و کتابت جاری تھی۔ ایک دن قاسمی صاحب نے کرشن چندر کو منٹو کا خط دکھاتے ہوئے بتایا: ''دیکھو! اس نے مجھے اردو افسانے کا بادشاہ لکھا ہے''۔

کرشن نے مسکراتے ہوئے جیب سے منٹو کا خط نکال کر قاسمی صاحب کو دیا، جس میں کرشن چندر کو افسانے کا شہنشاہ لکھا تھا۔

یہ لطیفہ مدت ہوئی قاسمی صاحب نے سنایا تھا۔ 'اردو افسانے کا شہنشاہ' بڑا موزوں رہے گا، میں نے سوچا، لیکن شہنشاہوں سے اسے نفرت تھی۔ اس خیال سے یہ نام بھی رد کر دیا۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے نام بھی تھے، جنھیں غیر موزوں سمجھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ بہت سی پسندیدہ چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب بھی کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس ادھیڑ بن میں کسی غیبی آواز نے جو شاید کرشن چندر کی روح تھی، مجھے ایک اور عنوان سجھایا: 'ان داتا' جو اسی کے ایک ماسٹر پیس افسانے کا نام ہے۔ میں نے چونک کر نام دہرایا اور خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کی لازوال شخصیت کے سارے سروں کا عکس 'ان داتا' میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور ایثار اور دردمندی اور انکساری اور عظمتوں کے ساتھ جھلک رہا تھا۔

محل تخلیق کرنے والے فن کار کی ہے۔ اس نے اردو ادب میں افسانے کو بلاشبہ وہ مقام دلایا، جو عمارتوں میں 'تاج محل' کو حاصل ہے۔

کرشن چندر۔۔۔ منٹو کے بعد اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار تھا۔ وہ ایسا تاریخ ساز تخلیق کار تھا، جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اسے ہم اردو کا چیخوف کہیں، تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی شہرت و مقبولیت برِصغیر کی حدود پھاند کر ساری دنیا کو مسخر کر چکی ہے۔ وہ فن کی دیوی کا پجاری تھا۔ فن سے اسے والہانہ عشق تھا اور وہ قلم کا استعمال عبادت سمجھ کر کرتا رہا۔

ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ہو کر اکثر و بیشتر ادیبوں نے نام و مقام پایا، لیکن کرشن چندر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کی شمولیت سے اس تحریک کو عزت وعظمت نصیب ہوئی۔ انقلابی رومانیت کا صحیح اطلاق اس کے افسانوں پر ہوتا ہے۔ اس کی سادہ شگفتہ تحریر کا لفظ لفظ معنویت سے بھرپور اور سحر آفرینی سے معمور نظر آتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے، جیسے وہ نثر میں شاعری کر رہا ہے۔ افسانے کی تکنیک میں جس قدر نئے تجربے اس نے کیے ہیں اور کوئی نہیں کر سکا۔ 'ان داتا' میں بھی اس نے تکنیک کا ایک ایسا نیا تجربہ کیا ہے، جس نے ادبی دنیا کو چونکا دیا۔ قحطِ بنگال پر بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں، لیکن اس موضوع پر اس کا 'ان داتا' حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔ اس افسانے نے متحدہ ہندوستان کے طول وعرض میں جیسے آگ لگا دی۔ یہ افسانہ میں نے بار بار پڑھا اور کرشن چندر کے انسانیت پرست جذبات سے اس کے اندرونی کرب کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، لیکن میں اس کے زخموں کی گہرائی نہ ماپ سکا۔

وہ انسانی قدروں کا علمبردار تھا۔ اس نے نسل و رنگ کی قیود توڑ کر تمام عالمِ انسانیت کی ایک برادری قائم کرنے کے لیے اپنے فن اور قلم کو وقف کر دیا تھا۔ وہ صداقتِ اظہار کو فن کی آبرو سمجھتا تھا۔ ظلم و استحصال اور بے انصافی سے معاشرے کو پاک کر کے عدل و مساوات اور انسانی بھائی چارے کی بنیادوں پر ایک نیا سماج تخلیق کرنے کا آرزومند تھا۔

کرشن چندر سے میری سرسری ملاقاتیں رہی ہیں؛ خط و کتابت بھی رہی ہے۔ بظاہر کوئی گہرا تعلق نہیں رہا، لیکن وہ تو سب کا دوست تھا۔ نہ صرف دوستوں کا دوست؛ اپنی ادبی برادری کا دوست؛ اپنے ہم وطنوں کا دوست، بلکہ تمام نوع انسان کا دوست تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ انسان دوستی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ غربت، جہالت، اندھے عقائد، فرقہ پرستی، سماجی ناہمواری اور نسلی تفریق کے خلاف وہ آخری لمحوں تک قلمی جنگ لڑتا رہا۔ اس کا فن؛ اس کا قلم؛ اس کی سوچ ہمیشہ اسی مقصد کے لیے وقف رہی ہے، اس لیے اس کی دوستی کے لیے کسی قرب یا ہم جلیسی کی ضرورت نہ تھی۔ پہلی ملاقات ہی میں وہ کھل کر ملتا؛ اپنے آدرش کا برملا اظہار کرتا؛ لطائف و ظرافت کے دریا بہاتا اور یوں گھل مل جاتا کہ کسی قسم کی غیریت کا احساس تک نہ ہونے دیتا۔ وہ بڑوں چھوٹوں سب سے اسی تپاک؛ اسی خلوص اور محبت سے پیش آتا کہ اس کے نزدیک

سب انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں؛ ایک ہی کنبے کے افراد ہیں؛ ایک ہی خدا کی مخلوق؛ ایک ہی مٹی سے بنے ہیں اور ایک ہی رنگ کا خون ان کے جسموں میں گردش کرتا ہے۔

میں نے تقسیمِ ملک کے بعد اپنے ادبی جریدے 'سنگِ میل' کے لیے اس سے افسانے کا تقاضا کیا۔ وہ افسانہ تو نہ بھیج سکا، لیکن ہر بار مطالبے پر ایک معصوم معذرت کا خط ضرور لکھتا رہا۔ ہر پرچے کی دل کھول کر تعریف کرتا رہا اور جب 'سنگِ میل' کا سرحد نمبر شائع ہوا، تو اس نے ایک طویل خط لکھا، جس کا اقتباس درج ذیل ہے:

''سنگِ میل کے سرحد نمبر نے مجھے اور میرے تمام ساتھیوں کو چونکا دیا ہے۔ تمھاری کاوشوں کی محض داد دینا کافی نہیں۔ یہ نمبر بلاشبہ شمال مغربی صوبہ سرحد کا انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں اس خطے کی زندگی کا ہر پہلو پوری طرح اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ مجھے اس وقیع نمبر میں شامل نہ ہونے کی محرومی کا ہمیشہ احساس رہے گا''۔

میں اسے باقاعدگی سے پرچہ بھیجتا رہا؛ افسانے کے لیے لکھتا رہا اور وہ معذرت نامے ارسال کرتا اور وعدے کرتا رہا۔ آخر میں مَیں نے خط لکھنا بند کر دیا۔ صرف پرچہ جاتا رہا۔ پھر اچانک اس کا ایک تازہ افسانہ موصول ہوا، جس کے ساتھ منسلک خط میں نہ صرف ندامت کا اظہار تھا، بلکہ میری ناراضگی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے معافی طلب کی گئی تھی، لیکن اس وقت تک 'سنگِ میل' احتساب کے عتاب کا شکار ہو کر بند ہو چکا تھا اور میں جیل کی چار دیواری میں سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سال کی سزا بھگت رہا تھا۔

میں اس کا دوست بھی ہوں اور دوستی سے زیادہ اس سے میرا رشتہ ایک قاری کا ہے۔ قاری بھی بڑا نیاز مند سا۔۔۔ یعنی اس کے اوّلین افسانوی مجموعے 'طلسمِ خیال' سے اسے بڑی دلچسپی، بڑی توجہ، بڑی عقیدت سے پڑھ رہا ہوں۔ اس وقت سے جب وہ اپنے نام کے ساتھ کرشن چندر ایم اے لکھتا تھا۔ میں نے اسے خط لکھا کہ ایم اے لکھنا چھوڑ دو۔ یہ ڈگریاں تمھاری شخصیت سے بہت چھوٹی ہیں۔ اس وقت تو شاید میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی اور ایم اے لکھنا جاری رہا، لیکن بعد میں اسے احساس ہوا کہ کبھی کبھی چھوٹے لوگ بھی بڑی مت دے جاتے ہیں اور اس نے ایم اے لکھنا ترک کر دیا۔ میں اسے آخر تک پڑھتا رہا۔ اس کے افسانے، ناول اور رپورتاژ۔۔۔ وہ میرے محبوب افسانہ نگاروں: منٹو، قاسمی، مہندر ناتھ، عصمت میں سے ایک تھا۔ ادبی رسالوں میں سب سے پہلے منٹو، پھر کرشن چندر کے افسانے پڑھتا اور اچھے بُرے سب پڑھتا اور اس کے متعلق دوستوں کے واسطے سے باخبر بھی رہتا۔ پیار جو تھا اس سے، ہزاروں کوس دوری کے باوجود میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہا ہوں، اسی لیے کم ملنے کے باوجود اس کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں۔ سلمیٰ بھابھی سے اس کے پیار دلار تک؛ بچوں سے والہانہ محبت تک؛ دوستوں کی کمینگیوں تک؛ دشمنوں کی مروتوں تک؛ لکھنے کے

اوقات اور انداز تک؛ پسندیدہ رنگوں اور خوشبوؤں تک؛ کھانے کی من پسند ڈشز تک؛ شرارتوں اور قباحتوں اور نیکیوں اور حماقتوں تک؛ تنگدستی اور شاہ خرچی تک، اندرونی کرب اور ظاہری زہر خند تک؛ اس کی ساری زندگی اس طرح میرے سامنے کھلی پڑی ہے، جیسے میں اس کا ہمزاد تھا؛ جیسے اس کی زندگی میں نے گزاری ہو؛ یہ محبتیں بھی کیا کیا معجزے دکھاتی ہیں؛ کیا کیا سوانگ رچاتی ہیں؛ کیسے کیسے سُر جگاتی ہیں۔ کرشن چندر نے اپنے افسانوں میں ان کے سارے رنگوں؛ سارے سُروں سے وہ جادو جگائے اور وہ تکنیکی تجربے کیے کہ اردو افسانے کو لازوال بنا دیا۔ اس کے فکر و فن کی ہم آہنگی، ندرت خیالی، جودتِ طبع کی رنگارنگی اور ہمہ گیر آدرش نے اسے بیکراں وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ اس کی آواز جغرافیائی حد بندیاں پھاند کر ساری دھرتی کی آواز بن گئی اور چاردانگِ عالم میں گونجنے لگی۔ اس کی کتابوں کے تراجم مشرق و مغرب کی اتنی زبانوں میں ہوئے ہیں کہ کسی دوسرے اردو افسانہ نگار کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوسکی۔

کرشن چندر کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے لکھنے کی ابتدا طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہی سے کی۔ 'مانگے کی کتابیں'، 'ہوائی قلعہ' طربیہ اور طنزیہ مضمون بہت پسند کیے گئے، جو ابتدائی دور کے مضامین تھے۔ پھر سنجیدہ لکھنے کا ڈول ڈالا، لیکن اس میں بھی طنز و مزاح کی چاشنی ضرور ہوتی، بلکہ کبھی کبھی یہ جذبہ سر اٹھاتا، تو کچھ نہ کچھ سرزد ہو جاتا۔ 'گدھے کی سرگزشت' اور 'گدھے کی واپسی' اس کے اس شوق کی تکمیل کے نہایت معتبر نمونے ہیں، جس میں منفرد اسلوبِ مزاح کے ساتھ ساتھ اس کے طنز کی بے پناہ کاٹ نے اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ یہ ناول سرمادارانہ نظام کی حماقتوں کا حیرت انگیز عجوبہ ہیں۔ اس کے دوست مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا نے اس کے جواب میں 'گدھے کا خط کرشن چندر کے نام' میں اسے کڑی تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن ناراض ہونے کے بجائے اس نے اسے پسند کیا اور اس پر چوٹ کرتے ہوئے لکھا: ''صاحبزادے! تمھارا خط اپنے نام پڑھ کر جی خوش ہوگیا، ہر چند اپنی کتابوں میں تم میرے مخاطب نہیں تھے۔ تاہم تمھارا ہی کوئی بھائی بند تھا، البتہ بہت سی خوبیاں تم دونوں میں حسنِ اتفاق سے مشترک نکل آئی ہیں، اس لیے اس آئینے میں تمھیں اپنی صورت کا گمان ہوتا ہے اور یہ بے جا نہیں ہے، جبکہ گدھوں کی صورتیں عموماً ایک جیسی ہی ہوتی ہیں اور ان میں واجبی سا فرق بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے''۔

میں نے بھی ''دوسرے گدھے کی سرگزشت'' لکھی، لیکن اسے چھپوانے کا حوصلہ نہ ہوا، کیونکہ ''مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی'' والا معاملہ تھا۔

ایک بار علالت کے دنوں میں ایک دوست کے خط میں پرویز شاہدی کو شرارت سے شاہد پرویزی لکھ دیا۔ دوست نے توجہ دلائی کہ پرویز شاہدی نے اتفاق سے خط دیکھ لیا اور بُری طرح محسوس کیا۔

جواباً لکھا: بھئی! علالت کی وجہ سے غلطی ہوگئی، اسے کہو، معاف کر دے، ورنہ مجھے کرشن چندر کی بجائے چرشن کندر لکھ دے، تا کہ حساب پاک ہو جائے۔ بقولے۔۔۔عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

میں نے ایک دفعہ ساحر کے متعلق لکھا کہ اسے دو تین خط لکھ چکا ہوں، جواب نہیں ملا۔ اس شریف آدمی سے کہو، آخر یہ کہاں کی شرافت ہے؟

اس نے خط میں بتایا: ''ساحر ان دنوں مراقبے میں ہے۔ دوستوں سے ملنا ملانا ترک کر رکھا ہے۔ اس کے اپنے آپ میں لوٹنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی تمھارا پیغام اسے پہنچایا جا سکتا ہے''۔

اپنے معاصرین میں اوپندر ناتھ اشک سے اس کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ اشک کا افسانے اور ڈرامے میں اپنا ایک مقام ہے، جس سے کسی کو انکار نہیں، لیکن وہ بڑی بہت ہے۔ تقریباً سارے دوستوں سے اس کی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ سچ پوچھیے، تو کسی قدر حسد کا شکار بھی ہے۔ منٹو مرحوم سے بھی دلی ریڈیو پر قیام کے دوران اس کے معرکے ہو چکے ہیں، بلکہ آئے دن کی اس جھک جھک سے تنگ آ کر ہی منٹو بمبئی جانے پر مجبور ہوا۔ کرشن کو بھی وہ اپنا حریف سمجھ کر وار کرنے سے نہیں چوکتا تھا، لیکن اس نے کبھی اس کا بُرا نہیں منایا اور کرشن کے انتقام کے جذبے کا خانہ تو ہمیشہ خالی رہا ہے، بلکہ۔۔۔:

بیا کہ من سپر انداختیم اگر جنگ است

کہہ کر اس نے اپنے مخالفین کو بُری طرح مایوس کیا ہے، لیکن محض مزے لینے کے لیے اس کی طرف سے نوک جھونک لگتی رہتی تھی۔ یہ اکثر اس کی کنجوسی کا مذاق اڑاتا اور وہ مرنے مارنے پر تل جاتا، لیکن جب آمنا سامنا ہوتا، تو یہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا، یا اسے کہتا:

''اشک جی! تم تو ہوشمند انسان ہو، یہ بدخواہ تو ہمیں لڑانے کے لیے ہوائیاں چھوڑتے رہتے ہیں''۔

ایک دفعہ کسی نے بتایا: ''اشک نے تمھارے فلاں افسانے پر اعتراض کیا ہے''۔

اس نے کہا: ''اس پاجی سے کہو، تم دوسرا جنم لے کر بھی ایسا افسانہ نہیں لکھ سکتے''۔ اشک منہ سے جھاگ اگلتا، اس کے گھر پہنچا اور آتے ہی اس پر برس پڑا۔

کرشن نے کہا: ''یار غصہ تھوک دو، تم دوست دشمن کو بھی نہیں پہچانتے، مجھے تو خود اپنا وہ افسانہ کمزور لگ رہا ہے اور سلمیٰ سے کہہ رہا تھا کہ اشک جی سے مشورہ کروں گا، اس میں کہاں جھول ہے؟ تا کہ اسے ٹھیک کر سکوں''۔

اور اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ پھر سلمیٰ سے چائے لانے کو کہا۔ پکوڑے بنوائے؛ مٹھائی منگوائی

اور اسے ٹھنڈا کر کے رخصت کیا۔

کرشن چندر ہری بھری زندگی کا نمائندہ، باغ و بہار شخص تھا اور بڑا مخیر انسان تھا۔ اس کا گھر ہمیشہ مہمان سرائے بنا رہا، جس دوست کا کوئی ٹھکانہ نہیں، وہ بلا تکلف کرشن کے ہاں آ کر مہینوں پڑا رہتا۔ عوام میں اسے ایسی قبولیت حاصل تھی کہ ہاتھوں ہاتھ اس کی کتابیں نکل جاتیں اور اس نے اتنا کچھ لکھا کہ کم از کم بمبئی کے سارے افسانہ نگار مل کر بھی اتنا نہیں لکھ پائے۔ فلم سے بھی کمایا، ریڈیو، ٹی وی اور کتابوں کی رائلٹی سے بھی لاکھوں کی کمائی کی۔ اس کی ساری عیاشی دوست نوازی اور غریب پروری تک محدود تھی، اپنے لیے وہ رہائشی مکان تک نہ بنا سکا۔ زندگی بھر کرائے کے مکانوں میں رلتا رہا۔ میں سوچتا ہوں واقعی اسے مکان کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ساری دنیا اس کے گھر کا آنگن، جہاں جاتا لوگ عقیدت سے بچھ بچھ جاتے۔

وہ روس گیا، تو جہاں بڑے بڑے فنکار ملنے آئے، وہاں تاجکستان کی ایک دہقان خاتون جو اس کے افسانوں سے متاثر تھی، ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اپنے اس عظیم فنکار کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے تاشقند پہنچی۔

اپنے متعلق وہ لکھتا ہے: ''میں نے کوئی گھر نہیں بنایا؛ کسی کو بہت بڑا فیض نہیں پہنچایا؛ کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکا، کیونکہ میں نے صرف خواب دیکھے ہیں۔

ایک دن میں نے ایک خواب دیکھا کہ دنیا کے سب انسان برابر ہیں، وہ ایک جھوٹا خواب تھا۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ دنیا میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا، وہ بھی جھوٹا سپنا تھا۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ کرۂ ارض پر سب انسانوں نے مل کر ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹ لیے، وہ بھی جھوٹا سپنا تھا،

لیکن یہی جھوٹے سپنے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں؛ یہی میرا گھر ہیں؛ یہی میری محبت؛ میری زندگی اور میری کل کائنات ہیں''۔

فنکار کا محض فنکار ہونا کافی نہیں، اس کے لیے ایک اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے کہ کوئی تنگ نظر، متعصب اور انسان دشمن فنکار اچھا ادب پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ کرشن چندر عظیم فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھا۔ زندگی بھر وہ دوسروں کے دکھ بانٹتا رہا؛ غریبوں، مزدوروں، محنت کشوں کی دکھی زندگی سے کانٹے چنتا رہا؛ اپنا سکھ، اپنا آرام ان کے لیے لٹاتا رہا۔ یہ لکھ لٹ واقعی ان داتا تھا، اس نے اپنے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ اپنی محنت کی کمائی؛ رت جگوں سے حاصل کیا ہوا سرمایہ، اس نے کبھی بھی اپنی ملکیت نہیں سمجھا۔ اسے اپنے سے زیادہ مستحق لوگوں کا حق سمجھ کر ان حق داروں کی

جھولیاں بھرتا رہا:

ملتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

۴.۲ مشکل الفاظ کے معانی [البم]

اَن داتا:	روٹی دینے والا، آقا، مالک	کیو:	قطار
ماسٹر پیس:	شاہ کار	گاؤدی:	بے وقوف، کند ذہن
چیخوف:	روسی ادب کا معروف افسانہ نگار	چاردانگِ عالم:	دنیا کی چاروں اطراف
ٹچی:	حساس		

۴.۳ خلاصہ:

مصنف کو کرشن چندر کے قلمی خاکے کے عنوان کے انتخاب میں جس مشکل کا سامنا کرنا پڑا، اُس کا ذکر کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خاکہ لکھتے ہوئے کوئی عنوان ہی نہیں ملتا، مگر کرشن چندر کے خاکے کے عنوان کے لیے اس لیے مشکل پیش آتی ہے کہ بہت زیادہ عنوان موزوں نظر آتے ہیں، جن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا آسان نہیں رہتا۔ مصنف نے 'دیوتا' اور 'اُردو افسانے کا شہنشاہ' سمیت کئی ناموں پر غور کیا اور آخر میں کرشن چندر کے ایک افسانے کے عنوان کو ہی اپنے خاکے کا عنوان بنا دیا: 'اَن داتا'

مصنف کہتے ہیں کہ کرشن چندر بہ حیثیت افسانہ نگار جتنے ہمہ گیر، وسیع النظر اور عظیم دانشور تھے، بہ حیثیت انسان اتنے ہی عاجز اور معصوم فطرت انسان تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوشی سے ناچنے لگتے تھے۔

کرشن چندر منٹو کے بعد اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار تھے اور انھیں اردو کا چیخوف کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مصنف کے مطابق وہ قلم کا استعمال عبادت سمجھ کر کرتے رہے۔ اُن کی نثر کی تعریف کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ ان کی نثر پر شاعری کا گمان ہوتا ہے۔

کرشن چندر رنگ و نسل اور دین دھرم کی قیود سے نکل کر انسانیت پرستی کے جذبات کا پرچار کرتے ہیں۔ مصنف

اپنے تعلق کے حوالے سے کہتے ہیں کہ: کرشن چندر کے ساتھ ان کی سرسری ملاقاتیں اور کچھ خط و کتابت تھی۔ مصنف اپنے ادبی جریدے 'سنگِ میل' کے لیے افسانے کا تقاضا بھی کرتے رہے، مگر وہ مسلسل معذرت خواہانہ جواب ارسال کرتے رہے۔ پھر جب مصنف نے افسانہ طلب کرنا چھوڑ دیا، تو ایک دن اچانک انھوں نے ایک تازہ افسانہ ارسال کر دیا اور ساتھ ہی خط بھی لکھا، جس میں ان کی ناراضی کو بجا کہا۔ شروع میں وہ اپنا نام کرشن چندر ایم اے لکھتے تھے، جس پر مصنف نے انھیں مشورہ دیا کہ اپنے نام کے ساتھ ایم اے لکھنا چھوڑ دیں، کیوں کہ یہ ڈگریاں چھوٹی اور کرشن چندر کی شخصیت بڑی تھی۔ تاہم اس خط کے بعد بھی کافی عرصہ وہ نام کے ساتھ ایم اے لکھتے رہے اور پھر کہیں جا کر اسے ترک کر دیا۔

کرشن چندر چوں کہ طبعاً ظرافت پسند تھے، لہٰذا انھوں نے لکھنے کی ابتدا طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہی سے کی۔ 'گدھے کی سرگزشت' اور 'گدھے کی واپسی' بھی اسی شوق کو پورا کرنے کے لیے لکھے۔ مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا نے ان پر کڑی تنقید کرتے ہوئے 'گدھے کا خط کرشن چندر کے نام' لکھا، مگر وہ اس پر ناراض نہ ہوئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک دوست جس کا نام پرویز شاہد تھا، کو شرارت سے شاہد پرویز ی لکھ دیا۔ جب وہ ناراض ہوئے، تو کہنے لگے: بھئی! غلطی ہوگئی معاف کر دو یا پھر مجھے چرشن کندر کہہ دو۔ ان کے ہم عصر افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک بھی اُن سے ناراض ہو جاتے، تو وہ انھیں بھی بہت عاجزی کے ساتھ منا لیتے۔

کرشن چندر عوام میں بہت مقبول تھے۔ ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بِک جاتیں۔ رائلٹی سے لاکھوں کی کمائی کی، لیکن اپنے لیے ایک رہائشی مکان تک نہ بنا سکے۔ دوست نوازی اور غریب پروری خوب کی۔ وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے صرف خواب دیکھے۔ انسانوں کی برابری کا خواب، ظلم کے خاتمے کا خواب اور انسانوں کے اخلاص کا خواب۔ یہ خواب جھوٹے رہے، مگر یہ خواب کرشن چندر کو بہت عزیز تھے۔ فنکار کے لیے اچھا انسان ہونا ضروری ہے اور کرشن چندر عظیم فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم انسان بھی تھے۔

۴.۳ اقتباس کی تشریح

اقتباس: ''میں اسے باقاعدگی سے پرچہ.......................ایک سال کی سزا بھگت رہا تھا''

سبق کا نام: کرشن چندر

مصنف کا نام: فارغ بخاری

تشریح: فارغ بخاری، کرشن چندر کو اپنا ادبی جریدہ 'سنگِ میل' بھیجا کرتے تھے اور ساتھ ہی انھیں اپنا افسانہ بھیجنے

کا مطالبہ بھی کرتے تھے۔ جواباً کرشن چندر پرچے کی خوب تعریف کرتے، مگر افسانہ نہ بھیجتے۔ اقتباس میں وہ کہتے ہیں کہ میں انھیں تسلسل کے ساتھ 'سنگِ میل'' بھیجتا رہا اور ساتھ ہی افسانہ ارسال کرنے کا مطالبہ بھی کرتا رہا، جس کے جواب میں وہ معذرت نامے بھیجتے رہے اور وعدے بھی کرتے رہے۔ کچھ عرصے بعد مصنف نے پرچہ بھیجنا، تو جاری رکھا، مگر خط لکھنا بند کر دیا۔ خط موصول نہ کر کے وہ مصنف کی ناراضی کو سمجھ گئے اور اچانک اپنا ایک تازہ افسانہ بھیج دیا۔ اس افسانے کے ساتھ انھوں نے ایک خط بھی منسلک کیا، جس میں نہ صرف شرمندگی کا اظہار کیا، بل کہ مصنف کے ناراض ہونے کو حق بہ جانب قرار دیتے ہوئے معافی طلب کی، مگر شاید کرشن چندر کے افسانے کا 'سنگِ میل' میں شائع ہونا لکھا ہی نہیں تھا۔ جریدہ احتساب کے زیرِ عتاب آ کر بند ہو چکا تھا اور مصنف سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل کی چار دیواری میں ایک سال کی سزا کاٹ رہے تھے۔

خود آزمائی

۱۔ خالی جگہ پر کریں۔

الف۔ .... بھی غالب کے قصیدے کی طرح کسی کو راس نہیں آتی۔

ب۔ انکو بھی شہرت کی .... لگ گئی ہے۔

ج۔ پہلے زندگی کو .... سے تشبیہ دیتے تھے۔

د۔ .... کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو۔

ہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی .... ہو جائے۔

و۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ .... رہے ہیں۔

ز۔ آگے ناتھ نہ پیچھے ....

ح۔ بان صاحب اور چمک دار ہو کر کالی .... ہو گیا تھا۔

ط۔ مولوی صاحب کو اصلاحات وضع کرنے کا خاص .... تھا۔

ی۔ مولوی صاحب کیا مرے زبان اردو کا ایک .... گر گیا۔

ک۔ کرشن مہاراج .... چراتے تھے۔

ل۔ ہارٹ اٹیک کے بعد ڈاکٹروں نے .... بند کر دیا۔

م۔ ہر تخلیق کار، ہر تعمیر کار ہمارے نزدیک .... ہے۔

ن۔ کرشن چندر کی طبیعت میں .... کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

س۔ فن کار کو محض .... ہونا کافی نہیں۔

ع۔ ملتے کہاں ہیں ایسے .... لوگ

ف۔ لاہور آ کر .... کو نہ دیکھا تو کیا دیکھا۔

ص۔ علامہ اقبال بہت .... زندگی بسر کرتے تھے۔

ق۔ ولایت جانے سے پہلے .... کا عام لباس پہنتے تھے۔

ر۔ وہ کھانا کم کھاتے مگر ہمیشہ .... کھاتے تھے۔

ش۔ پلاؤ اور کباب انہیں بہت .... تھے۔

ت۔ پھلوں میں صرف .... سے رغبت تھی۔

ث۔ اردو شاعری کو ان .... نے کھویا۔

خ۔ .... ان کا پرانا نوکر تھا۔

۲۔ مختصر جواب دیں۔

الف۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی چار مشہور تصانیف کے نام لکھیں۔

ب۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں کا خاص وصف کیا ہے؟

ج۔ فرحت اللہ بیگ پہلی بار مولوی صاحب سے کہاں ملے؟

د۔ مولوی وحید الدین سلیم کا سراپا تحریر کریں۔

ہ۔ 'آ ڈگے ناتھ نہ پیچھے پگا' کا مفہوم واضح کریں۔

و۔ مولوی صاحب کے گھر کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

ز۔ فارغ بخاری کو کرشن چندر کے خاکے کا عنوان دینے میں کیا مشکل پیش آتی ہے۔

ح۔ منٹو نے احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کو افسانے میں کیا مقام دیا تھا؟

ط۔ کرشن چندر کے خاکے کا نام 'ان داتا' کیوں رکھا گیا؟

ی۔ نوجوان کا افسانہ پڑھنے پر کرشن چندر کا کیا ردعمل تھا؟

ک۔ سنگ میل کے سرحد نمبر کے بارے میں کرشن چندر کی کیا رائے تھی؟

ل۔ چراغ حسن حسرت نے علاّمہ اقبال کی کوٹھی کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا؟

م۔ علاّمہ اقبال کی محفل میں کن موضوعات پر گفتگو ہوئی؟

ن۔ علاّمہ اقبال کے ملنے والوں میں کس قسم کے لوگ شامل تھے؟

س۔ علاّمہ اقبال کس قسم کا لباس پہنتے تھے؟

ع۔ کھانے میں علاّمہ اقبال کو کیا پسند تھا؟

ف۔ اردو مشاعروں کے بارے میں علاّمہ اقبال کی کیا رائے تھی؟

ص۔ علی بخش کی مونچھوں کی رنگت کے بارے میں علاّمہ اقبال نے کیا فرمایا؟

ق۔ رسولِ اکرمؐ کا نام لیتے وقت علاّمہ اقبال کی کیا حالت ہوتی تھی؟

۳۔ غلط اور درست فقرات الگ کریں۔

الف۔ مولوی وحید الدین سلیم بہت فضول خرچ تھے۔	غلط	درست
ب۔ مولوی سلیم کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔	غلط	درست
ج۔ منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو اردو افسانے کا شہنشاہ لکھا ہے۔	غلط	درست
د۔ کرشن چندر کی مثال افسانوی ادب میں تاج محل تخلیق کرنے والے فن کار کی ہے۔	غلط	درست
ہ۔ کرشن چندر منٹو کے بعد اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔	غلط	درست
و۔ کرشن چندر نے 'سنگ میل' رسالے کے لیے کئی افسانے بھیجے۔	غلط	درست
ز۔ کرشن چندر کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔	غلط	درست
ح۔ علی بخش علاّمہ اقبال کا پرانا نوکر تھا۔	غلط	درست
ط۔ علاّمہ اقبال کسی کے خط کا جواب نہ دیتے تھے۔	غلط	درست

یونٹ نمبر......۵

طنز و مزاح

تحریر: امجد اقبال
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

فہرستِ مضامین

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

اس یونٹ میں آپ پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی کے دو مزاحیہ مضامین کا مطالعہ کریں گے۔ دونوں مزاح نگار اپنے فکری رویوں کے اعتبار سے اردو ادب کی تاریخ میں منفرد اور ممتاز ہیں۔ مزاح پطرس بخاری سے پہلے بھی لکھا گیا اور یوسفی صاحب کے بعد بھی لکھا جا رہا ہے، لیکن ان دونوں لکھنے والوں نے مزاحیہ ادب کو جو فکری اور معنوی جمالیات عطا کی ہے، وہ کم لکھنے والوں کے حصے میں آتی ہے۔ 'پطرس کے مضامین' کی اشاعت کے ساتھ ہی خالص مزاح کی جس روایت کا آغاز ہوا، اس کی ارتقائی صورت ہمیں یوسفی کی کتابوں میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ دونوں مزاح نگار اپنے اسلوب کی چاشنی اور جاذبیت کے حوالے سے بھی منفرد اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی کے سوانحی کوائف سے آگاہ ہوسکیں۔

۲۔ پطرس بخاری کے مضامین 'لاہور کا جغرافیہ' کے بین السطور مزاح کی جو چاشنی موجود ہے، اس سے متعارف ہوسکیں۔

۳۔ یوسفی صاحب کے مضمون 'جنونِ لطیفہ' کے اسلوبیاتی آہنگ، مزاح اور زبان اور اسلوب کی شگفتگی اور تازہ کاری سے روشناس ہوسکیں۔

۱۔ پطرس بخاری

اردو زبان و ادب میں پطرس بخاری کے نام سے پہچانے جانے والے اس عظیم مزاح نگار کا اصل نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ وہ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور کے پرنسپل ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء میں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب تعینات ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں کولمبیا یونی ورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انگریزی، اردو، پشتو، فارسی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ہدایت کاری کے علاوہ غیر ملکی ڈراموں کے اردو تراجم بھی کیے، جن میں برنارڈ شا کے ڈراموں کے تراجم خاصے کی چیزیں ہیں۔ ان تمام کارناموں کے ساتھ ساتھ انھیں جو عزت، مقام، مرتبہ اور قدر و قیمت اپنے مزاحیہ مضامین کے مجموعے 'پطرس کے مضامین' کی بدولت حاصل ہوئی، وہ روزِ اوّل سے آج تک قائم و دائم ہے۔ اس مجموعے میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں، جو حقیقت میں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان لکھتے ہیں: ''اُن کی اِن مزاحیہ تحریروں میں ہمیں خالص مزاح کی نہایت ہی نکھری ہوئی اور شستہ صورتیں ملتی ہیں۔ یہ ایسے مزاح کی مثال ہے، جو کسی طنز و تعریض اور تمسخر سے پاک نظر آتا ہے۔ شاید اسی لیے یہ تحریریں کسی کا دل جلانے اور تحقیر کا احساس دلانے کا باعث نہیں بنتیں، بلکہ ان سے پھوٹنے والا مزاح اور ہنسی، زندگی کی ڈھیر ساری ناگواریوں کے خلاف ایک فطری مدافعت بنتا ہے۔ یہی اس مجموعے کا جواز بھی ہے۔''

پطرس بخاری کے مزاح کی خصوصیات میں زبان و بیان کا شستہ اور شائستہ استعمال، افسانویت، انگریزی ادبیات اور اسلوب کے اثرات، تحریف نگاری، واقعاتی مزاح، محاورات کا برجستہ استعمال اور کردار نگاری وغیرہ نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے پطرس بخاری کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے: ''پطرس کا کام کھیل دکھانا ہے۔ لفظوں کا کھیل، فقروں کا کھیل، چست جملوں کا کھیل۔ وٹ (wit) کا کھیل کھیلتا ہے، مگر یہ اس کا خاص کھیل نہیں۔ اس کا کھیل پک کا کھیل ہے۔ موقعوں کا کھیل، ڈرامائی حالات کا کھیل، ہر مضمون یہی کھیل دکھاتا ہے۔''

اپنی تحریروں سے لوگوں کے لبوں پر شگفتگی کے پھول کھلانے والے، پطرس بخاری ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نیویارک میں فوت ہوئے۔

1.1 لاہور کا جغرافیہ [متن]:

تمہید:

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ کُرے کو دائیں سے بائیں گھمایئے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے، پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقامِ انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں یہ نام کُرے پر مرقوم ہو، وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر، مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ: لاہور لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا، تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع:

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے، لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے، وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے، اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔ لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں، لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسطِ ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ:

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا، لیکن طلبہ کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اس کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ

ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا، جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے، جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے، لیکن ہر ورم موادِ فاسد سے بھرا ہوا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے، جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا:

لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں، جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں، بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی، اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں، بلکہ جہاں تک ہو سکے، کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کے بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں، جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانیِ آب کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں، ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہے، اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلّے کا اپنا ایک دریا ہوگا، جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی، جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں، چنانچہ کمیٹی

نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے، لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں، تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

ذرائعِ آمد و رفت:

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کو یہاں کے ذرائعِ آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہییں، تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے، جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا رد و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں، جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا اٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہی، تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں میں انھی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دم دار تارے سے ملتا ہے، کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے، تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

قابلِ دید مقامات:

لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں

دہریں بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے، جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں، مثلاً: 'اہلِ لاہور کو مژدہ' اچھا اور سستا مال' اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے، جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں، مثلاً: 'گریجویٹ درزی ہاؤس' یا 'سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع' یا 'کہتی ہے تم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا'۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائریکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتا درج ہے۔ بائیں طرف حافظے کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اُوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کی فلم کے محاسن گنوار کھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلابِ عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے، اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں، یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چار پائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹنے تک وہاں اہلِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جارہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بحروفِ جلی ''محمد علی دندان ساز'' لکھا ہے، وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔

صنعت وحرفت:

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی ہے اور سب سے بڑی حرفت جہاں ''بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال ہے''۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ ''خالص گھی کی مٹھائی'' امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ ''کرشنا بیوٹی کریم'' شالا مار باغ کو اور ''کھانسی کا مجرب نسخہ'' جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبروں میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو

بہت فروغ نصیب ہوتا ہے اور فنِ تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں، اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کرتے ہیں۔ چونکہ انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں، اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے، سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمحِ نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے، جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار:

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں، جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبہ کی کئی قسمیں ہیں، جن میں سے چند مشہور ہیں: قسمِ اول جمالی کہلاتی ہے، یہ طلبہ عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں، بعدازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد کسی سنیما اور سنیما کے گرد و نواح میں:

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں، لیکن سب کی تصاویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبہ کی ہے، ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے، اس لیے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی، اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبہ کی ہے۔ یہ اکثر روپ، اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر بآوازِ بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش اور نفسیات کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحتِ جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے علی الصبح پانچ چھے ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں، لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبہ کی ہے۔ یہ طلبہ کی خالص ترین قسم ہے، ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔

کتابیں امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے، جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے، اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے۔ تعلیم، نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں، جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبہ کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے، لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں، تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں، جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات:

لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

۱.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

براہین	دلائل، نشانیاں، ثبوت
مقامِ انقطاع	ملنے کی جگہ
اہلِ سیف	جنگ جو
یدطولیٰ	اپنی مثال آپ
مفادِ عامہ	عوام کا فائدہ
بہم رسانیِ آب	پانی کی دست یابی
کماحقہ	مکمل طور پر
مبہم	سمجھ میں نہ آنے والا
مژدہ	خوش خبری
چشم زدن	فوراً
وثوق	یقین

مطمحِ نظر	مقصد
دبازت	دھوپ
دساور	بیرونِ ملک
جود وسخا	سخاوت
انا	نوکرانی
خوش طبع	خوش مزاج

۱.۴ خلاصہ:

پطرس بخاری نے مزاحیہ انداز میں لاہور شہر کے بڑھتے ہوئے مسائل کو موضوع بنایا ہے کہ لاہور شہر اب اتنا زیادہ پھیلتا چلا جا رہا ہے کہ اس کے حدود اربعے کا تعین بھی مشکل ہو چکا ہے۔ تاریخی حوالے سے لاہور پر دو ہی راستوں سے یلغار ہوئی، ایک اس سے جو دلّی سے آتا تھا اور دوسرا جو پشاور سے۔ لاہور شہر کی وسعت کے منصوبے اس تیزی سے معرض وجود میں آ رہے ہیں کہ دس بیس سال کے اندر پنجاب دارالحکومت ہوگا اور لاہور ایک صوبہ۔

آب و ہوا کو موضوع بناتے ہوئے پطرس نے طنز کیا ہے کہ صنعتی پھیلاؤ نے لاہور شہر کی آب و ہوا کو شدید متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ لاہور اب آب و ہوا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میونسپلٹی نے ان کے مطالبے اور خواہش کو جائز قرار دیا ہے۔ سارا لاہور گرد و غبار اور دھوئیں سے گھرا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ صاف پینے اور استعمال کے پانی کی دست یابی بھی ایک خواب ہے۔ کمیٹی نے پانی کے نل تو لگا دیے، لیکن ان میں پانی نام کی کوئی شے نہیں۔ گویا آب و ہوا کی آلودگی کے ساتھ ساتھ صاف پانی کی دست یابی لاہور کا اہم مسئلہ ہے، جو عدم توجہی کا شکار ہے۔

ذرائع آمد و رفت میں سڑکیں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پطرس بتاتے ہیں کہ لاہور کی تاریخی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے سڑکوں کی حالت وہی رکھی گئی ہے، جو شیر شاہ سوری کے زمانے کی تھی۔ لاہور کے گھوڑوں کو سواری کے لیے تو استعمال کیا جاتا ہی ہے، تاہم خوراک کے لیے بھی یہی گھوڑے استعمال میں آتے ہیں۔ لاہور کی خوب صورتی کو داغ دار کرنے اور گہنانے میں سب سے اہم کردار دیواروں پر لگے اشتہارات کا ہے۔ پطرس نے ان نامعقول اور نامناسب اشتہارات کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اہلِ لاہور کی ایک اور بے حسی کہ انھوں نے اردو زبان و ادب کے مشاہیر کو بھی یاد نہیں رکھا اور اب کھانے پینے کی اشیا، دوائیوں اور مٹھائیوں کی دکانوں کی بھرمار ہے اور پھر اپنا اپنا الو سیدھا کرنے کے

لیے ہر ایک نے اپنی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ پیداوار کے حوالے سے پطرس نے طلبہ کو سب سے اہم پیداوار قرار دیا ہے۔ ان طلبہ کو: جمالی، جلالی، خیالی اور خالی طلبہ میں تقسیم کر دیا ہے، تاہم پانچویں قسم کے طلبہ بھی لاہور کی رونق بنتے چلے جا رہے ہیں۔

۱.۴ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا............... لاہور کا نام تلاش کیجیے''۔

سبق کا نام: لاہور کا جغرافیہ

مصنف کا نام: پطرس بخاری

تشریح:

پطرس بخاری نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں لاہور شہر کے بارے بتایا ہے کہ لاہور شہر کو دنیا کے نقشے پہ اُبھرے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ گویا لاہور ایک قدیم شہر ہے، سو قاری کو اس کے متعلق خود ہی معلوم ہونا چاہیے یا پھر دنیا کے نقشے کو کسی سمت گھمائیں، تو کسی عرض البلد یا طول البلد کے ملنے والے مقامات پر لاہور کا تاریخی شہر واقع ہے۔ پطرس بخاری نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں آج بھی ان چیزوں اور شہروں کے متعلق بالکل سامنے کی وہ باتیں بتائی اور سکھائی جاتی ہیں، جنھیں ہر کوئی جانتا ہے۔ لاہور شہر اپنے مخصوص مزاج، ثقافت، کھانوں، آب و ہوا اور رہن سہن کے باعث ہر پاکستانی کا جانا پہچانا شہر ہے۔ اس طرح یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مصنف کو سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہید میں لاہور شہر کے متعلق ہمیں کون سی اور کس قسم کی معلومات بہم پہنچائے، کیوں کہ: لاہور تو لاہور ہے۔

اقتباس:

''بہم رسانی آب کے لیے ایک سکیم...... شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔''

سبق کا نام: لاہور کا جغرافیہ

مصنف کا نام: پطرس بخاری

تشریح:

پطرس بخاری نے میٹروپولٹن شہر لاہور کے متعدد مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا کہ اہلِ لاہور کو اکثر پانی کی عدم دستیابی کی پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن انتظامیہ اس عوامی مسئلے کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتی اور نہ ہی دورِ حاضر کی ضروریات کے مطابق اس کا انتظام کرتی ہے۔ مختلف منصوبے زیرِ غور لائے جاتے ہیں، لیکن وہ صرف کاغذی کارروائی تک ہی محدود رہتے ہیں، عملی طور پر کچھ نہیں کیا جاتا۔ انتظامیہ کے حیلے بہانوں اور پانی کی دستیابی کے متعلق توجہ نہ دینے اور کسی ٹھوس منصوبے کا آغاز نہ کرنے کو پطرس نے طنزیہ انداز میں بتایا ہے کہ سقے کا نظام رائج کرنے کے بارے میں غور ہو رہا ہے، لیکن جدید شہر کے لیے اس قدیم ترین نظام کو بھی رائج کرنے میں عرصہ لگے گا، گویا لاہور انتظامیہ عوام کے لیے پانی کی دستیابی کے مسئلے کو حل ہی نہیں کرنا چاہتی۔ نااہلی اور سستی کی انتہا یہ ہے کہ بارش کے پانی کو زیرِ استعمال لایا جائے گا، یعنی ایک طرف تو اہلِ لاہور پانی کو ترستے ہیں، تو دوسری طرف المیہ یہ ہے کہ جب کبھی بارش ہو جائے، تو پھر نکاسیِ آب کا بھی خاطر خواہ انتظام موجود نہیں۔

خود آزمائی:

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیں۔

الف۔ پطرس کے مطابق پنجاب اب پنج آب، کیوں نہیں رہا؟

ب۔ پطرس نے لاہور تک پہنچنے کے کتنے اور کون کون سے رستے بتائے ہیں؟

ج۔ ہوا کی قلت پہ قابو پانے کے لیے اہلِ لاہور کو کیا ہدایت کی گئی؟

د۔ بہم رسانیِ آب کی کون سی سکیم کمیٹی کے زیرِ غور تھی؟

ہ۔ پطرس نے لاہور کی مرکزی سڑک کی حالت کس طرح بیان کی؟

و۔ لاہور کے قابلِ دید مقامات کے ملنے میں کیا دشواری پیش آتی ہے؟

ز۔ پطرس نے لاہور کی سب سے بڑی صنعت اور حرفت کسے کہا ہے؟

ح۔ پطرس کے خیال میں لاہور کی سب سے اہم پیداوار کیا ہے؟

ط۔ پطرس نے جمالی، جلالی، خیالی اور خالی طلبہ کی کیا وضاحت کی ہے؟

۲۔ درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف۔ 'لاہور کا جغرافیہ' کس نے لکھا ہے؟ (پطرس بخاری، مشتاق یوسفی، ابن انشاء)

ب۔ لاہور تک پہنچنے کے مشہور راستے کتنے ہیں؟ (دو، تین، چار)

ج۔ پطرس کے مطابق: لاہور کے چاروں طرف کیا واقع ہے؟ (کھیت، عمارتیں، لاہور)

د۔ بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس کس چیز کی قلت ہے؟ (فنڈز، افرادی قوت، ہوا)

ہ۔ لاہور کے بازاروں میں بل کھاتی ہوئی سڑک کس نے بنائی؟

(ظہیر الدین بابر، شاہ جہاں، شیر شاہ سوری)

۳۔ درست اور غلط جملوں کی نشان دہی کریں۔

الف۔ سبق لاہور کا جغرافیہ ایک افسانہ ہے۔ غلط/درست

ب۔ وسطِ ایشیا سے آنے والے حملہ آور اہلِ سیف کہلاتے ہیں۔ غلط/درست

ج۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس برس کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا۔ غلط/درست

د۔ اصلی اور خالص گھوڑے سواری کے کام آتے ہیں۔ غلط/درست

ہ۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔ غلط/درست

۴۔ خالی جگہ پُر کریں۔

الف۔ لاہور تک پہنچنے کے .... رستے ہیں۔

ب۔ کہتے ہیں: کسی زمانے میں لاہور کا .... بھی ہوا کرتا تھا۔

ج۔ بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس .... کی قلت ہے۔

د۔ بناسپتی گھوڑا شکل وصورت میں .... سے ملتا ہے۔

ہ۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً .... ہوتا ہے۔

و۔ لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک .... موجود ہے۔

ز۔ لاہور کے لوگ بہت .... ہیں۔

۲۔ مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی ۴ اگست ۱۹۲۳ء کو ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا تعلق جے پور سے تھا۔ ددھیال کی طرف سے یوسف زئی پٹھان اور ننھیال کی طرف سے راٹھور راجپوت ہیں۔ ابتدائی تعلیم جے پور میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے فلسفے کے مضمون میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ مشتاق احمد یوسفی نے عملی زندگی کا آغاز پراونشل سول سروس میں ملازمت سے کیا۔ ۱۹۴۹ء تک ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور بینکاری کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ مسلم کمرشل بینک، یونائٹڈ بینک کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہنے کے علاوہ پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین بھی رہے۔ اس کے علاوہ متعدد قومی اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

مشتاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب 'چراغ تلے' ۱۹۶۱ء میں، دوسری حاکم بدہن ۱۹۷۰ء میں، تیسری زرگزشت ۱۹۷۶ء میں اور چوتھی کتاب 'آب گم' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔

مشتاق احمد یوسفی اردو ادب کے وہ صاحبِ طرز طنز و مزاح نگار ہیں، جنھوں نے طنز اور مزاح کو ایک خاص رنگ اور آہنگ سے آشنا کیا۔ بلا شبہ اس طنزیہ و مزاحیہ اندازِ تحریر میں شگفتگی اور شائستگی کے ساتھ جو کاٹ اور تیکھا پن سطر سطر اور جملے جملے میں جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، وہ آج اردو ادب کے کم ہی لکھاریوں اور تخلیق کاروں کو ودیعت ہوا ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ مشتاق احمد یوسفی نے ادب میں اسلوبِ تحریر کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں پائی جانے والی ادبیت، ذہانت، برجستگی، شائستگی اور دیگر خصوصیات کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے کہ ہم اردو ادب کے عہدِ یوسفی میں زندہ ہیں۔

۲.۱ جنونِ لطیفہ [متن]:

بڑا مبارک دن ہوتا ہے، وہ دن جب کوئی نیا خانساماں گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک وہ دن، جب وہ چلا جائے۔ چونکہ ایسے مبارک دن سال میں کئی بار آتے ہیں اور تلخیِ کام و دہن کی آزمائش کر کے گزر جاتے ہیں، اس لیے اطمینان کا سانس لینا، بقولِ شاعر: صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے:

اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بدذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے، لیکن ہم اعداد و شمار سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پیشہ ور خانساماں اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ سے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔ اسی وجہ سے پچھلے سو برسوں سے یہ فن کوئی ترقی نہیں کر سکا۔ ایک دن ہم نے اپنے دوست مرزا عبدالودود بیگ سے شکایتاً کہا کہ اب وہ خانساماں جو ستر قسم کے پلاؤ پکا سکتے تھے، من حیث الجماعت رفتہ رفتہ نا پید ہوتے جا رہے ہیں۔ جواب میں انھوں نے بالکل الٹی بات کہی۔

کہنے لگے: "خانساماں وانساماں غائب نہیں ہو رہے، بلکہ غائب ہو رہا ہے وہ ستر قسم کے پلاؤ کھانے والا طبقہ، جو بٹلر اور خانساماں رکھتا ہے اور ارد کی دال بھی ڈنر جیکٹ پہن کر کھاتا ہے۔ اب اس وضع دار طبقے کے افراد باورچی نوکر رکھنے کے بجائے نکاحِ ثانی کر لیتے ہیں، اس لیے کہ گیا گزرا باورچی بھی روٹی کپڑا اور تنخواہ مانگتا ہے، جب کہ منکوحہ فقط روٹی کپڑے پر ہی راضی ہو جاتی ہے، بلکہ اکثر و بیشتر کھانے اور پکانے کے برتن بھی ساتھ لاتی ہے۔

مرزا اکثر کہتے ہیں کہ خود کام کرنا بہت آسان ہے، مگر دوسروں سے کام لینا بہت دشوار۔ بالکل اس طرح جیسے خود مرنے کے لیے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن دوسروں کو مرنے پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ معمولی سپاہی اور جرنیل میں یہی فرق ہے۔ اب اسے ہماری سخت گیری کہیے یا نا اہلی یا کچھ اور کہ کوئی خانساماں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹکتا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ہنڈیا اگر شبراتی نے چڑھائی، تو بگھار رمضانی نے دیا اور دال بلاقی خاں نے بانٹی۔ ممکن ہے مذکور الصدر حضرات اپنی صفائی میں یہ کہیں کہ:

ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں!

لہٰذا ہم تفصیلات سے احتراز کریں گے، حالاں کہ دل ضرور چاہتا ہے کہ ذرا تفصیل کے ساتھ من جملہ دیگر مشکلات کے، اس سراسیمگی کو بیان کریں، جو اس وقت محسوس ہوتی ہے، جب ہم سے از روئے حساب یہ دریافت کرنے کو کہا جائے کہ اگر ایک نوکر کی ۳۱ دن کی تنخواہ ۳۰ روپے اور کھانا ہے، تو ۹ گھنٹے کی تنخواہ بغیر کھانے کے کیا ہوگی؟ ایسے نازک موقع پر ہم نے سوال کو آسان کرنے کی نیت سے اکثر یہ معقول تجویز پیش کی کہ اس کو پہلے کھانا کھلا دیا جائے، لیکن اول تو وہ اس پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتا۔ دوم: کھانا تیار ہونے میں ابھی پورا سوا گھنٹا باقی ہے اور اس سے آپ کو بھی اصولاً اتفاق ہوگا کہ ۹ گھنٹے کی اُجرت کا حساب ساڑھے دس گھنٹے کے مقابلے میں پھر بھی آسان ہے۔

ہم داد کے خواہاں ہیں، نہ انصاف کے طالب۔ کچھ تو اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہے، وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلیں اور کچھ اس ڈر سے کہ:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مقصد سرِ دست ان خانساماؤں کا تعارف کرانا ہے، جن کی دامے درمے خدمت کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے۔ اگر ہمارے لہجے میں کہیں تلخی جھلک آئے، تو اسے تلخیِ کام و دہن پر محمول کرتے ہوئے، خانساماؤں کو معاف فرمائیں۔

خانساماں سے عہدِ وفا استوار کرنے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا ڈھنگ کوئی مرزا عبدالودود بیگ سے سیکھے۔ یوں تو ان کی صورت ہی ایسی ہے کہ ہر کس و ناکس کا بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن ایک دن ہم نے دیکھا کہ اُن کا دیرینہ باورچی بھی اُن سے ابے تبے کر کے باتیں کر رہا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ شرفا میں یہ اندازِ گفتگو محض مخلص دوستوں کے ساتھ روا ہے۔ جہلا سے ہمیشہ سنجیدہ گفتگو کی جاتی ہے۔ ہم نے مرزا کی توجہ اس امر کی طرف دلائی، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کو اتنا منہ زور اور بدتمیز کر دیا ہے کہ اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گزر نہیں ہو سکتی۔

کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آ نکلا اور آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا، پھر سابق خانساماؤں کے پتے دریافت کیے، نیز یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی؟ باتوں باتوں میں انھوں نے یہ عندیہ بھی لینے کی کوشش کی کہ ہم ہفتے میں کتنی دفعہ باہر مدعو ہوتے ہیں اور باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ہمارے اعصاب اور اخلاق پر کیا اثر امرتب ہوتا ہے؟ ایک شرط انھوں نے یہ بھی لگائی کہ اگر آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر جائیں گے، تو پہلے 'عوضی مالک' پیش کرنا پڑے گا۔

کافی ردو کد کے بعد ہمیں یوں محسوس ہونے لگا، جیسے وہ ہم میں وہی خوبیاں تلاش کر رہے ہیں، جو ہم اُن میں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی ختم ہوئی اور کام کے اوقات کا سوال آیا، تو ہم نے کہا: اصولاً ہمیں محنتی آدمی پسند ہیں۔ خود بیگم صاحبہ صبح پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک گھر کے کام کاج میں جتی رہتی ہیں۔ کہنے لگے: ''صاحب! ان کی بات چھوڑیے، وہ گھر کی مالک ہیں، میں تو نوکر ہوں۔'' ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ: برتن نہیں مانجھوں گا؛ جھاڑو نہیں دوں گا؛ ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا؛ میز نہیں لگاؤں گا؛ دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔

ہم نے گھبرا کر پوچھا: ''پھر کیا کرو گے؟''

''یہ تو آپ بتائیے۔ کام آپ کو لینا ہے، میں تو تابع دار ہوں۔''

جب سب باتیں حسبِ منشا و ضرورت (ضرورت ہماری، منشا ان کی) طے ہو گئیں، تو ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا

کہ: بھئی! سودا سلف لانے کے لیے فی الحال کوئی علیحدہ نوکر نہیں ہے، اس لیے کچھ دن تمھیں سودا بھی لانا پڑے گا، تنخواہ طے کرلو۔

فرمایا: ''جناب! تنخواہ کی فکر نہ کیجیے، پڑھا لکھا آدمی ہوں، کم تنخواہ میں بھی خوش رہوں گا۔''

''پھر بھی؟''

کہنے لگے: ''پچھتر روپے ماہوار ہوگی، لیکن اگر سودا بھی مجھی کو لانا پڑا، تو چالیس روپے ہوگی۔''

ان کے بعد ایک ڈھنگ کا خانساماں آیا، مگر بے حد دماغ دار معلوم ہوتا تھا، ہم نے اس کا پانی اُتارنے کی غرض سے پوچھا: ''مغلئی اور انگریزی کھانے آتے ہیں؟''

''ہر قسم کا کھانا پکا سکتا ہوں، حضور کا کس علاقے سے تعلق تھا؟''

ہم نے صحیح صحیح بتا دیا۔ جھوم ہی تو گئے۔ کہنے لگے: ''میں بھی ایک سال اُدھر کاٹ چکا ہوں، وہاں کے باجرے کی کھچڑی کی، تو دور دور دھوم ہے۔''

مزید جرح کی ہم میں تاب نہ تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنے آپ کو ہمارے ہاں ملازم رکھ لیا۔ دوسرے دن پڈنگ بناتے ہوئے انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ میں نے بارہ سال انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، اس لیے اکڑوں بیٹھ کر چولھا نہیں جھونکوں گا۔ مجبوراً کھڑے ہو کر پکانے کا چولھا بنوایا۔

ان کے بعد جو خانساماں آیا، اس نے کہا کہ میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاؤں گا، مگر برادے کی انگیٹھی پر۔ چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔ تیسرے کے لیے چکنی مٹی کا چولھا بنوانا پڑا۔ چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولھا خریدا اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولھے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔

اس ظالم کا نام یاد نہیں آرہا۔ البتہ صورت اور خدوخال اب تک یاد ہیں۔ ابتدائے ملازمت سے ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا، بلکہ پابندی سے ملباری ہوٹل میں اکڑوں بیٹھ کر دو پیسے کی چیٹ پٹی دال اور ایک آنے کی تنوری روٹی کھاتا ہے۔

آخر ایک دن ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے ذرا سختی سے ٹوکا کہ: ''گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

تنک کر بولا: ''صاحب! ہاتھ بیچا ہے، زبان نہیں بیچی!''

اس نے نہایت مختصر، مگر غیر مبہم الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اگر اسے اپنے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے پر مجبور کیا گیا، تو وہ فوراً استعفادے دے گا۔ اس کے رویے سے ہمیں بھی شبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی خراب کھانا پکاتا ہے، نیز ہم اس منطقی نتیجے

پر پہنچے کہ دوزخ میں گنہگار عورتوں کو ان کے اپنے پکائے ہوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے؛ اسی طرح ریڈیو والوں کو فرشتے آتشیں گرز مار مار کر بار بار ان ہی کے نشر کیے ہوئے پروگراموں کے ریکارڈ سنائیں گے۔

ہم کھانے کے شوقین ہیں، خوشامد کے بھوکے نہیں (گو کہ اس سے انکار نہیں کہ اپنی تعریف سُن کر ہمیں بھی اپنا بنیان تنگ معلوم ہونے لگتا ہے)۔ ہم نے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ باورچی کھانا پکانے کے بجائے ہمارے گُن گاتا رہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے اپنے مرحوم اور سابق آقاؤں کا کلمہ پڑھتا رہے، جب کہ اس توصیف کا اصل مقصد ہمیں جلانا اور ان خوبیوں کی طرف توجہ دلانا ہو، جو ہم میں نہیں ہیں۔ اکثر اوقات بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ کاش ہم بھی مرحوم ہوتے، تاکہ ہمارا ذکر بھی اتنے ہی پیار سے ہوتا۔ بعض نہایت قابل خانساماؤں کو محض اس دوراندیشی کی بنا پر علاحدہ کرنا پڑا کہ آئندہ وہ کسی اور کا نمک کھا کر ہمارے حق میں پروپیگنڈا کرتے رہیں۔ جو شخص بھی آتا ہے، یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے سابق آقا نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا (یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ اصولی طور پر ہم خود بھی ہمیشہ دوسروں پر بھروسا کرتے ہیں، لیکن ریزگاری ضرور گن لیتے ہیں۔) ایک خانساماں نے ہمیں مطلع کیا کہ اس کا پچھلا 'صاب' اس قدر شریف آدمی تھا کہ ٹھیک سے گالی تک نہیں دے سکتا تھا؟''

ہم نے جل کر کہا: ''پھر تم نے نوکری کیوں چھوڑی؟''

تڑپ کر بولے: ''کون کہتا ہے کہ خدا بخش نے نوکری چھوڑی؟ قصہ دراصل یہ ہے کہ میری پانچ مہینے کی تنخواہ چڑھ گئی تھی اور اب آپ سے کیا پردہ؟ سچ تو یہ ہے کہ ان کے گھر کا خرچ بھی میں ردی اخبار اور بیئر کی خالی بوتلیں بیچ کر چلا رہا تھا۔ انھوں نے کبھی حساب نہیں مانگا۔ پھر انھوں نے ایک دن میری صورت دیکھ کر کہا کہ: 'خدا بخش! تم بہت تھک گئے ہو، دو دن کی چھٹی کرو اور اپنی صحت بناؤ۔ دو دن بعد جب میں صحت بنا کر لوٹا، تو گھر خالی پایا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ: تمھارا صاحب تو پرسوں ہی سارا سامان باندھ کر کہیں اور چلا گیا۔ یہ قصہ سنانے کے بعد اس نمک حلال نے ہم سے پیشگی تنخواہ مانگی، تاکہ اپنے سابق آقا کے مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔

گزشتہ سال ہمارے حال پر رحم کھا کر ایک کرم فرما نے ایک تجربہ کار خانساماں بھیجا، جو ہر علاقے کے کھانے پکانا جانتا تھا۔ ہم نے کہا: ''بھئی! اور تو سب ٹھیک ہے، مگر تم سات مہینے میں دس ملازمتیں چھوڑ چکے ہو، کیا بات ہے؟'' کہنے لگے: ''صاحب! آج کل وفادار مالک کہاں ملتا ہے؟''

اس ستم ایجاد کی بدولت برِصغیر کے ہر خطے، بلکہ ہر تحصیل کے کھانے کی خوبیاں اس ہیچ مداں پنبہ دہاں کے دسترخوان پر سمٹ کر آ گئیں، مثلاً: دوپہر کے کھانے پر دیکھا کہ شوربے میں مسلم کیری ہچکولے لے رہی ہے اور سالن اس

قدرترش ہے کہ آنکھیں بند ہو جائیں اور اگر بند ہوں، تو پٹ سے کھل جائیں۔ پوچھا، تو انھوں نے آگاہی بخشی کہ: دکن میں رؤسا کھٹا سالن کھاتے ہیں اور ہم یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ اللہ جانے بقیہ لوگ کیا کھاتے ہوں گے۔

اسی دن شام کو ہم نے گھبرا کر پوچھا کہ دال میں پرانے جوتوں کی سی بو کیوں آرہی ہے؟ جواب میں انھوں نے دھواں دھار تقریر کی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ مارواڑی سیٹھوں کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کا راز ہینگ میں مضمر ہے۔

اور دوسرے دن جب ہم دریافت کیا کہ بندۂ خدا یہ چپاتی ہے یا دستر خوان؟ تو ہنس کر بولے کہ وطنِ مالوف میں روٹی کے حدودِ اربع یہی ہوتے ہیں۔

آخر کئی فاقوں کے بعد ایک دن ہم نے بہ نظر حوصلہ افزائی کہا: "آج تم نے چاولوں کا اچار بہت اچھا بنایا ہے۔" دہکتے ہوئے توے سے بیڑی سلگاتے ہوئے بولے: "بندہ پروری ہے! کاٹھیاواڑی پلاؤ میں قورمے کے مسالے پڑتے ہیں!"

"خوب! مگر یہ قورمے کا مزہ تو نہیں!"

"وہاں قورمے میں اچار کا مسالا ڈالتے ہیں!"

پھر ایک دن شام کے کھانے پر مرزا نے ناک سکیڑ کر کہا: "میاں! کیا کھیر میں کھٹملوں کا بگھار دیا ہے؟" سفید دیوار پر کوئلے سے سودے کا حساب لکھتے ہوئے حقارت سے بولے: "آپ کو معلوم نہیں؟ شاہانِ اودھ لگی ہوئی فیرنی کھاتے تھے؟"

"مگر تم نے دیکھا کہ کیا انجام ہوا اودھ کی سلطنت کا؟"

مختصر یہ کہ ڈیڑھ مہینے تک وہ صبح و شام ہمارے ناپختہ ذوق و ذائقہ کو سنوارتا اور مشروبات و ماکولات سے وسیع المشربی کا درس دیتا رہا۔ آخر آخر میں مرزا کو شبہ ہو چلا تھا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے، جو سالن کے ذریعے صوبائی غلط فہمیاں پھیلا رہا ہے۔

اگر آپ کو کھانا بے حد مرغوب ہے، جو چھڑائے نہیں چھوٹتا، تو تازہ واردانِ بساطِ مطبخ اس مشکل کو فوراً آسان کر دیں گے۔ اشیائے خوردنی اور انسانی معدے کے ساتھ بھرپور تجربے کرنے کی جو آزادی باورچیوں کو حاصل ہے، وہ نت نئی کیمیاوی ایجادات کی ضامن ہے۔ مثال کے طور ہمیں بھنڈی بہت پسند ہے، لیکن دس گھنٹے قبل یہ منکشف ہوا کہ اس نباتِ تازہ کو ایک خاص درجۂ حرارت پر پانی کی مقررہ مقدار میں (جس کا علم صرف ہمارے خانساماں کو ہے) میٹھی آنچ پر پکایا جائے، تو اس مرکب سے دفتروں میں لفافے اور بدلگام افسروں کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کیے جا سکتے ہیں۔

انھی حضرت نے گزشتہ جمعرات کو سارا گھر سر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے بچی کو بھیجا کہ اس سے کہو کہ مہمان بیٹھے ہیں ،اس وقت سل کھوٹنے کی ضرورت نہیں ۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ہم ان مہمانوں کی تواضع کے لیے سل پر کبابوں کا قیمہ پیس رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کباب منہ میں رکھا، تو محسوس ہوا گویا چٹ پٹا ریگ مال کھا رہے ہیں اور ہمیں رہ رہ کر میر صاحب پر رشک آنے لگا کہ وہ مصنوعی بتیسی لگائے بے خبر بیٹھے کھا رہے ہیں اور ہماری طرح کرکرا محسوس کر کے لال پیلے نہیں ہوئے۔

یہ بات نہیں کہ خدانخواستہ ہم بیماری اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہم تو پرانی چال کے آدمی ہیں۔ اس لیے نئی زندگی سے زیادہ خوف کھاتے ہیں۔ موت برحق ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ اسے بلانے کے لیے ہم اپنی نیک کمائی میں سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں کسی مرض ناشناس حکیم کے ہاتھوں مرنے پر بھی چنداں اعتراض نہ ہوگا، لیکن ہم کسی صورت خانساماں کو بالاقساط روح قبض کرنے کا اختیار نہیں دینا چاہتے کہ یہ صرف حکیم ڈاکٹروں کا حق ہے۔

بیماری کا ذکر چلا، تو اس قومی ہیکل خانساماں کا قصہ بھی سُن لیجیے، جس کو ہم سب آغا کہا کرتے تھے (آغا اس لیے کہا کرتے تھے کہ وہ سچ مچ آغا تھا)، ان کا خیال آتے ہی معدے میں مہتابیاں سی جل اٹھتی ہیں۔ تادمِ وداع ان کے کھانے پکانے اور کھلانے کا انداز وہی رہا، جو ملازمت سے پہلے ہینگ بیچنے کا ہوتا تھا، یعنی ڈرا دھمکا کر اس خوبیاں منوا لیتے تھے۔ بالعموم صبح ناشتے کے بعد سو کر اٹھتے تھے۔ کچھ دن ہم نے صبح تڑکے جگانے کی کوشش کی، لیکن جب انھوں نے نیند کی آڑ میں ہاتھا پائی کرنے کی کوشش کی، تو ہم نے بھی ان کی اصلاح کا خیال ترک کر دیا۔ اس سے قطع نظر وہ کافی تابع دار تھے۔ تابع دار سے ہماری مراد یہ ہے کہ کبھی وہ پوچھتے کہ چائے لاؤں؟ اور ہم تکلفانہ کہتے کہ: جی چاہے، تو لے آؤ، ورنہ نہیں، تو کبھی واقعی لے آتے اور کبھی نہیں لاتے تھے۔ جس دن سے انھوں نے باورچی خانہ سنبھالا، گھر میں حکیم ڈاکٹروں کی ریل پیل ہونے لگی۔ یوں بھی اُن کا پکایا ہوا کھانا دیکھ کر سر (اپنا) پیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ 'اپنا' اس لیے، حالانکہ ہم سب ہی ان کے کھانوں سے عاجز تھے، لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیوں کر پُر امن طریق سے رخصت کیا جائے۔ ان کو نوکر رکھنا ایسا ہی ثابت ہوا، جیسے کوئی شیر ببر پر سوار تو ہو جائے، لیکن اُترنے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔

ایک دن ہم سی اڈھیر بن میں لیٹے ہوئے گرم پانی کی بوتل سے پیٹ سینک رہے تھے اور دوا پی پی کر ان کو کوس رہے تھے کہ وہ سر جھکائے آئے اور خلاف معمول ہاتھ جوڑ کر بولے: ''خو! صاحب! تم روز روز بیمار اوتا اے۔ اس سے امارا قبیلہ میں بڑا رسوائی، خو، خانہ خراب اوتا اے'' (صاحب! تم روز روز بیمار ہوتے ہو۔ اس سے ہمارے قبیلے میں ہماری

رسوائی ہوتی ہے اور ہمارا خانہ خراب ہوتا ہے)۔ اس کے بعد انھوں نے کہا سنا معاف کرایا اور بغیر تنخواہ لیے چل دیے۔

ایسی ہی ایک اور دعوت کا ذکر ہے، جس میں چند احباب اور افسرانِ بالا دست مدعو تھے۔ نئے خانساماں نے جو قورمہ پکایا، اس میں شوربے کا یہ عالم تھا کہ ناک پکڑ کے غوطے لگائیں، تو شاید کوئی بوٹی ہاتھ آجائے۔ اِکا دُکا کہیں نظر آ بھی جاتی، تو کچھ اس طرح کہ:

صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں

اور یہ غنیمت تھا، کیوں کہ مہمان کہ منہ میں پہنچنے کے بعد، غالب کے الفاظ میں، یہ کیفیت تھی کہ:

کھینچتا ہے جس قدر اتنی ہی کھنچتی جائے ہے!

دورانِ ضیافت احباب نے بکمالِ سنجیدگی مشورہ دیا کہ: ''ریفریجریٹر خریدلو۔ روز روز کی جھک جھک سے نجات مل جائی گے۔ بس ایک دن لذیذ کھانا پکوالو اور ہفتے بھر ٹھاٹ سے کھاؤ اور کھلاؤ۔''

قسطوں پر ریفریجریٹر خریدنے کے بعد ہمیں واقعی بڑا فرق محسوس ہوا اور وہ فرق یہ ہے کہ پہلے جو بدمزہ کھانا صرف ایک ہی وقت کھاتے تھے، اب اسے ہفتے بھر کھانا پڑتا ہے۔

ہم نے اس عذابِ مسلسل کی شکایت کی، تو وہی احباب تلقین فرمانے لگے کہ: ''جب خرچ کیا ہے صبر بھی کرو، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

کل پھر مرزا سے اپنی گوناگوں مشکلات کا ذکر کیا، تو کہنے لگے: ''یہ الجھنیں آپ نے اپنے چٹورپن سے خواہ مخواہ پیدا کر رکھی ہیں، ورنہ سادہ غذا اور اعلیٰ خیالات سے یہ مسئلہ کبھی کا خود بخود حل ہوگیا ہوتا۔ یہی آئینِ قدرت ہے اور یہی آزاد تہذیب کی اساس بھی! آپ نے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا وہ پاکیزہ شعر نہیں پڑھا؟

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

عرض کیا: '' مجھے کسی کے آزاد رہنے پر، خواہ وہ شاعری ہی کیوں نہ ہو، کوئی اعتراض نہیں، لیکن اس شعر پر مجھے عرصے سے یہ اعتراض ہے کہ اس میں آزادی سے زیادہ خشک روٹی کی تعریف کی گئی ہے۔ ممکن ہے عمدہ غذا اعلیٰ تہذیب کو جنم نہ دے سکے، لیکن اعلیٰ تہذیب کبھی خراب غذا برداشت نہیں کرسکتی۔''

فرمایا: ''برداشت کی ایک ہی رہی! خراب کھانا کھا کے بدمزہ نہ ہونا، یہی شرافت کی دلیل ہے۔''

گزارش ہے: ''مردانگی تو یہ ہے کہ آدمی عرصے تک عمدہ غذا کھائے اور شرافت کے جامے سے باہر نہ ہو۔''

مشتعل ہو گئے "بجا! لیکن یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آدمی اٹھتے بیٹھتے کھانے کا ذکر کرتا رہے۔ بُرا نہ مانیے گا، آپ کے بعض مضامین کسی بگڑے ہوئے شاہی رکاب دار کی خاندانی بیاض معلوم ہوتے ہیں، جبھی تو کم پڑھی لکھی عورتیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔"

ہم نے ٹوکا: "آپ بھول رہے ہیں کہ فرانس میں کھانا کھانے اور پکانے کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔"

وہ بگڑ گئے: "مگر آپ نے تو اسے جنونِ لطیفہ کا درجہ دے رکھا ہے۔ اگر آپ واقعی اپنی بے قصور قوم کی اصلاح کے درپے ہیں، تو کوئی کام کی بات کیجیے اور ترقی کی راہیں سجھایئے۔"

مزہ لینے کی خاطر چھیڑا: "ایک دفعہ قوم کو اچھا پہننے اور کھانے کا چسکا لگ گیا، تو ترقی کی راہیں خود بخود سوجھ جائیں گی۔

۲.۲ مشکل الفاظ کے معانی:

تلخیِ کام و دہن	منہ کی تلخی۔ منہ کا بدذائقہ ہونا
من حیث الجماعت	پوری جماعت
نکاحِ ثانی	دوسرا نکاح
منکوحہ	نکاح میں آئی ہوئی عورت
خستۂ تیغِ ستم	ظلم کی تلوار کا زخمی مراد مظلوم
سرِ دست	فوری طور پر، پہلے، اولاً
عندیہ	رضامندی
ردو کد	ٹال مٹول، بحث و تمحیص
احتراز	بچنا۔ رکنا
من جملہ	تمام کے تمام۔ سب کے سب
سراسیمگی	بدحواسی۔ پریشانی
از روئے حساب	حساب کے مطابق
حسب منشا	مرضی کے مطابق

دوراندیشی	عقل مندی۔ دور کی سوچ رکھنا
لبِ لباب	حاصل۔ خلاصہ
مشروبات وماکولات	کھانے پینے کا سامان
وسیع المشربی	کشادہ دلی، بے تعصبی
تازہ واردانِ بساطِ مطبخ	نئے باورچی، باورچی خانے میں نئے داخل ہونے والے
قوی ہیکل	بڑے جسم کا۔ مضبوط اور توانا
تادمِ وداع	رخصت تک، وقت رخصت
دورانِ ضیافت	دعوت میں۔ کھانے کی دعوت میں
ہیچ مداں پنبہ دہاں	عاجز اور خاموش

۲.۳ خلاصہ:

جنونِ لطیفہ میں مشتاق احمد یوسفی نے نہایت دل چسپ اور مزاح سے بھرپور انداز میں خانساموں کی مختلف اقسام پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ایک اچھا، سمجھ دار اور بہتر کھانا پکانے والے خانسامے کا ملنا کتنا مشکل کام ہے؟ یہی وجہ ہے کہ خانسامے کا جانا اور پھر نئے کا آنا، دونوں باعثِ مسرت ہوتے ہیں۔ بد ذائقہ کھانا پکانے کا ہنر نہ صرف تعلیم یافتہ بیگمات کا خاصا ہے، بلکہ پیشہ ور خانسامے بھی اس کام میں کسی سے پیچھے نہیں۔ مضمون نگار نے جب شکایت کی کہ قسم قسم کے خوش ذائقہ کھانا پکانے والے خانسامے ناپید ہو رہے ہے، تو مرزا عبدالودود بیگ نے جواباً چونکا دیا کہ: خانسامے غائب نہیں ہو رہے، بلکہ وہ طبقہ ختم ہوتا چلا جا رہا ہے، جو کھانے میں روایت پسند تھا، لیکن آج یہ وضع دار طبقہ باورچی رکھنے کی بجائے دوسرا نکاح کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

کوئی خانساماں ہفتہ دس دن سے زیادہ نہیں ٹکتا اور مضمون نگار کو تو خاص طور پر اس وقت زیادہ مشکل پیش آتی ہے، جب کسی خانسامے کی تنخواہ وغیرہ کا حساب کرنا پڑے۔ گویا یہ بھی ایک فن جس میں دسترس حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ خانسامے کے انتخاب اور چناؤ میں ہمیشہ ہی یہ مشکل پیش آئی کہ ہر خانسامے کے اپنے ناز نخرے تھے۔ خانسامے کو رام کرنے کے حوالے سے مرزا عبدالودود بیگ نے یہ طریقہ دریافت کیا کہ خانسامے کو اس حد تک منہ زور اور بدتمیز کر دو کہ کسی دوسرے گھر میں اس کا گزارا ہی نہ ہو۔ زیادہ دن نہیں گزرے ہوں کہ ایک خانساماں ملازمت کی غرض

سے آیا، تو الٹا مضمون نگار کا انٹرویو شروع کر دیا اور مختلف شرائط میں سے ایک یہ بھی رکھی کہ جب آپ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جائیں گے، تو اپنی غیر موجودگی میں 'عوضی مالک' بھی پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ برتن نہ مانجھنے؛ جھاڑو نہ دینے اور ایش ٹرے صاف نہ کرنے کے ساتھ ساتھ میز نہ لگانے اور دعوتوں میں ہاتھ نہ دھلوانے کی شرائط بھی عائد کر دیں اور جب مضمون نگار نے اس کی تمام شرائط مان کر سودا سلف لانے کے کام کا کہا، تو پچھتر روپے ماہوار کی بجائے چالیس روپے ماہوار پر بھی راضی ہو گیا۔

اس کے بعد ایک اور خانساماں آیا، جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر خطے کے اور ہر قسم کے کھانے پکانے میں طاق ہے۔ اس کے بعد مختلف خانساماں آئے، جنھوں نے چولھے کی ساخت اور سائز پر اعتراضات کیے۔ ایک خانسامے سے جب مضمون نگار نے دریافت کیا کہ تم گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے، تو بولا: ''صاحب! ہاتھ بیچا ہے زبان نہیں''! گویا اس نے تنبیہ کر دی کہ اگر اس کے اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کی پابندی لگائی گئی، تو وہ استعفا دے دے گا۔ ایک اور خانسامے سے جب مضمون نگار نے نوکری چھوڑنے پر استفسار کیا، تو جواب ملا کہ: بے چارے مالک پر پانچ ماہ کی تنخواہ چڑھ گئی۔ ایک دن بولے: 'خدا بخش! دو دن چھٹی کرو اور صحت بناؤ''۔ دو دن بعد جب آیا، تو وہ صاحب گھر چھوڑ کر ہی جا چکے تھے۔ ایک اور خانساماں آسا، جس نے شکوہ کیا کہ آج کل وفادار مالک کا ملنا بھی کتنا مشکل ہے؟ پھر ایک قوی ہیکل خانسامے کا تذکرہ ہے کہ ان کے ڈیل ڈول اور رویے سے سبھی خوف کھاتے تھے اور وہ حضرت بھی دھونس دھاندلی سے کھانے کی خوبیاں منوا لیتے تھے، لیکن ان کے کھانوں کی وجہ سے ڈاکٹروں کے مزے ہو گئے، لیکن مضمون نگار کی قسمت اچھی تھی کہ ایک دن خود ہی آ کر بولے: ''صاحب! تم روز بیمار ہو جاتے ہو، اس سے ہماری رسوائی ہو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خود ہی رخصت ہو گئے۔

یہ تو حال تھا خانسامے رکھنے کی مشکلات اور پیچیدگیوں کا اور پھر کسی نے مشورہ دیا کہ ریفریجر خرید لو اور ہفتہ بھر کا کھانا پکوا کر اس میں رکھ لیا کرو۔ ہم نے دوستوں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ فرانس میں کھانا کھانے اور پکانے کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے، مگر انھوں نے جواباً بگڑ کر کہا کہ: آپ نے تو اسے 'جنونِ لطیفہ' کا درجہ دے رکھا ہے۔

۲.۴ اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ......... بالکل الٹی بات کہی''۔

سبق کا نام: جنونِ لطیفہ

مصنف کا نام: مشتاق احمد یوسفی

تشریح: مشتاق احمد یوسفی نے بڑے دل چسپ انداز میں خانساماں برادری کے نقائص بیان کیے ہیں کہ ایک تو انھیں کھانا پکانے کا ڈھنگ ہی نہیں، پھر جو پکاتے ہیں، وہ بھی بدمزہ اور ذائقے سے عاری۔ یہ پیشہ ور خانساماں کھانے پکانے میں کسی بھی لحاظ سے تعلیم یافتہ بیگمات سے پیچھے نہیں۔ جس طرح تعلیم یافتہ بیگمات کے ناز نخرے تو بے شمار ہوتے ہیں، لیکن گھر گرہستی سے ان کا دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا، اسی طرح یہ پیشہ ور خانسامے کھانا پکانے کی کوئی خاص تربیت وغیرہ تو لیتے نہیں اور اس زعمِ باطل میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان سے بہتر کھانے پکانے کا ماہر اور اس ہنر میں طاق روئے زمیں پر کوئی دوسرا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب خاندانی اور اعلیٰ پائے کے خانسامے ناپید ہونے کی شکایت کی گئی، تو مرزا عبدالودود بیگ نے اس شکایت کے بالکل متضاد جواب دیا کہ: خانسامے ناپید نہیں ہو رہے، بلکہ وہ مہذب اور متمدن لوگ عنقا ہو رہے ہیں، جو کھانے کے آداب سے واقف تھے اور دستر خوان پہ بھی تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

اقتباس کی تشریح:

اقتباس: ''ایک دن ہم اسی ادھیڑ بن..........بغیر تنخواہ لیے چل دیے۔''

سبق کا نام: جنونِ لطیفہ

مصنف کا نام: مشتاق احمد یوسفی

تشریح:

آغا جیسے نک چڑھے اور تنک مزاج خانسامے سے نجات پانا از حد دشوار ہو رہا تھا۔ گھر کا ہر فرد کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ جس سے آغا پُرامن طریقے سے رخصت ہو جائے، لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ ایک دن وہ خود ہی مضمون نگار کے پاس شرمندہ شرمندہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ مضمون نگار اس وقت پیٹ درد کی دوا لے کر اسی کو کوس رہے تھے کہ وہ بولا: جناب! آپ کے روز بیمار ہونے سے خاندان میں ہماری رسوائی ہو رہی ہے، اس لیے کہا سنا معاف کرو، کیوں کہ ہم یہاں نوکری نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ کر بغیر تنخواہ لیے ہی رخصت ہو گئے۔ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ وہ اپنے بدذائقہ ،غیر معیاری کھانا پکانے اور اپنے غیر مہذب رویے پہ شرمندہ نہ تھا، بلکہ اس کی وجہ سے سارے گھر والے بیماریوں میں مبتلا ہو رہے تھے۔ یہ بھی قصور انھیں کے سر ڈال دیا کہ سب کے بیمار ہونے سے اس کی بدنامی ہو رہی ہے، گویا کھانا وہ بہت

معیاری اور خوش ذائقہ بناتا ہے، لیکن فرق ہے تو مالکوں میں، جس کی وجہ سے وہ نوکری چھوڑنے پہ مجبور ہے۔

خود آزمائی:

۱۔ مختصر جواب دیں۔

الف۔ مضمون نگار کو کن دو موقعوں پر اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوتا ہے؟

ب۔ مضمون نگار کے مطابق معمولی سپاہی اور جرنیل میں کیا فرق ہے؟

ج۔ مرزا عبدالودود بیگ نے اپنے خانسامے کو منہ زور اور بدتمیز کیوں کر دیا تھا؟

د۔ مڈل فیل خانسامے نے کس طرح کا انٹرویو دیا؟

ہ۔ یوسفی کے مطابق: دوزخ میں گنہگار عورتوں اور ریڈیو والوں سے کیا سلوک کیا جائے گا؟

و۔ خدا بخش نے نوکری چھوڑنے کی کیا وجہ بتائی؟

ز۔ آغا کا کھانے پکانے اور کھلانے کا انداز کیا تھا؟

ح۔ آغا نے ملازمت چھوڑنے کی وجہ کیا بتائی؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں۔

الف۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بدذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف.......... بیگمات کو آتا ہے۔

ب۔ اب وضع دار طبقے کے افراد باورچی نوکر رکھنے کے بجائے.......... کر لیتے ہیں۔

ج۔ ہم داد کے خواہاں ہیں، نہ انصاف کے..........

د۔ جہلا سے ہمیشہ.......... گفتگو کی جاتی ہے۔

ہ۔ اس ظالم کا نام یاد نہیں آ رہا، البتہ صورت اور.......... اب تک یاد ہیں۔

و۔ ہم کھانے کے شوقین ہیں.......... کے بھوکے نہیں۔

ز۔ صاحب! آج کل وفادار.......... کہاں ملتا ہے؟

۳۔ درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف۔ جنونِ لطیفہ کس کا لکھا ہوا مزاحیہ مضمون ہے؟ (پطرس بخاری، فرحت اللہ بیگ، مشتاق احمد یوسفی)

ب۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ.......... کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے۔ (خوش

ذائقہ، بدذائقہ، معیاری)

ج۔ خود مرنے کے لیے کسی خاص .... کی ضرورت نہیں پڑتی۔ (قابلیت، دشمن، ہتھیار)

د۔ ایک شرط انھوں نے یہ لگائی کہ اگر آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر جائیں گے، تو پہلے ...... پیش کرنا پڑے گا۔ (موجودہ مالک، سفری ٹکٹ، تحریری دعوتی کارڈ)

ہ۔ تنک کر بولا: 'صاحب! ہاتھ بیچا ہے .... نہیں بیچی'۔ (انا، زبان)

و۔ دوپہر کے کھانے پر دیکھا شوربے میں مسلم .... ہچکولے لے رہی ہے۔ (کیری، مرغی، بکرے کی ران)

ز۔ یہ الجھنیں آپ نے اپنے .... سے خواہ مخواہ پیدا کر رکھی ہیں۔ (ٹھاٹ باٹ، چٹورپن، غلط رویے)

ح۔ خراب کھانا کھا کے بدمزہ نہ ہونا یہی .... کی دلیل ہے۔ (خاموشی، بُزدلی، شرافت)

۴۔ درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف۔ 'جنونِ لطیفہ' مشتاق احمد یوسفی کی کتاب 'چراغ تلے' سے لیا گیا مزاحیہ مضمون ہے۔

ب۔ یوسفی کو خانسامے کی تلاش میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

ج۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ: اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔

د۔ مرزا اکثر کہتے ہیں کہ: خود کام کرنا بہت دشوار ہے، مگر دوسروں سے کام لینا بہت آسان۔

ہ۔ مارواڑی سیٹھوں کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کا راز ہینگ میں مضمر ہے۔

و۔ جس دن سے انھوں نے باورچی خانہ سنبھالا، گھر میں مہمانوں کی ریل پیل ہونے لگی۔

ز۔ دورانِ ضیافت احباب نے بکمال سنجیدگی مشورہ دیا کہ ریفریجریٹر خرید لو۔

ح۔ فرانس میں کھانا کھانے اور پکانے کا شمار جنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔

یونٹ نمبر......٦

غزل

تحریر: ڈاکٹر نثار ترابی
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

فہرستِ مضامین

۸.۱۔ غزل
۸.۲۔ تشریحات
☆ خودآزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس یونٹ میں آپ مختلف شاعروں کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔ غزل: جو اردو شاعری کی سب سے اہم صنف ہے، اپنے اندر فکر و خیال اور جذبہ و احساس کی ایک پوری روایت سموئے ہوئے ہے۔ اس صنفِ سخن کا فکری اور معنوی دائرہ اس قدر وسعت آشنا ہے کہ کائنات کے تمام تر مسائل اور انسانی زندگی کے ممکنہ تجربات اور مشاہدات اس کے آنگن میں اُتر آئے ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو غزل کن کن فکری مسائل اور معاملات سے گزرتی ہے، اس یونٹ میں شامل غزلیں ان مسائل و معاملات کی گرہ کشائی میں معاون ہیں۔ مختلف فکری رویوں کے نمایندہ غزل گوؤں کی ایک ایک غزل نمونے کے طور پر دی گئی ہے، تاکہ ان کے مطالعاتی افادات سے غزل کی روایت سے آگاہی ہو سکے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ بیسویں صدی کے اہم اور نمایندہ غزل گوؤں کے احوال و آثار سے آگاہ ہو سکیں۔

۲۔ غزل کی تفہیم میں لفظوں کی علامتی معنویت کا ادراک کر سکیں۔

۳۔ غزل کے بین السطور جذبے اور خیال کی جو رعنائی موجود ہوتی ہے، اس کی تفہیم کر سکیں۔

۱۔ علامہ محمد اقبال

ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام شیخ نور محمد تھا۔ ان کے خاندان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد نے تجارت کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا اور انھیں لوگ ایک نہایت ایماندار، متقی اور پرہیزگار شخص کے طور پر جانتے اور مانتے تھے۔

علامہ اقبال ابتدائی تعلیم دینی مکتب سے حاصل کرنے کے بعد سکاچ مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور یہاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف اے کا امتحان مرے کالج سیالکوٹ سے پاس کیا۔ بی اے اور ایم اے (فلسفہ) کے امتحانات گورنمنٹ کالج لاہور پاس کیے۔ سیالکوٹ میں تعلیم کے دوران ان کو مولوی میر حسن جیسے عظیم استاد کی شاگردی کا شرف بھی نصیب ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اورینٹل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان روانہ ہوگئے۔ وہاں کیمرج یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ ازاں بعد جرمنی گئے، جہاں سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ قانون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ بار ایٹ لا کا امتحان لندن سے پاس کیا اور ۱۹۰۸ میں وطن واپس پہنچے۔ وطن واپس آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے، مگر کچھ عرصے کے بعد لاہور ہی میں وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس دوران سخن گوئی کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۹۲۲ء میں انھیں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے 'سر' کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے منعقدہ الٰہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کے قیام کا تصور پیش کیا۔ اسی بنا پر آپ کو تصورِ پاکستان کے خالق کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے دوبار یورپ کا سفر اختیار کیا۔ حکومتِ افغانستان کی دعوت پر افغانستان بھی گئے۔

زندگی کے آخری پانچ برسوں میں شاعرِ مشرق کی صحت خراب رہی۔ وہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انھیں بادشاہی مسجد لاہور کے پہلو میں دفنایا گیا۔

ان کی تصانیف میں: 'بانگ درا'، 'بالِ جبریل'، 'ضربِ کلیم'، 'اسرارِ خودی'، 'رموزِ بے خودی'، 'پیامِ مشرق'، 'زبورِ عجم'، 'جاوید نامہ'، 'پس چہ باید کرد' اور 'ارمغانِ حجاز' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ محمد اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ایک پیغام اور دعوتِ فکر و عمل ہے۔ یہ عرفانِ ذات کا پتا دیتی ہے اور خودی کی تعمیر کے لیے عشق کے لازوال جذبے کو لازمی قرار دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی قوت بخش شاعری

ہے، جس کے پڑھنے سے انسان میں فکر و عمل کا احساس جاگتا ہے۔ کلامِ اقبال نے برِصغیر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے ترقی اور آزادی کی راہ پر گامزن کیا۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کو عشق و محبت، گل و بلبل، طاؤس و رباب اور زلف و رخسار جیسے روایتی دائرے کا پابند نہیں بنایا، بلکہ ان کلاسیکی علامات و استعارات سے ایسے مضامین اور خیالات کی جلوہ گری دکھائی، جو اُردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار متعارف ہوئے۔ نظم اور غزل ہر دو اصناف کے موضوعاتی اور فکری دھارے کو نئے امکانات سے روشن کیا۔ ان کے انقلابی اندازِ فکر نے امتِ مسلمہ کے اندر انقلابی روح بیدار کر دی۔ انھوں نے اُردو اور فارسی میں عظیم شاعری تخلیق کی، کیونکہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک عظیم مفکر اور ایسے سیاسی و ملی راہنما تھے، جو امتِ مسلمہ کے امراض کی تشخیص ایک ماہر طبیب کی طرح کرنا جانتے تھے اور اُس کا شافی علاج تجویز کرنے پر بھی قادر تھے۔

ایک مذہبی گھرانے میں ذہنی و فکری تربیت حاصل کرنے کی بنا پر ان کے اندر عشقِ محمدؐ کی ایک ایسی شمع روشن ہو گئی تھی، جس نے ساری عمر ان کو نہال و مسرور رکھا۔

اقبال کی غزل نے اُردو غزل کے قدیم پیمانوں کو بدلا؛ اس کی لفظیات اور لب و لہجے میں تبدیلی پیدا کی؛ طرزِ احساس اور طرزِ ادا میں نیا رنگ بھرا؛ حیات پرور اور حیات آفریں تغزل کی ابتدا کی؛ کشمکشِ حیات میں جینے کا نیا ولولہ بخشا؛ اُردو شاعری کو نئے تصورات عطا کیے؛ اچھوتی اور نادر تشبیہات اور تراکیب دیں۔ بطور غزل گو ان کا جُداگانہ اسلوب اپنی مثال آپ ہے۔ اس اندازِ اسلوب کی پیروی تو کئی شعرا نے کی، مگر ایسا فنی پیرائیہ اور فکری سر بلندی کا معیار کہیں اور دیکھنے میں نہ آسکا۔

اقبال کی شاعری رفعتِ خیال اور ندرتِ اظہار کی امین ہے۔ زبان و بیان کے فن کارانہ استعمال میں اقبال کا کلام اپنے عہد کے دیگر شعرا کے مقابلے میں منفرد اور یکتا ہے۔ شاعر نے اپنی نظموں اور غزلوں میں جن الفاظ، اصطلاحات اور علامات کو برتا ہے اور جن معنوں میں برتا ہے، وہ اُردو کی شعری روایت میں بالکل نئی اور منفرد چیز ہے۔ یہ ایک امتیازی فنی و فکری روّیہ تھا، جس نے برِصغیر میں، خصوصاً پاکستان میں ایک دبستاں کی بنیاد قائم کی اور جس کے اثرات بعد کی کئی نسلوں تک منتقل ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اقبال کی شاعری اسلامی طرزِ فکر کی نمائندہ ہے اور وہ اسی طرزِ فکر کو دنیا اور آخرت میں نجات کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

۱.۲ غزل

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نُور نہیں

علم میں بھی سُرور ہے، لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حُور نہیں

کیا غضب ہے کہ اِس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سُرور نہیں

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ! وہ دل کہ ناصبور نہیں

بے حضوری ہے تیری موت کا راز
زندہ ہو تو، تو بے حضور نہیں

۱.۳ تشریحات:

شعر نمبر ا:

لغت: آستاں (چوکھٹ، دہلیز)، حضور (حاضر ہونا، حضوری میں آجانا، موجود ہونا)

تشریح: زیرِ مطالعہ شعر میں اقبال عشق کے مقابلے میں عقل کو کم تر اور ناقص قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل اگرچہ آستانۂ محبوب سے زیادہ دُور نہیں ہے، مگر اس کے مقدر میں محبوب کی حاضری نہیں ہے (یہاں محبوب سے مراد حقیقی محبوب، یعنی اللہ تعالیٰ ہے، جس کی بارگاہ میں حضوری صرف عشق کے سچے جذبے ہی سے ممکن ہے۔ گویا

عقل جو بجا طور پر انسانی قوت ہے، انسان کی حقیقی راہنمائی سے عاجز ہے۔ عقل راہ کا چراغ تو ہے، منزل نہیں ہے۔ یہ ہمیں محبوب کے دروازے (چوکھٹ) تک تو لے جا سکتی ہے، مگر باریابی کا شرف اُس گہری قلبی وابستگی اور ایمان کے جذبے کی بدولت ہی ممکن ہے، جو عشق کی دین ہے۔ عقل: مخلوقات کے وجود سے خالق کا پتا لگا سکتی ہے، اُس ذات پاک کا دیدار نہیں کرا سکتی۔ علامہ اقبال نے اپنے مخصوص تصورِ عقل و عشق کو ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

عقل اشیا اور مظاہر کی ظاہری صورتوں کو سامنے لاتی ہے، جبکہ عشق باطنی اور روحانی کیفیات تک رسائی کا سامان پیدا کرتا ہے۔

شعر نمبر ۲:

دلِ بینا: (دیکھنے والا دل، ایسا دل جو حقیقت کا ادراک کر سکے)، طلب کرنا (مانگنا)، آنکھ کا نور (آنکھ کی بینائی)

تشریح: اقبال دل کو روشن کرنے پر زور دیتے ہیں اور دل کی حقیقی روشنی اسی صورت میں میسر آتی ہے، جب آنکھ حقیقی طور پر روشن ہو، کیونکہ محبوبِ حقیقی (خدا) کو دیکھنے کے لیے ظاہری آنکھ کی روشنی کام نہیں آتی۔ اس کے لیے دیکھنے والے دل کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ سے ایسی بصیرت کی دولت بھی مانگنی پڑتی ہے، جو دنیاوی کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو۔ دل کی روشنی: محبتِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے، جب ایسا دل (خدا کی بارگاہ سے) میسر آ جائے، تو ہر شے صاف دکھائی دینے لگتی ہے، کیونکہ شاعر کے نزدیک آنکھوں کی روشنی دل کی روشنی کے مقابلے میں کم تر ہے۔ آنکھوں کے نور کی اہمیت دیکھنے والے دل کی روشنی سے مشروط ہے۔ دراصل شاعر کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں صرف ظاہری چیزوں پر ہی انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ ظاہر بہر حال ظاہر ہوتا ہے، اصل شے اس ظاہر کے پس پردہ اس کی روح یا قوت ہے، جو عشق یا جذبے کی صورت میں اُبھرتی ہے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ سے حقیقی شعور یا ادراک طلب نہیں کریں گے، منزل مراد نہیں پا سکیں گے۔

شعر نمبر ۳:

لغت: سُرور۔ (لذت، ہلکا سا خوشی یا مستی کا نشہ)، حُور (جنت کی حسین مخلوق)

تشریح: علم ایک طرح سے لطف و لذت کا سبب تو بنتا ہے، اِس سے انسان کو سرخوشی تو حاصل ہوتی ہے، جس کی بدولت عارضی طور پر بندہ خود کو خوشی اور لذت کی کسی جنت میں محسوس کرتا ہے، مگر یہ سرور یا لذت اِس بات کی ضمانت نہیں کہ انسان حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ کسی چیز کا 'علم' بعض اوقات انسان کو بے مراد ہی رکھتا ہے، اِسی لیے شاعر نے اِسے ایسی جنت سے تعبیر کیا ہے، جو حور کے وجود سے خالی ہے۔ شاعر کے نزدیک علم سے مقصودِ حقیقی نہیں ملتا، اس سے محض دنیاوی حقائق کا ادراک کیا جا سکتا ہے؛ مشکلیں آسان بنائی جا سکتی ہیں، مگر انسان کا اصل مقصد اور حصول تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا عرفان ہے۔ خدا شناسی کی منزل پانے کے لیے جذبۂ عشق کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ اے بندے! اگر حصول کا اصلی نشہ اور حقیقی جنت کی آرزو ہے، تو وہ جنت حاصل کرنے کی کوشش کر، جو عشق سے عبارت ہے۔ عشق اور جذبۂ ایمان کو ظاہری علم پر ترجیح دیتے ہوئے ایک جگہ اقبال اپنے اِس تصور کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں:

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

شعر نمبر ۴:

لغت: صاحبِ سُرور (سُرور والا، یا سرور میں لانے والا)، کیا غضب ہے (کیا ستم ہے)

تشریح: دکھ کی بات ہے کہ امتِ مسلمہ قحط الرّجال کا شکار ہو کر رہ گئی ہے، کہیں کوئی ایک بھی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا، جسے حقیقی معنوں میں صاحبِ سُرور (صاحبِ کمال) کہا جا سکے۔ علّامہ اقبال کو دلی افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایسے دیدہ ور اب ختم ہو گئے ہیں، جن کے دلوں میں عشق کے جذبے کا سُرور ہو۔ انھیں اِس بات کا دکھ ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں اچھے، قابل اور صاحبِ کمال لوگوں کی کمی ہے۔ ایسے راہنما نہیں رہے، جو صحیح ملّی اور قومی جذبے سے سرشار ہو کر ملت کی ڈولتی ہوئی کشتی کو منزلِ مراد تک لے جانے کا کام کریں۔ وہ مردِ قلندر جن میں عشق و ایمان کی سرمستیاں اور ذوق و شوق کی سربلندیاں تھیں؛ جو سب کچھ قربان کر کے دین کی خدمت کرنے کو اپنا ایمان سمجھتے تھے، آج دنیا سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ 'کیا غضب' کے ساتھ شاعر کا اندرونی

مثال اُس ہی دردمندی کا نتیجہ ہے، جس کی بدولت اُنھیں بجا طور پر 'حکیم الامت' کا خطاب عطا ہوا ہے۔

شعر نمبر ۵:

لغت: جنوں (دیوانگی)، باشعور (ہوش وحواس رکھنے والا)

تشریح: جنوں، جسے دیوانگی کا نام دیا جاتا ہے، دراصل فرزانگی ہے کہ اسی جنوں کے جذبے کی بدولت دیوانوں نے دنیا میں عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔ لفظ 'جنوں' کو شاعر نے اُس بے پناہ لگن اور عزم حوصلے کے معنوں میں استعمال کیا ہے، جس سے بڑی بڑی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ شاعر نے زیرِ مطالعہ شعر میں دیوانگی کی دو حالتوں کا ذکر کیا ہے: ایک وہ، جس میں عشق پوری توانائی اور شدت سے سامنے آتا ہے اور ہوش وحواس بھی قائم رہتے ہیں، جبکہ دیوانگی کی دوسری حالت میں انسان شعور اور ہوش وحواس قائم نہیں رکھ سکتا اور نتیجتاً بے مراد رہتا ہے۔ شاعر نے دیوانگی، یعنی 'جنوں' کی پہلی حالت کو مقدم جانا ہے، جبکہ دوسری صورت میں چونکہ انسانی ہوش وحواس برقرار نہیں رہتے، لہٰذا اُسے بے شعوری کا اصل قرار دیا ہے۔

شعر نمبر ۶:

لغت: ناصبوری (بے صبری، بے قراری)، ناصبور (بے صبر، بے چین)

آہ! (افسوس کا کلمہ ہے۔)

تشریح: بے قراری اور بے صبری دل کے زندہ اور متحرک ہونے کی علامت ہے۔ جو دل اس کیفیت سے عاری ہیں، وہ مردہ ہیں۔ شاعر کے نزدیک بے قراری، بے چینی اور ایک مسلسل اضطراب کی حالت، زندگی کی علامت ہے، جبکہ سکون و جمود، موت کا دوسرا نام ہے۔ اگر دل میں عشق کا سچا جذبہ موجزن ہے، تو اس کی بے قراری اور بے چینی لازمی امر ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ مسلمان کسی ایک مقام و منزل پہنچ کر مطمئن نہ ہو جائے، بلکہ آگے بڑھ کر خوب سے خوب تر کی تلاش میں نئے آفاق کی کھوج لگائے؛ سعی و عمل کو اپنائے؛ عزم و حوصلہ جواں رکھے کہ اسی صفت سے اُسے مراد کا موتی میسر آئے گا۔ شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جو دل عشقِ حقیقی میں بے تاب اور مضطرب نہ ہو، یعنی جسے عشقِ حقیقی کی بے قراری نہیں، وہ گوشت کے ایک بیکار لوتھڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ عشقِ الٰہی کی دولت پانے کے لیے تڑپتے ہوئے دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے دل کی جو متحرک

ہو؛ جو سوزِ عشق کی لذت سے آشنا ہو۔

شعر نمبر ۷:

لغت: بے حضوری (باریاب نہ ہونا، خدمت میں حاضر نہ ہوسکنا)

تشریح: علامہ اقبال محبوبِ حقیقی سے لو لگانے کو زندگی کا حاصل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشقِ الٰہی ہی دراصل زندگی کا راز ہے۔ اے انسان! اگر تجھے حضوری کی کیفیت حاصل ہوگئی ہے، تو تُو زندہ لوگوں میں سے ہے، ورنہ محرومی کی صورت میں، تو زندہ رہ کر بھی مردہ حالت میں ہے۔ تیری موت کا راز اسی بے حضوری کی بدولت ہے، جس نے تجھے بے نصیب بنا دیا ہے۔

زیرِ نظر شعر میں اقبال ملت کی اس زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر آج بھی مسلمان اپنی بے عملی اور بے حسی کو چھوڑ کر محبتِ خداوندی کو اپنا لے، تو یہ ناممکن ہے کہ اس کا دل بارگاہِ رب العزت میں حضوری کا شرف حاصل نہ کر سکے۔

۲۔ فیض احمد فیض

فیض احمد فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ کے ایک قصبے کالا قادر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سلطان محمد خان تھا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر پر ہی ہوا، جہاں انھوں نے اُردو، فارسی اور قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۵ میں انھیں انجمن اسلامیہ کے مدرسے میں داخل کروایا گیا۔ اسکاچ مشن اسکول میں مولوی ابراہیم سیالکوٹی سے مشرقی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اسی اسکول میں ان کے ایک استاد شمس العلماء مولوی میر حسن بھی تھے، جن کے شاگردوں میں علامہ محمد اقبال کا نام سرِ فہرست ہے۔ فیض صاحب نے ان سے عربی صرف و نحو کا درس لیا اور ان سے اپنے اس شاگردانہ تعلق کو ہمیشہ فخر سے بیان کیا۔ ۱۹۲۷ء میں اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۹ میں مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے کیا اور پھر مزید تعلیم کے لیے لاہور آگئے، جہاں گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں امتیاز کے ساتھ ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۳۵ء میں جب انجمن اسلامیہ کے ایم اے او ہائی اسکول امرتسر کو کالج کا درجہ مل گیا، تو اس میں لیکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ انھوں نے ۵ سال تک وہاں انگریزی ادب پڑھایا۔ امرتسر ہی میں فیض صاحب کی پہلی ملاقات ترقی پسند تحریک کے بانی اور اپنے عہد کے معروف ادیب سید سجاد ظہیر سے ہوئی اور وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد 'پاکستان ٹائمز' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اپنے وقت کے مشہور اُردو اخبار 'امروز' اور ہفت روزہ 'لیل و نہار' سے بھی بطور مدیر وابستہ رہے۔ صحافتی شعبے میں کوئی دس گیارہ سال تک خدمات انجام دیں۔ فوج میں بھی ملازمت کی اور کرنل کے عہدے پر فائز رہے۔ عبداللہ ہارون کالج، کراچی میں بطور پرنسپل بھی کام کیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو انتقال ہوا۔

ان کے شعری اور نثری کام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

'نقشِ فریادی'، 'دستِ صبا'، 'زنداں نامہ'، 'دستِ تہِ سنگ'، 'سرِ وادیٔ سینا'، 'شامِ شہرِ یاراں'، 'مرے دل مرے مسافر'، 'نسخہ ہائے وفا'، 'میزان'، 'صلیبیں مرے دریچے میں'، 'متاعِ لوح و قلم' اور 'قومی ثقافت' وغیرہ۔

فیض عصرِ موجود کے نمائندے اور مقبول ترین شاعر ہیں۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کی روایتی اور پامال علامتوں اور ترکیبوں کو نئے معنوی امکانات سے ہمکنار کیا۔ ان کے کلاسیکی مفاہیم میں جدت پیدا کر کے انھیں عصر کی نئی کروٹوں کا دم ساز بنایا۔ ان کی شاعرانہ فکر عالمی امن کا خواب بنتی رہی۔ فیض دھیمے، مگر شیریں لہجے میں دل کی بات کرتے ہیں۔ اپنے

دیگر ہم عصر ترقی پسند شعرا کی اکثریت کی طرح ان کے ہاں لہجے کی کرختگی اور تندی ہرگز نہیں ہے۔ مقصدیت کے بیان میں ان کا اندازِ فن کی حدوں کا احترام روا رکھتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شاعری اور مقصدیت شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری میں بھی ایک توازن اور تہذیب کا پرتو ملتا ہے۔ ان کے پیش کردہ عشق مجاز کے شوخ رنگ تو رکھتا ہے، مگر ان رنگوں کی دوسری سمت وطن اور انسان دوستی کا دیر بھی مسکراتا اور ضو دکھاتا ہوا ملتا ہے۔ ان کا کلام آفاقی قدروں کی پاسداری میں اپنے جہانِ معانی کو نمایاں کرتا ہے۔ انھوں نے شاعری کے قدیم تصورات، استعارات، اصطلاحات اور تراکیب کو نیا سیاسی شعور عطا کر کے نئے مفاہیم اور نئی علامتوں میں پیش کرنے کا ہنر یوں دکھایا ہے کہ ان کی غزل اپنے عہد کی نمایندہ بن گئی ہے۔ ان کا لب و لہجہ رجائیت پسندانہ عناصر سے اپنی تشکیل کرتا ہے۔ ان کا کلام ایک باریک نظر اور ذی شعور انسان کا ترجمان ہے۔ زبان و بیان میں پختگی فن پر ان کی دسترس کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ غزل اور نظم میں فیض نے جو طرزِ فغاں ایجاد کی، اس کی پیروی پاک و ہند میں ہر جگہ کی گئی۔ یہ شاعری کی فنی عظمت کی دلیل ہے۔ فیض صاحب نے جتنی بھی نظمیں لکھی [illegible] کی۔ [illegible] برصغیر کے اردو [illegible] میں ان کا مقام [illegible]

غزل

[illegible]

ر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں

۲.۴ تشریحات:

شعر نمبر ۱:

لغت: صد شکر (سو بار تشکر، شکریے کا ایک سو بار اعتراف)، ہجر (محبوب سے جدا ہونا، بچھڑ جانے کی کیفیت)

تشریح: عشق کرنے والے وصال میں سرشاری اور مسرت سے، جبکہ ہجر و فراق میں کسک اور درد و کرب سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ہجر و وصال کی یہ دھوپ چھاؤں محبت کرنے والوں کا ہمیشہ سے مقدر رہی ہے، مگر اہلِ عشق ہجر کی ان جان لیوا گھڑیوں میں بھی جلد ملنے کی آرزو میں ایک طرح سے وصال کی لذت ہی محسوس کرتے ہیں۔ سچے عاشق کے لیے جدائی بھی ملاپ ہی کا وسیلہ ہوتی ہے، جیسے ناصر کاظمی نے کہا تھا:

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھی راتوں میں عمر بھر کے مجھے

یا پھر محبوب سے بچھڑنے کے لمحوں میں حکیم مومن خان مومن نے کہا کہ:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

باہمی محبتوں میں یوں بھی وصل کے لمحات کبھی دائمی نہیں ہوا کیے، لہٰذا فیض نے بھی ہمہ وقت محبوب کی بخشی ہوئی جدائی کی ساعتوں کو وصال ہی کا حاصل قرار دیتے ہوئے کہا کہ: اے مرے دوست! ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں تیری یاد کی رفاقت میں کبھی اکیلا رہا ہوں، تُو تو ہر دم میرے ساتھ ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا سو سو بار شکر ادا کرتا ہوں کہ اب فراق کی راتیں گزر گئی ہیں؛ اب تمھاری قربت کے دن جاگ اٹھے ہیں، یعنی جدائی کے دن اب وصال کی صورت میں اُبھر آئے ہیں۔ چشمِ تخیّل میں تم میرے ساتھ ہوتے ہو؛ تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے، لہٰذا محبت کامگار ہے، ناکام نہیں ہے۔

شعر نمبر ۲:

لغت: کوچہ (محبوب کی گلی مراد ہے)، جاناں (محبوب، عزیز ہستی) کوچۂ جاناں (وہ جگہ یا گلی جہاں محبوب کا قیام ہے)، دل بیچ آئیں، جاں بیچ آئیں (دل اور جان محبوب پر قربان کر دیں)، دل و [illegible] سچے عاشق)

تشریح: اِس شعر میں شاعر کا خطاب دل والوں یعنی سچے عاشقوں سے ہے۔ وہ انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو لوگ کوچۂ محبوب سے جان سلامت لے کر لوٹے ہیں، سچے عاشق نہیں ہیں۔ عشق کی معراج تو جاں سے گزر کر اپنا نصب العین پانا ہے۔ کسی بھی بڑے مقصد کو پانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کے لیے انسان کو تیار رہنا چاہیے۔ یہی وہ درسِ عشق ہے، جو فیض کے اِس شعر میں بظاہر عشقیہ مضمون کے پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ جو لوگ اپنے آدرش کے لیے زندگی وقف کرتے ہیں، تو پھر ان کے لیے جاں کی بازی کوئی معانی نہیں رکھتی۔ محبوب کی گلی میں اب ایسے حالات بھی نہیں ہیں کہ کوئی سچا عاشق اپنی جان پر کھیل کر وہاں تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ شعر کی زیریں سطح پر شاعر کی طرف سے ہر سچے اہلِ دل کو یہ دعوت دی جاتی رہی ہے کہ آؤ! سب محبوب کے کوچۂ رعنا کی سمت چلتے ہیں، راستے کی پابندیاں اور کڑے پہرے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

شعر نمبر ۳:

لغت: دھج (شان، انداز)، مقتل (قتل گاہ)، آنی جانی (عارضی، آنے جانے والی چیز)

تشریح: اِس شعر کا مفہوم موضوعاتی اعتبار سے دوسرے شعر کا تسلسل ہے۔ حق گوئی کی خاطر موت کو بھی گلے لگانے والے تاریخ انسانی میں امر ہوئے ہیں۔ شاعر کے نزدیک جس بے خوفی اور نرالی آن بان کے ساتھ کوئی شخص قتل گاہ کی طرف جاتا ہے، اس کا وہ انداز؛ وہ پیش کاری کا منظر؛ وہ شان وشوکت کا جذبہ، دیکھنے والوں کی آنکھ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جان کیا ہے؟ یہ تو ایک عارضی شے ہے، جس کا ختم ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، یعنی اصل اہمیت اور توقیر تو جان لوٹا دینے میں نہیں، بلکہ اس انداز اور سج دھج کے انداز کی ہے، جو حصولِ آرزو کی یادگار بن گئی ہو۔ شاعر مفاہمت کی راہ اپنانے کی بجائے جور وستم کے خلاف شدید ردِعمل کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے۔ شاعر کا اِس بات پر پختہ ایمان ہے کہ جب کبھی اہلِ عشق سے جاں کی قربانی طلب کی جاتی ہے، تو وہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتے، کوئی دنیاوی لالچ یا کسی طاقت کا خوف، ان کے اُجلے راستوں کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وہ منزل کی جانب بڑھتے ہیں، تو بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ان کی نظر میں: گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی افضل قرار پاتی ہے۔ وہ اگر خیال کرتے ہیں، تو صرف اس بات کا کہ قتل گاہ کو جانے والے راستے کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہوئے کس باوقار طریقے سے موت کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر علمِ حق بلند کیا جا سکتا ہے۔

شعر نمبر۴:

لغت: میدان وفا (وفا کا میدان، ایسی جگہ جہاں وفا کی آزمائش ہو)، دربار (بادشاہ کی محفل)، نام ونسب (نام اور خاندان)، پوچھ (سوال، پرسش)

تشریح: شاعر نے اس شعر میں کسی سلطان کے دربار پر عشق کی سلطنت کو فوقیت دی ہے۔ شاعر کے نزدیک بادشاہوں کے درباروں میں اعلیٰ عہدے اور منصبی مرتبے خاندانی بڑائی اور نام کی شہرت کے سبب عطا ہوتے ہیں، جبکہ عاشق کے دربار میں خاندان کے اعلیٰ ہونے یا حسب ونسب کی بلندی اور امتیاز کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ یہاں کسی کا شجرۂ نسب کھنگال کر؛ کسی کے اونچے نام کو اچھال کر، عزت اور احترام سے نہیں نوازا جاتا، یہاں تو توقیر کی مسند انھیں ملتی ہے، جو عشق کے راستے کے سچے راہی ہوں؛ جن کی شہرت اور ہر دل عزیزی میں ظاہری نمود نمائش یا دنیاوی طاقت اور چمک کا عمل دخل نہیں ہوتا، بلکہ صادق جذبوں کی کارفرمائی ہوتی ہے، کیونکہ عشق وہ جگہ ہے، جہاں پہنچ کر ذات پات کے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ یہ کسی کا نام بھی نہیں ہے۔ یہ تو کسی مجنوں؛ کسی مہینوال؛ کبھی پنوں اور کبھی رانجھے کے روپ میں سامنے آنے والی وہ حقیقت ہے، جو تخت وتاج اور مال و زر کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یہاں تو بندہ کٹ کر بھی آباد ہی رہتا ہے، بقولِ سلیم کوثر:

> کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
>
> کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا، کبھی دل پر آنچ نہیں آتی

لہٰذا یاد رکھو! وفا کا میدان کسی بادشاہ کا دربار ہرگز نہیں ہے کہ جہاں خاندانی رتبے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ محبت اپنا خاندان اور اپنا قبیلہ خود تخلیق کرتی ہے۔

شعر نمبر۵:

لغت: بازی (کھیل)، مات (ہار)

تشریح: کھیل کوئی بھی ہو، اس کا انجام ہار، یا جیت دونوں میں سے کسی ایک پر ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص بازی لگاتا ہے، تو عموماً کوئی چیز داؤ پر لگانے سے پہلے، ہار اور جیت ہر دو پہلوؤں کے امکانات پر غور ضرور کرتا ہے۔ اُس

کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایسی بازی نہ کھیلے، جس میں ہار کے امکانات زیادہ واضح دکھائی دیتے ہوں۔ لہٰذا وہ
کھیل میں شریک ہوتے ہوئے اپنے لیے سودمندی اور بچاؤ کے سارے امکانات ذہن میں رکھتا ہے۔ مگر
یہ اصول دنیا کے تمام کھیلوں میں یکساں سمجھا اور تسلیم کیا جا سکتا ہے، مگر عشق کا کھیل دنیا کے تمام کھیلوں سے یکسر
منفرد و یکتا ہے۔ اس کے اپنے اصول اور قاعدے ہیں۔ یہاں نفع و نقصان کی شراکت داری ممکن ہی نہیں ہے۔
شاعر کا کہنا ہے کہ یہی وہ کھیل ہے، جس میں جو چاہے بے خوف و خطر داؤ پر لگا دو اور یہ نہ سوچو کہ جیت نصیب
ہوتی ہے، یا ہار مقدر بنتی ہے، کیونکہ عشق کی بازی روایتی ہار اور جیت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ یہاں اگر بظاہر
شکست کا سامنا بھی کرنا پڑے گا، تو وہ شکست اپنے معنوی اعتبار سے فتح ہی کا نشان ثابت ہوگی۔ عشق کے
میدان میں دنیا کے سامنے جان کی بازی ہارنے والے آج زمانے میں محبت اور عقیدت سے یاد کیے جاتے
ہیں۔ فیض کا فکری روّیہ عشق کے حوالے سے عقل پر برتری کا زاویہ ابھارتا ہے اور یہ نظریۂ عشق اقبال کے طرزِ
شاعری کا فیض ہے اور وہیں سے فکرِ فیض نے اکتساب کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق!
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

۳۔ احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند شعرا میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں، اتنے ہی بڑے افسانہ نگار بھی ہیں۔ شخصی سطح پر بھی انسانی اقدار کی پاسداری کا جو روّیہ ان کا خاصہ رہا ہے، اُسی کے عکس ہائے جمیل ان کی فکری و فنی زندگی کے آئینہ خانے میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے اُن کی شاعری اور نثری تحریریں: ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کی ترجمان ہیں۔ وہ بامقصد اور تعمیری ادب پر یقین رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں انسانی جذبات و احساسات اور مشاہدات و تجربات کی ترجمانی ایک بصیرت یافتہ فن کار کی طرح کی ہے۔ ان کی باریک بین اور دُوررس نگاہوں کو صورتِ واقعہ کے عقب میں جھانک کر منطقی نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس حوالے سے وہ حقائق کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی اندرونی کیفیات کے بہترین عکاس بھی ہیں۔ ان کی نثری تحریروں میں بھی محبت کی شدت کا شاعرانہ احساس کروٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری کے اہم موضوعات میں: انسان دوستی کے جذبے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بنیادی انسانی قدروں کی پامالی پر اُن کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اُن کے نزدیک: کائنات کی سب سے اہم اور مقدم چیز خود انسان ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں اور انسان کی توقیر اور حرمت کو ہر چیز پر مقدم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور نظر عمیق ہے۔ اُن کی شاعری میں فطری بے ساختہ پن اور زندگی کے روّیوں کا حقیقت پسندانہ تجربہ ملتا ہے۔ وہ ثقیل اور بوجھل الفاظ استعمال کرنے کی بجائے سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ طبقاتی ناہمواری، انسانی عظمت، محبت کی نارسائی اور سامراجی تشدد کے حوالے سے ان کا لہجہ اور آہنگ ہم عصر شعرا سے منفرد ہے۔

۳.۱ غزل

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا مرا تنہا ہونا
آتش و آب کا ممکن نہیں یکجا ہونا

ایک نعمت بھی یہی، ایک قیامت بھی یہی
روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا

جو بُرائی تھی، مرے نام سے منسوب ہوئی
دوستو! کتنا بُرا تھا، مرا اچھا ہونا

قعرِ دریا میں بھی آنکلے گی، سورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محرومِ تمنا ہونا
شاعری روزِ ازل سے ہوئی تخلیق ندیم
شعر سے کم نہیں انسان کا پیدا ہونا

۳.۲ تشریحات:

شعر نمبر ۱:

لغت: کچھ غلط بھی تو نہیں تھا (درست تھا)، آتش و آب (آگ اور پانی)

تشریح: اِس شعر میں شاعر نے محبوب و محب کو آگ اور پانی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر میں محبوب سے جدا ہو کر اکیلا رہ گیا ہوں، تو یہ کوئی انہونی بات ہرگز نہیں ہے، کیونکہ میرا محبوب اپنے مزاج اور جمال ہر دو اعتبار سے آگ کی سی تپش اور گرمی رکھتا ہے، جبکہ میں پانی۔ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شاعر جو ایک سچا عاشق ہے، یہ نہیں چاہتا کہ اس کے معشوق کے حسن کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے، وہ ہر حال میں اُسے روشن دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو محبوب سے جدا کر لیا ہے کہ جب باہمی ملاپ کے لیے بنیادی قدر ہی مختلف ہے، تو پھر ساتھ رہنے پر اصرار کیوں ہو۔ جدا رہ کر بھی تعلق برقرار رکھا جا سکتا ہے کہ عشق میں قرب کا حصول ضروری نہیں ہوتا۔ شکیب جلالی نے اس موضوع کو یوں برتا ہے:

دھوپ کی لہر ہے تُو، سایہ دیوار ہیں ہم
آج بھی ایک تعلق ہے ترے ساتھ ہمیں

شعر نمبر ۲:

لغت: قیامت (مصیبت)، بینا (دیکھنے والی چیز)

تشریح: شاعر نے روح کے جاگنے اور آنکھ کے بینا ہونے کو خدا کی ایک نعمت قرار دیا ہے اور اِس نعمت کا اقرار کرتے ہوئے آنکھ کی اِس روشنی کو، جس کی بدولت "آگہی" نصیب ہوتی ہے، اُسے ایک طرح کی مصیبت سے بھی تعبیر کیا ہے، کیونکہ جب دل کی آنکھ کھل جائے، تو اشیا کی اصلیت سامنے آجاتی ہے۔

اچھی شے کی حقیقت سامنے آتی ہے، تو دِل خوشی سے جھوم جھوم جاتا ہے، جبکہ بُری شے کی اصلیت دیکھ کر دِل خون کے آنسو روتا ہے۔ گویا اشیا سے متعلق جان لینا بھی آگہی اور صداقت کا مل جانا خوشی و شادمانی ہی کا موجب نہیں بنتا ،عذاب و بے چینی کا سبب بھی بنتا ہے۔ اِسی مفہوم کو محسن بھوپالی یوں ادا کرتے ہیں:

ہماری جان پر دہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں، ہم کو سوچنا بھی ہے

یہ جو دیکھنے کے بعد سوچنے کا عمل ہے، اُسی صورت میں ممکن ہے، جب آنکھ بینا ہو اور روح جاگ رہی ہو۔ یہ سب کچھ حسّاس لوگوں کے لیے ہے، ورنہ تو بے حس لوگ انسانیت کے درد کو محسوس ہی نہیں آتے، آگہی کی منزل کہاں پائیں گے؟

شعر نمبر ۳:

تشریح: کہتے ہیں کہ برائی اچھائی کو کھا جاتی ہے۔ شاعر ایک ایسے ماحول میں بسنے پر مجبور ہے، جہاں برائی ہی برائی ہے، لہٰذا اُس کے واحد اچھا ہونے کا نتیجہ اُس کے حق میں بُرا ثابت ہوا ہے۔ اُس کے دوست اُسے اِس قدر بُرا خیال کرتے ہیں کہ ہر برائی اُس کے نام کر رہے ہیں۔ شاعر اخلاقی قدروں کے زوال پر اداس ہے۔ اُسے دکھ ہے کہ نیکی کرنے کے صلے میں اُسے ملامت اور تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، حالانکہ بقولِ شاعر: مجھے دوستوں سے اس سلوک کی توقع ہرگز نہ تھی۔ لفظ 'دوستو' کا تخاطب اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ شاعر اپنے حلقۂ احباب سے شاکی ہے، جو اُس کے ہر اچھے فعل کو برائی کے زمرے میں شامل کر رہے ہیں۔

دراصل شعر کے باطن میں چھپا مفہوم یہ ہے کہ معاشرے میں اخلاقی قدروں کو زوال آ گیا ہے؛ برائی کی جڑیں سماج کے ڈھانچے میں اِس بُری طرح پیوست ہو کر رہ گئی ہیں کہ اب کسی انسان کا اچھی شہرت رکھنا، اُس کے لیے برائی اور رسوائی کا سبب بن گیا ہے۔ شاعر نے زندگی کے ہر مشکل مقام پر حق و صداقت کا ساتھ دیا، جو اندھیروں کی سوداگری کرنے والوں کو پسند نہیں آیا، لہٰذا اُنھوں نے اس کی شاعری کو ہدفِ ملامت بنایا۔ معاشرے کے اِسی انسانیت دشمن روّیے کو محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے مقام پر شاعر نے کہا ہے

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

شعر نمبر۴:

لغت: قعرِ دریا (دریا کی گہرائی)، محروم تمنا ہونا (آرزو کا جاتے رہنا، تمنا کھو دینا)

تشریح: پہلے تین اشعار میں ہمیں شاعر کے ہاں ماحول کے جبر، انسانی قدروں کے زوال اور دنیا کے بے حس ہونے کا احساس ملتا ہے، مگر زیرِ نظر شعر میں ایک رجائی نقطۂ نظر نمایاں ہے۔ شاعر بہت پُر امید دکھائی دیتا ہے، اُسے یقین ہے کہ دریا کی سب سے نچلی سطح کی تاریکی سے بھی سورج کی کوئی کرن پھوٹ سکتی ہے۔ روشنی کی وہ لہر جو بلندی سے زمین کی تہ میں اُترتی ہے۔ کرن جو اُمید، زندگی اور توانائی کا استعارہ ہے، اندھیروں کا سینہ چیر کر اپنے ہونے کا اعلان کرسکتی ہے۔ شاعر روشنی کی ننھی کرن کو علامت بنا کر دراصل یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ اُس کا دامن ابھی امید سے خالی نہیں ہوا، کیونکہ اُس کے دل میں آرزو زندہ ہے؛ منزل کی جستجو باقی ہے؛ زندگی کا تسلسل قائم ہے۔ شاعر نے امنگ کو مرنے نہیں دیا کہ یہی امنگ اُسے بدترین حالات میں بھی جینے کا حوصلہ بخشے ہوئے ہے اور اسی امنگ اور تمنا نے اُسے یہ امید بھی دلائی ہے کہ ضرور کہیں نہ کہیں سے سورج کی کوئی کرن آنکلے گی، جو اندھیروں کا سینہ چیر کر مجھ تک پہنچے گی اور میں اُجالوں کا ہم نوا ہو جاؤں گا۔ شاعر نے 'روشنی' کو اچھے دنوں اور روشن مستقبل سے تعبیر کیا ہے، وہ مایوس اور نامراد نہیں ہے، اُسے یقین ہے کہ سحر ضرور ہوگی۔

شعر نمبر۵:

لغت: روزِ ازل سے (ابتدا ہی سے، تخلیقِ کائنات کے لمحے سے)، تخلیق ہونا (پیدا ہونا)

تشریح: ارشادِ ربانی ہے کہ میں نے کائنات کو ایک خاص ترتیب اور توازن سے پیدا کیا ہے اور پھر دعوت دی ہے کہ کوئی ہے، اس کائنات میں کسی قسم کا نقص یا عیب نکال سکے؟ نظامِ قدرت پر غور کیا جائے، تو کھلتا ہے کہ کائنات میں موجود ہر چیز ایک مقررہ حد اور ضابطے کے تحت سفر کر رہی ہے۔ دن اور رات کا بدلنا، چاند سورج اور سیاروں کا گردش میں رہتے ہوئے بھی ایک خاص وقت کا پابند ہونا اور قدرت کے سبھی مظاہر: ایک نظامِ کار کے اصول پر بدلتے اور سنورتے رہتے ہیں۔ یہی توازن اور یہی ترتیب کا حسن: شعر کی تخلیق کے لیے بھی لازمی ہے۔ شاعری اور کائنات گویا روزِ اوّل ہی سے ہم آہنگ اور ہم دم ہیں۔ جس طرح شعر میں شاعر کے جذبات لفظوں کا روپ دھار کر ایک محسوس اور حسی پیکر میں ڈھلتے ہیں، اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے مٹی کے پیکر میں جذبات و احساسات کی خوبی بھر کر اُسے اپنا شاہکار قرار دیا ہے۔ عظمتِ آدم اور حسنِ آدم کے اعتراف کا اک پہلو یہ بھی

ہے کہ ربِ کائنات نے انسان کو اپنا نائب قرار دے کر اُسے اشرف المخلوقات کے عظیم رتبے پر فائز کیا ہے، گویا انسان کی تخلیق، شعر کی تخلیق سے یوں کم نہیں ہے کہ شاعری کا ظہور، یعنی جذبات اور محسوسات کے اظہار کی خوبی اور خود انسان کا اِس عالمِ رنگ و بو میں ظہور کرنا، ایک عظیم کا واقعہ ہے۔ زیرِ نظر شعر میں پایا جانے والا انسانی کی عظمت کا یہ حوالہ، شاعر کے موضوعاتی حوالوں میں ایک مرکز کا درجہ رکھتا ہے۔ قاسمی کا تفکر قدم قدم پر انسان کے عظیم ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اپنی شاعری کے ایک دوسرے مقام پر شاعر نے عظمتِ انسان کا اعلان اِن الفاظ میں کیا ہے:

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نمٹ لوں، تو وہاں تک دیکھوں

۴۔ ناصر کاظمی

ناصر کاظمی ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو محلّہ قاضی واڑہ انبالہ شہر میں سیّد محمد سلطان کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سید ناصر رضا تھا، جبکہ ناصر کاظمی کے شاعرانہ نام سے اُردو ادب میں معروف ہوئے۔ ان کی والدہ کنیزہ محمد بیگم انبالہ شہر میں مشن گرلز اسکول کی معلمہ تھیں۔ پانچویں جماعت تک والدہ کے زیرِ سایہ مشن گرلز اسکول میں پڑھا۔ قرآنِ حکیم پڑھنے کے بعد: گلستان، بوستان، شاہنامۂ فردوسی، قصہ چہار درویش، فسانۂ آزاد اور الف لیلہ جیسا ادبِ عالیہ ان کے زیرِ مطالعہ رہا۔ اگلی چند جماعتیں پشاور میں پڑھیں اور مڈل کا امتحان ضلع شملہ کے ایک اسکول سے پاس کیا۔ نویں دسویں مسلم ہائی اسکول انبالہ سے پاس کیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور ہجرت کر آئے اور اسلامیہ کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کے طالب علم تھے، مگر ناساز گار حالات کی بنا پر مزید تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ دورانِ تعلیم ہی شاعری کا باقاعدہ آغاز کر چکے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں شادی ہوئی، تو ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ ابتدا میں کچھ عرصہ محکمۂ روزگار لاہور سے وابستہ رہے۔

ابتدائی ملازمت ۱۹۵۰ء میں 'اوراقِ نو' کے مدیر کی حیثیت سے کی، جو تقریباً ایک برس تک رہی، پھر یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء سے جنوری ۱۹۵۷ء تک مشہور ادبی جریدے 'ہمایوں' کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے۔ رسالہ 'ہم لوگ' کے نائب مدیر بھی رہے۔ 'خیال' کے نام سے ذاتی ادبی رسالے کا اجرا بھی کیا، جو کچھ ہی عرصہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔ یکم اگست ۱۹۶۴ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے بطور اسٹاف آرٹسٹ منسلک ہو گئے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۵ء کو وفات پائی۔ ان کی نمایاں کتابوں کے نام یہ ہیں: 'نشاطِ خواب'، 'خشک چشمے کے کنارے'، 'دیوان'، 'برگِ نے'، 'پہلی بارش'، 'سُر کی چھایا' وغیرہ۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد نمایاں ہونے والے اُردو غزل گو شعرا میں ناصر کاظمی کا شمار الگ اور منفرد حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ معتبر قارئین نے ان کو جدید غزل کے اہم ترین شعرا کی صف میں شامل کیا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے نظمیں بھی لکھیں، مگر چونکہ ان کا مزاج غزل کے زیادہ قریب تھا، اس لیے قدرتی طور پر غزل ہی کی صف میں ان کے تخلیقی جوہر نسبتاً بہتر اور موثر انداز میں ظاہر ہوئے اور ان کے اثرات بعد کی نسل نے بھی قبول کیے۔

ناصر کی غزل ہم عصر رجحانات اور میلانات کی امین ہے۔ اُنھوں نے ہجرت کے موضوع کو اتنے پُر اثر اور پُر درد اسلوب میں ڈھالا کہ ان کا ذاتی تجربہ عصر کی جیتی جاگتی حقیقت کا ہم آواز بن گیا۔ اُن کے شعری مزاج میں اُسی پُرکار سادگی، دردمندی، سبک خرامی، لہجے کے سوز و گداز اور مترنم، مگر دھیمے پن کی تہذیب ملی ہوئی ہے، جو خدائے سخن میر تقی میر

کی غزلوں کی اہم ترین صفت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وارداتِ قلب کی ترجمانی نقل مکانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اداسی اور افراد و زمانہ کی ستم کاری کے سبب ملنے والی کرب ناکی کے بیان میں ناصر کا رنگِ شاعری، میر کے رنگِ شاعری کی جھلک پیش کرتا ہے۔ ناصر کاظمی نے میر کا تتبع تو کیا، مگر اپنی انفرادیت کے نقش بھی اُجاگر کیے۔ چھوٹی، مگر مترنم بحروں کے استعمال سے ان کے ہاں اسلوب کے نئے امکانات واضح ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کے دو اہم ترین موضوعات ہیں: ایک تقسیم ملک کے المیے کا موضوع اور دوسرا سقوطِ ڈھاکہ کا دکھ۔ گویا ایک سانحے پر ان کی شاعرانہ فکر کا آغاز ہوتا ہے، تو دوسرے پر اختتام، اسی سبب سے ان کی غزل کے باطن میں ایک گہری اداسی، ایک مسلسل محرومی اور ایک کبھی نہ ختم ہونے والی دل سوزی و دردمندی کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ شاعر کی داخلی کائناتِ غم پر افسردگی کا سایہ ہے، تاہم وہ غم کی اتھاہ گہرائیوں سے بھی کہیں نہ کہیں اُجالے کی کرن پھوٹنے کا منتظر دکھائی دیتا ہے؛ اُسے یقین ہے کہ آج نہیں، تو کل صبح کا اُجالا ضرور پھیلے گا۔ مایوسیوں کی فضا میں امید کی کرنوں کا منظر دکھا کر شاعر خود کو مرگ پسندانہ کیفیت سے الگ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور یوں اس کا لہجہ کہیں کہیں رجائیت پسند بھی ہو جاتا ہے۔

۱.۴ غزل:

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل، اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدّر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے اُبھر اُبھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے اُنھی راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بُلا رہا ہے کوئی بام سے اُتر کے مجھے
پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سُنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

۴.۲ تشریحات:

شعر نمبرا:

لغت: آنکھ بھر کے دیکھنا (مکمل توجہ سے دیکھنا) جرسِ گُل (پھولوں کے قافلے کی گھنٹی مراد ہے پھول کھلنے کی آواز یا چٹک)

تشریح: ناصر کاظمی کے ہاں اداسی اور ویرانی کا احساس قدم قدم پر ملتا ہے۔ اپنی غزل کے اِس مطلع میں وہ یہی روّیہ ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ بہار کا موسم جہاں ایک طرف مسرّت اور تازگی کا احساس لاتا ہے، وہاں جنوں و دیوانگی کی کیفیت میں مبتلا عاشقِ جاں سوز کے لیے نئی تڑپ اور کسک کا اعلان نامہ بھی ہوتا ہے۔ سودائی لوگ دیوانہ وار بہار کی حشر سامانیوں کا سامنا کرتے ہیں، تو ان کی وحشت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ:

جب بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا
صحنِ گل چھوڑ گیا، دل میرا پاگل نکلا

ناصر کاظمی جو پہلے ہی 'دردمندی میں کٹی ساری حیاتی اپنی' کی مثال بن کر جی رہا تھا۔۔۔ بہار آئی، تو اس کی اداسیوں اور بے قراریوں میں مزید اضافہ کر گئی۔ وہ اندر کی بے چینی اور کرب کی شدت کو کم کرنے کی غرض سے باغ کی جانب چل دیا، مگر باغ کی کسی کلی نے بھی اس کی طرف توجہ اور پیار سے نگاہ نہیں کی۔ ایسے میں شاعر کو یوں لگا دیا، جیسے: پھولوں کے قافلے والے اُسے تنہا چھوڑ کر کہیں چل دیے ہوں؛ کسی کھلتے اور مسکراتے چہرے نے محبت سے اس کی طرف نہیں دیکھا؛ اُس کی ویران تمناؤں کو کوئی مرکز نہ ملا؛ کسی نے اس سے اداسی کا سبب دریافت نہ کیا؟ گویا پھول جو شگفتگی کا استعارہ ہے اور کلی جو تازگی کی علامت ہے، شاعر کے لیے افسردگی بڑھانے کا سبب بن گئے۔ شعر کا ایک مفہوم حسن اور خوب صورتی کے عارضی ہونے کے تصوّر سے بھی جڑا ہُوا ہے، کیونکہ پھول کی زندگی نہایت مختصر ہوتی ہے۔ کلی سے پھول

بن جانے کی مدت کو اور پھر پھول کے حسن اور اُس کی خوشبو کو جلد ختم ہو جانے کی حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے شاعر کی اداسی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

شعر نمبر ۲:

لغت: شبستاں (رات ٹھہرنے کی جگہ)

تشریح: ناصر کاظمی کا شعری جمال کھوئی ہوئی یادوں؛ بچھڑے ہوئے قافلوں اور نئی امیدوں کا آسرا لے کر طلوع ہونے والی صبحوں کی ہم نشینی میں نکھرتا ہے۔ ہجرت ان کا ذاتی تجربہ تھا اور اسی تجربے نے ان کی شعری کائنات میں وہ رنگ بھرے ہیں، جو آگے چل کر ان کی شاعرانہ عظمت کا بنیادی حوالہ ثابت ہوئے۔ اِس شعر میں شاعر نے محبوب کی یاد میں کھوئے رہنے، یعنی اُس کے خواب میں مست رہنے کو حوالہ بناتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے محبوب کی کسی سہانی یاد کی خواب گاہ میں، وصال کے لطف سے سرشاری کے عالم میں تھا کہ اچانک اُس کے حسین خواب کا جادو ٹوٹ گیا۔ وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہُوا اور صبح ہوگئی۔ صبح دم جب قافلے والوں نے اُسے بیدار کر دیا، تو اس کا شبستانِ خیال چکنا چور ہوگیا۔ وہ یادوں میں کھویا رہنا چاہتا تھا، کیوں کہ اِن یادوں کے دم قدم سے اُس کی زندگی میں رونق باقی تھی۔ رومانوی طرزِ فکر کے حامل شعرا نے یاد کو ہمیشہ خیال کے مرکزی دھارے میں شامل رکھا ہے کہ یہی وہ دولت ہے، جو ان کی زندگی میں محبت کو بیش قیمت بناتی ہے۔ ویسے بھی ان یادوں، وعدوں اور امیدوں کے سہارے زندگی بسر کرنا۔ حال کو حسین تر بنا دیتا ہے۔ خواب حسین ہو، تو بیدار ہونا کسے اچھا لگتا ہے۔ شبنم رومانی کا شعر ہے:

نجانے کون دبے پاؤں خواب میں آیا

کھلی جو آنکھ تو خوشبو سے بس رہا تھا مکاں

شعر نمبر ۳:

لغت: مقدر کی سخت رائیں (مراد ہے زندگی کی کٹھن منزلیں)، اڑا کے لے گے (اٹھا کے لے گئے، بہا لے گے، ساتھ لے گئے)

تشریح: شاعر اپنی پُر ملال زندگی کے حوالے سے محبوب کی جادو کر دینے والی نگاہوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اپنے غموں، دکھوں، محرومیوں اور ناکامیوں پر آنسو بہا رہا تھا اور اپنی بد نصیبی سے گلہ مند تھا کہ ایسے میں کسی شوخ

کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اُس کی نظر میں بلا کا جادو تھا کہ میری بد نصیبی کے دن پھیر گئے؛ میری قسمت ہی بدل گئی؛ غمِ روزگار نے غمِ عشق کا ایسا روپ اختیار کیا کہ میں زمانے کے سارے غم و آلام بھول کر صرف اُسی کی مستانہ نگاہ کا مجاور بن گیا؛ مجھے دنیاوی فکر سے چھٹکارا مل گیا۔ شاعر یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ جیون میں جب سخت راہوں کا راہی بن گیا تھا، ان راہوں سے کسی کی مستانہ نظر، اُسے اڑا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ وہاں کہ جہاں نہ دنیا تھی، نہ دنیا کے مسائل۔ گویا بقولِ میر درد:

دونوں جہان کی نہ رہی پھر خبر اُسے
دو پیالے تیری آنکھوں نے جس کو پلا دیئے

شعر نمبر۴:

تشریح: شاعر کا کہنا ہے کہ جس طرح دریا میں طغیانی آتی ہے، تو اُس کی شدت کے آگے ہر چھوٹی بڑی چیز اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے، اسی طرح اے میرے محبوب! میں بھی رات بھر تیری محبت کے بخشے ہوئے درد کے دریا کی طغیانی گم ہو چکا تھا۔ مجھے تیرے خیال اور تیری جستجو کے سوا کچھ بھی یاد نہ تھا۔ مجھے تیری یاد مسلسل بے چین کیے ہوئے تھی، مگر درد کے انھی لمحوں میں آسمان پر روشن ستاروں نے مجھے چمک چمک کر اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا، مگر مجھے تاروں کی روشنی تمھارے غم کی روشنی سے زیادہ عزیز نہ تھی کہ میں ان کا ہم نوا ہو جاتا۔ اگر تاروں کو آنسوؤں کے لیے استعارہ مان لیا جائے، تو اس شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے میرے محبوب! تمھاری یاد کے سیلاب سے نکلنے کے لیے، وہ تارے جو آنسوؤں کا بدل تھے، مجھے اپنی طرف بلاتے رہے، مگر میں غم کی وادی میں کھویا رہا، کیوں کہ تیرے درد کی سوغات نے مجھے اردگرد کی تمام اشیا سے بے نیاز کر دیا۔

شعر نمبر۵:

لغت: فراق (محبوب سے جدائی کا عرصہ، بچھڑ جانے کی کیفیت)

تشریح: محبت میں جذبے کی صداقت، خلوص کا عنصر اور ایثار کی دولت شامل ہو، تو جدائی اور ملن کا درمیانی فرق مٹ جاتا ہے۔ بچھڑ جانے کی حالت میں بھی اپنے پیاروں کو انسان دل اور روح کے قریب محسوس کرتا ہے۔ وصال کی حالت اگر چہ ایک عاشق کے لیے مسرّت و شادمانی لاتی ہے، مگر ہجر کے لمحوں میں میسّر آنے والی لذت کا بھی

اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ اِسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب! تیرے ہجر میں بسر کی گئی راتوں کا سرور اور میٹھا میٹھا درد مجھے کبھی نہیں بھولتا کہ اس درد اور کرب کی کسک نے مجھے محبت میں جینے کی ادا بخشی ہے۔ میں نے عرصۂ حیات میں تجھ سے جدا رہ کر بھی ایک لذت اور لطف محسوس کیا ہے، کیونکہ میری محبت کی بنیاد میں وہ اخلاص شامل ہے، جو میل ملاپ کا محتاج نہیں ہے۔ تیری یاد کے صدقے میں عطا ہونے والی بے قراری میری چاہتوں کا سرمایہ ہے، کیوں کہ اس نے مجھے جینے کی تڑپ سکھائی ہے۔ تمھارے ہجر کا غم، غم نہیں رہا کہ اسی غم سے تمھارے وصل کی خوشی پھوٹے گی۔ شاعر نے ہجر و فراق سے وابستہ غم کے فلسفے اور اس کی روایت کے معانی بدل کر اُردو غزل کے موضوعاتی دائرے کی حدیں وسیع کر دی ہیں۔ اِس اعتبار سے زیرِ نظر شعر نے بعد میں آنے والے غزل گو شعرا کو بھی فکری سطح پر متاثر کیا ہے۔

شعر نمبر ۶:

لغت: اے (حرفِ ندا ہے)، بام (چھت کے اوپر کا حصّہ)

تشریح: شاعر کی ذاتی زندگی ہجرت کے ایک بڑے تجربے سے گزری ہے۔ اُس نے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے آبائی وطن انبالہ سے پاکستان کے شہر لاہور میں آ کر جب غمِ روزگار کو سینے سے لگایا، تو غمِ روزگار اور غمِ جاناں کی کشمکش میں اس کا شعورِ شعر عجب مرحلے پر آ گیا۔ اگر ایک طرف اسے نئی فضا اور نئے لوگوں کا سامنا تھا، تو دوسری طرف اُس کی بچپن کی محبت: جدائی کے ملال آسا موڑ پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں شاعر کہتا ہے کہ اے غمِ دنیا! میں تیرے ساتھ بھی ہو لوں گا، مگر کچھ دیر کے لیے تو مجھے اپنے محبوب پر بھی نگاہ کرنے کی مہلت دے دے، پھر تو چاہے، تو مجھے اپنا نشانہ بنا لے۔ یہاں لفظ 'کوئی' نے شعر میں جو حسنِ معانی پیدا کیا ہے، اُس نے دمِ رخصت کے احساس کو تہ دار بنا دیا ہے۔ وقتِ رخصت محبوب کا اِک نظر دیکھنا، یا آواز دے کر بلانا، غزل کا محبوب موضوع رہا ہے۔ منیر نیازی نے کہا ہے کہ:

آواز دے کے دیکھ لے شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

شعر نمبر ۷:

لغت: موجۂ ہوائے طرب (خوشی کی لہر)، فسانے (کہانیاں)

تشریح: شاعر نے برِ صغیر کی تقسیم کے وقت جس خون خرابے، خود غرضی، افراتفری اور انسانی قدروں کی پامالی کے مناظر دیکھے تھے اور پھر اس کے خاندان نے جن مسائل کا سامنا کیا تھا، وہ سب کچھ ایک حسّاس اور دردمند فن کار کی طرح اس کے فکری نظام کا حصّہ بنتے چلے گئے۔ عصری آشوب کے یہی مرقعے بعد میں اس کی شعری کائنات میں تغزل کی تازگی پا کر اُبھرتے نکھرتے رہے۔ عصر کی صداقتیں شاعر کے مزاج میں گھُلیں، تو انھوں نے اسے سوز و گدازِ میر کا جانشین بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ جب شاعر دل میں خوشی کی لہر محسوس کرتا ہے، تو اُس موجۂ ہوائے طرب میں بھی غم کی شدت چھپی ہوتی ہے۔ اُس کے نزدیک: خوشی کی لہر کی حیثیت ایک فسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور ظاہر ہے کہ فسانہ کبھی حقیقت نہیں بن سکتا۔

۵۔ شکیب جلالی

شکیب جلالی بھارت کے قصبہ جلالی میں یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء میں سید صفیر حسین رضوی کے گھر پیدا ہوئے۔ شکیب کا اصل نام سید حسن رضوی تھا۔ انھوں نے چودہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ شکیب جلالی کا شمار اُن افراد میں ہوتا ہے، جن پر چھوٹی عمر ہی میں خاندان کی کفالت کا بوجھ آ پڑتا ہے۔ والدین کی وفات کے بعد شکیب اور اُن کی چار بہنوں کو ان کے ماموں نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ یہ سب لوگ راولپنڈی آ گئے۔ شکیب میٹرک کرنے کے بعد ملازمت کی جستجو میں لگ گئے۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ تو ہوئے، مگر ان کے خاندان کی مالی حالت تسلی بخش نہ ہو سکی۔ بہنوں اور ماموں کے اصرار پر ۱۹۵۶ء میں شادی کی۔ ہمت شکن حالات میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ لاہور سے بی اے کیا اور پھر تھل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی سے وابستہ ہو گئے۔ جوہر آباد (خوشاب) اور بھکر وغیرہ میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ حالات کی مسلسل ناسازگاری نے شکیب کو زندگی سے اس قدر بے زار کر دیا تھا کہ بالآخر اُنھوں نے ۳۲ سال کی عمر میں خودکشی کر لی اور سرگودھا میں دفن ہوئے۔

ان کی وفات کے بعد اگست ۱۹۷۲ء میں، ان کا شعری مجموعہ ''روشنی اے روشنی'' کے نام سے احمد ندیم قاسمی نے مکتبہ 'فنون' کے زیرِ اہتمام شائع کیا، جسے جدید اُردو غزل کی روایت میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہوئی۔

شکیب جلالی قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اُردو کے جدید شعری منظر نامے پر اُبھرنے والے ایک ایسے شاعر ہیں، جنھوں نے اپنی تخلیقی توانائی کے زور پر بہت جلد شعری حلقوں میں اپنا اعتبار قائم کر لیا۔ کلاسیکی غزل کا سا رچاؤ، آہنگ و انداز، بیان میں تازگی، اظہار میں نُدرت اور جدید حسیت سے مزّین فکر انگیز موضوعات کی بدولت، شکیب جلالی ۶۰ء کی دہائی میں نمایاں ہونے والے ایسے غزل گو ہیں، جن کی شعری شناخت کا اوّلین حوالہ 'روشنی اے روشنی' نئی اُردو غزل کا امتیاز بنا۔

شکیب کے ہاں لفظ کی سطح پر علامتوں کے مختلف روپ ملتے ہیں۔ تصویر کشی کے قرینے سجے سجائے دکھائی دیتے ہیں۔ تمثال کاری کا حسن نمایاں ہے۔ ان کے پیش کردہ شعری نمونوں میں عموماً: استعاروں، تشبیہوں اور مختلف تراکیب کے ذریعے خیال کی کوئی بیانیہ رو تصویری پیکر میں ڈوبتی اُبھرتی نظر آتی ہے۔ استعارے اور علامت کی تہہ داری مرکزی فکری روّیہ بن کر اُن کے شاعرانہ تفکر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ اسلوبیاتی اعتبار سے شاعر کا یہ فنی سلیقہ اُس منفرد لہجے کی بنیاد بناتا ہے، جو اُن کے ہم عصر شعرا میں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اُردو غزل کے بیان میں ان کا

تذکرہ خصوصی احترام سے کیا جاتا ہے۔ جدید غزل کو پیکر تراشی کے حوالے سے کامیاب بنانے والوں میں ان کا نام اور کام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

۵.۱ غزل:

جس قدر خود کو وہ چھپاتے ہیں
لوگ گرویدہ ہوتے جاتے ہیں
جو بھی ہمدرد بن کے آتے ہیں
غم کا احساس ہی جگاتے ہیں
عہدِ ماضی کے زر فشاں لمحے
شدتِ غم میں مسکراتے ہیں
خود کو بدنام کر رہا ہوں میں
ان پہ الزام آتے جاتے ہیں
اجنبی بن کے جی رہا ہوں میں
لوگ مانوس ہوتے جاتے ہیں

۵.۲ تشریحات:

شعر نمبر ۱:

لغت: وہ (مراد ہے محبوب)، گرویدہ ہونا (عاشق ہونا، فدا ہونا)

تشریح: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کوئی شے پردے میں رہتی ہے، تو اس کا حق ایک کشش سی محسوس کو بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب وہ چیز بے حجاب اور بے نقاب ہو جاتی ہے، اس کا راز بھرا حسن رائیگاں ہو جاتا ہے۔ شاعر نے بہت سادہ اور براہِ راست انداز میں ایک بڑی اور گہری حقیقت کا راز عیاں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اشیا ہوں یا قدرت کے پوشیدہ راز، ظاہری حسن ہو یا پردے میں چھپا کوئی نور کا ٹکڑا، اس کی تلاش اور جستجو اسی وقت اچھی لگتی ہے، جب وہ پردے میں مستور رہے۔ جب وہ ظاہر ہو جائے، تو اس کا حسن بے معنی ہو جاتا ہے۔

جب محبوب اپنے آپ کو پردے میں رکھتا ہے، تو اُس کے حسن کے جلوے بھی آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں اور اُس کی کشش بڑھتی رہتی ہے، مگر جب وہ حسن بے حجاب ہو جاتا ہے؛ خود کو نمایاں کر دیتا ہے، تو اُس کی خوبیاں اور خامیاں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں، ایسے میں وہ اپنی دل کشی کھو دیتا ہے۔ شاعر کے نزدیک حسن کی دل کشی اور رعنائی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود کو پردے میں رکھتا ہے، ورنہ اس کی ظاہری شکل لوگوں کے لیے دل کشی کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کیفیت کو ایک دوسرے شاعر یوں بیان کرتے ہیں:

نادیدہ نگہ کرنا، پھر آنکھ چُرا لینا
یہ آگ لگانا ہے یا آگ بجھانا ہے

شعر نمبر۲:

لغت: غم کا احساس جگانا (غم کا احساس بڑھا دینا)۔

تشریح: اِس شعر میں شاعر نے ایسے نام نہاد بہی خواہوں پر طنز کیا ہے، جو بظاہر ہمدرد بن کر آتے ہیں، مگر درحقیقت وہ غم کے احساس کی آگ کو فزوں تر کر جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں، جب انسان غم کے احساس سے خود کو بوجھل محسوس کرتا ہے، اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا غم خوار آئے، جو اُس کے زخموں پر مرہم رکھے؛ اُس کا سہارا بنے، مگر اُسے جن قریبی احباب سے ہمدردی کی توقع ہوتی ہے، وہی اُس کے درد و غم کی شدت میں اضافے کا سبب بن جاتے ہیں؛ اس کے زخموں کا مداوا بن جانے کی بجائے اُس کے زخموں اور دکھوں میں اضافے کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ دستورِ زمانہ ہے۔ عدم نے ایسے دوست نما دشمنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

مجھے اے کثرتِ آلام بس اتنی شکایت ہے
کہ میرے غم گساروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

غم گساری کی آڑ میں غموں کی شدت میں اضافہ کرنے والے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں احمد فراز نے کہا ہے کہ:

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمنِ جاں تھے وہ غم گسار ہوئے

شعر نمبر ۳:

لغت: عہدِ ماضی (گزرا ہوا عہد)، زرفشاں لمحے (موتیوں جیسے چمکنے والے لمحات)

شدتِ غم: (غم کی شدت، انتہائے غم)

تشریح: شاعر نے گزرے ہوئے لمحوں کو 'زرفشاں' کہا ہے، یعنی ایسے لمحات جو موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ ایسے یادگار لمحوں کو غم کی شدت میں مسلسل مسکرانے سے تعبیر کیا ہے۔ حال کی گھڑیوں کا عارضی ہی سہی، مگر بہترین علاج یہی ہے کہ اُنھیں گزرے ہوئے وقت کی یادگار اور انھیں مسکراتا ہوا خیال تصور کر کے یاد کرنا چاہیے۔ ان عزیزوں اور دوستوں کو یاد کیا جائے، جن کی حسین رفاقت میں وہ پل گزرے ہوں۔ شاعر نے ماضی میں بیتے ہوئے انھی لمحات کو شدت سے یاد رکھا ہے، جو اب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں اور حال میں جن کی یاد ان کے قیمتی ہونے کی یاد دلاتی ہے۔ انسانی نفسیات ہے کہ جو وقت بیت جاتا ہے، وہ بڑی شدت سے یاد آتا ہے اور ایسے لمحے جو کسی عزیز دوست کے ساتھ بسر کیے ہوتے ہیں، وہ غم کی انتہائی کیفیت میں بھی مسکرا دینے کی سرشاری کا موجب بنتے ہیں۔ ایسے میں انسان غم کی حالت میں رہ کر بھی خوشی کی سی حالت میں رہتا ہے کہ سنہرے ماضی کی یادیں اُسے تروتازہ رکھتی ہیں:

جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی منیر
غم سے پتھر ہو گیا ، لیکن کبھی رویا نہیں

شعر نمبر ۴:

تشریح: کسی بھی شخص پر الزام تراشی خود کو بدنام کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ یہاں شاعر نے اِس خیال کی ہم نوائی کی ہے کہ اگر دوستوں کے حلقے میں کوئی ایک شخص بدنامی کا سزاوار بن جائے، تو پھر اُس کے ہم نوا اور ہم دم بھی بدنامی کی زد میں آجاتے ہیں۔ شاعر کو یہ افسوس ہے کہ وہ محبت کے معاملات میں رُسوا ہوا ہے، مگر ان کی رسوائی اس کے محبوب کی رسوائی کا سبب بن گئی ہے۔

شعر نمبر ۵:

تشریح: شاعر نے اپنے اردگرد کے ماحول میں خود کو ایک اجنبی کی حیثیت میں دکھایا ہے اور اس حالت میں اپنے آس

پاس کے لوگوں کو خود سے آشنا ہوتے دیکھنے کی کیفیت بیان کی ہے۔شاعر کے نزدیک یہ عجیب بات ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بیگانہ ہے،مگر اس کے باوجود لوگ ہیں کہ وہ اُس سے مانوس ہوتے جا رہے ہیں؛ اُسے اپنا سمجھتے جا رہے ہیں۔ اِس شعر کا مفہوم غزل کے مطلع سے ہم آہنگ کر کے دیکھیں،تو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ:جتنا کوئی بیگانہ ہوتا ہے،اتنا ہی اُسے اپنا سمجھا جاتا ہے،یعنی دُنیا سے کوئی جس قدر دُور ہوتا ہے، دنیا اسی قدر ہی اُس کا تعاقب کرتی ہے۔اجنبی ہونے کی صورت بھی،تو آشنا ہونے کی ایک شکل ہے۔زمانہ اُسی کا ہو کر رہتا ہے، جو زمانے سے دُور بھاگتا ہے۔

۶۔ احمد فراز

احمد فراز ۱۹۳۱ء کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام سیّد محمد شاہ برق تھا۔ شاعری اُنھیں ورثے میں ملی۔ ان کے خاندان کا تعلق کوہاٹ کے ایک سیّد گھرانے سے تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ کا مزار کوہاٹ شہر کے وسط میں آج بھی زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

اسلامیہ ہائی اسکول کوہاٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کنگ ایڈورڈز کالج پشاور اور پشاور یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے، جہاں سے اُنھوں نے ادبیاتِ اُردو اور فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ شعری زندگی کا آغاز نویں جماعت سے کیا اور پہلا شعری مجموعہ 'تنہا تنہا' کے نام سے ۱۹۵۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ازاں بعد شاعری کی کلیات کے علاوہ کوئی چودہ شعری مجموعے شائع ہوئے: احمد فراز کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

'تنہا تنہا' (۱۹۵۸ء)

'دردِ آشوب' (۱۹۶۶ء)

'نایافت' (۱۹۷۰ء)

'شب خون' (۱۹۷۱ء)

'میرے خواب ریزہ ریزہ' (۱۹۷۲ء)

'جاناں جاناں' (۱۹۷۶ء)

'بے آواز گلی کوچوں میں' (۱۹۸۲ء)

'نابینا شہر میں آئینہ' (۱۹۸۴ء)

'پس اندازِ موسم' (۱۹۸۹ء)

'خوابِ گل پریشاں ہے' (۱۹۹۴ء)

'غزل بہانہ کروں' (۱۹۹۹ء)

'اے عشقِ جنوں پیشہ' (۲۰۰۵ء)

احمد فراز کا شمار معاصر شعری ادب کے چند ایسے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے نظم اور غزل ہر دو اصنافِ شعری میں اپنی بے پناہ تخلیقی قوتوں کا لوہا ہر منوایا اور مقبولیت اور ہر دل عزیزی کی ایسی منزل سر کی، جو ہر کس و ناکس کا

مقدر نہیں ہوتی۔

احمد فراز ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں، جن کے لب و لہجے، لفظیات اور پیرایۂ اظہار کی تازگی اور رعنائی ہجوم میں بھی اپنی شناخت کے واضح رنگ رکھتی ہے۔ ان کا ہر شعر، ہر عہد میں روا رکھے جانے والے جبر و ستم، ناانصافی، سماجی و سیاسی ابتری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور زبردست طبقے کے ساتھ استحصال پسند قوتوں اور صاحبانِ اقتدار کے بے رحمانہ رویے کا مرثیہ ہے۔ ان کے اشعار دل میں اُتر جانے کی تاثیر اس لیے رکھتے ہیں کہ ان میں صداقتِ اظہار، جذبے کا خلوص، بیان کا رچاؤ اور تغزل کی جملہ رعنائیاں موجود ہوتی ہیں۔ اُنھوں نے حسن و عشق سے وابستہ موضوعات کی رنگارنگی سے اپنا شعری ایوان سجاتے ہوئے کلاسیکی طرزِ احساس، لفظیات اور طرزِ اسلوب سے روشنی کشید کرتے ہوے جدتِ اظہار کے نقش اُبھارے ہیں۔ ان کا طرزِ بیان فارسی زبان و ادب کے گہرے شغف کا پتا دیتا ہے اور رومان و انقلاب کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔

احمد فراز نے ۲۰۰۸ء میں وفات پائی اور اسلام آباد میں دفن ہوئے۔

۶.۱ غزل:

گلہ فضول تھا عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چپ رہا، ستمِ ناروا کے ہوتے ہوئے

یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ ہمیں
ہے آشنا کی طلب، آشنا کے ہوتے ہوئے

نہ کر کسی پہ بھروسہ کہ کشتیاں ڈوبیں
خدا کے ہوتے ہوئے، ناخدا کے ہوتے ہوئے

مگر یہ اہلِ ریا کس قدر برہنہ ہیں
گلیم و دلق و عبا و قبا کے ہوتے ہوئے

فراز ایسے بھی لمحے کبھی کبھی آئے
کہ دل گرفتہ رہے، دل ربا کے ہوتے ہوئے

۶.۲ تشریحات

شعر نمبر ۱:

تشریح: عہد کی پاسداری ہی اصل میں انسان کی اخلاقی اور شخصی عظمت کی نشانی ہے، جو شخص اپنے کیے ہوئے وعدے یا عہد پر قائم نہیں رہ سکتا، وہ شخص کسی اعتبار کے لائق نہیں ہوتا۔ایسے بد عہد شخص کے ساتھ زندگی کی منزل طے کرنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا، جب کہ اس کے برعکس وعدہ نبھانے کا عزم رکھنے والا شخص اپنے ساتھ کیے گئے وعدے کو بھی اسی طرح معتبر جانتا ہے، جیسے وہ خود اپنے کیے ہوئے وعدے پر ثابت قدم ہوتا ہے۔وفا کے تقاضوں کا اصول ہی یہی ہے کہ اس کی پاسداری میں رہتے ہوئے دل پر چوٹ کھا کر بھی مسکراتے رہتا ہے۔ شاعر نے اس شعر میں عہد وفا کے تعلق کو جہتوں کے باہمی تعلق سے مشروط کرتے ہوئے بڑی ہی عمدگی سے ہمیں درس وفا کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔اسی موضوع کو قتیل شفائی نے ایک اور زاویے سے یوں بتایا گیا ہے:

سنا ہے اس کو محبت دعائیں دیتی ہے
جو دل پہ چوٹ تو کھائے، مگر گلہ نہ کرے

شعر نمبر ۲:

تشریح: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات قریب ترین سطح پر رہنے والوں کے دلوں کے درمیان بھی کچھ ایسی دوریاں آجاتی ہیں کہ تنہائی اور ناآشنائی کا احساس بڑھنے لگتا ہے اور سب آشناؤں کے ہوتے ہوئے بھی کسی ایسے ملنے والے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے کہ جو تنہائی اور دکھ کے لمحوں میں عارضی ہی سہی، ایک طرح کا سہارا دکھائی دے۔محبت ایک جذبے کا نام ہے، جو ہر شخص میں پایا جاتا ہے، مگر یہی جذبہ ایک حساس شاعر کو سراپا محبت بنا دیتا ہے اور وہ اس احساسِ محبت کی شدت اور کچھ اپنی فطری سادگی و معصومیت کی بنا پر کسی کو بھی شک کی نظر نہیں دیکھتا کہ کون محبت کے معاملے میں مخلص ہے اور کون نہیں ہے؟ لہٰذا کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ قریب آنے والا کوئی شخص ان قربتوں؛ ان چاہتوں کا اہل ثابت نہیں ہوتا۔ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی وابستگی کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا اور انسان کسی کے قریب ہوتے ہوئے اس سے ذہنی اور فکری و جذباتی سطح پر بہت دور بس رہا ہوتا ہے۔اس میں تنہائی اور نارسائی کا احساس بڑھنے لگتا ہے اور وہ نتیجتاً اپنے کسی آشنا کی موجودگی کے باوجود کسی دوسرے واقفِ حال کی ضرورت محسوس کرنے لگتا ہے۔باہمی رشتوں کے درمیان جذباتی احساسات

وتجربات انسان کو کس منزل پر لے آتے ہیں، یہ شعر اس کی ایک اچھی مثال ہے:

فاصلوں کی دوری کچھ بھی نہیں، بس دوری دل کی ہوتی ہے
بے زار چمن سے جب دل ہو، ہم اس کو بیاباں کہتے ہیں

شعر نمبر ۳:

تشریح: زیرِ نظر شعر میں شاعر نے مشکل کی انتہائی گھڑی میں کسی پر بھی مکمل بھروسہ نہ کرنے کا درس دیتے ہوئے کہا ہے کہ اے دوست: اگر تجھے دریا کا سفر درپیش ہے اور تو کشتی کا سوار ہے، تو یاد رکھ! بھنور کے درمیان کوئی غیبی طاقت ہی تجھے بچا سکتی ہے، وگرنہ جس شخص کو تو نے بظاہر خدا مان کر، سفر اختیار کر رکھا ہے، جو تیری ناؤ کا سہارا اور راہنما بنا ہوا ہے، وہ بھی تجھے موجوں کے تھپیڑوں سے نہیں بچا پائے گا، کیونکہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ دریا کی طغانیوں میں کشتیوں کو ناخدا نہیں بچا سکا۔ گویا شاعر شعر کے پردے میں اپنے قاری کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرنا اور کسی بھی سہارے کو اپنے لیے منزل نہ بنانا، ورنہ راہ ہی میں مارے جاؤ گے۔
اس موضوع کو برتتے ہوئے عصرِ موجود کے ایک غزل گو یوں کہتے ہیں:

بچا سکا نہ کوئی ڈوبتے سفینے کو
خدا کو دیکھ لیا، ناخدا کو دیکھ لیا

شعر نمبر ۴:

تشریح: یہ جو منافقوں کے لباس ملبوس میں رہتے ہیں، باطنی طور پر کتنے ننگے ہیں۔ کسی طرح کا لباس بھی ان کے جسم اور روح کو نہیں ڈھانپ سکتا۔ زیرِ نظر شعر میں شاعر نے ریاکاری کرنے والوں پر شدید طنز کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ایسے جو نما گندم فروش لوگوں کا اندر چونکہ میلا ہوتا ہے؛ ان کے من میں کھوٹ ہوتا ہے، اس لیے وہ ہر طرح کے لباس کے ہوتے ہوئے بھی ننگے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے من میں کچھ ہوتا ہے، تو ظاہر میں کچھ۔ ایسے لوگوں کو قرآنِ پاک کی زبان میں منافق کہا گیا ہے۔ [illegible] اور ستر پوشی کے مقصد میں آئے ہیں۔ جسم اور روح کی برہنگی کو دور کرنے کے لیے لائے گئے ہیں۔ یہاں شاعر نے علامتی انداز میں ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ وہ لوگ جو دو روپ رکھتے ہیں، وہ کسی بھی طرح چھپائے چھپ نہیں سکتے؛ ظاہر ہو کر رہتے ہیں اور یہ کہ اصل ننگا پن روح کا ننگا پن ہے۔ ظاہری جسم کو ڈھانپنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ علامہ

اقبال نے ایسے منافق رویوں کے مالک لوگوں سے صاف کہہ دیا ہے کہ:

زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ جو مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

شعر نمبر ۵:

تشریح: شاعر نے غزل کے مقطع میں دل کی اس افسردہ کیفیت کا ذکر کیا ہے جو محبوب سے ملنے کی خوشی کے لمحوں میں بھی برقرار رہتی ہے یہ شعر دراصل اندر کی اس اداسی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو بعض اوقات کسی خاص نام، حالت یا سبب سے مشروط نہیں کی جا سکتی۔ انسان بعض اوقات خوشی پا کر بھی غم کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کے باطن میں کوئی ملال، کوئی دکھ، جب اپنے ہونے کا اعلان کرتا ہے، تو باہر کیسا ہی سہانا موسم کیوں نہ ہو، باطنی کیفیت پُر ملال ہی رہتی ہے۔ اسی بنا پر شاعر نے اس شعر میں محبوب سے حاصل ہونے والی ملاقاتی سرشاری کو بھی بڑے لطیف انداز میں اندر کی ملال آسا کیفیت سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس کی حقیقت کو بدل دیا ہے اور کہا ہے کہ اے محبوب! اگرچہ ہماری باہمی ملاقات کی گھڑیاں، خوشی اور تسکین کا باعث تھیں، مگر ان کی کسی اداسی نے میرے دل کو غم زدہ ہی رکھا۔ میرے لیے وصل کی حقیقی خوشی بھی، کسی ایسی خوشی کا روپ نہ اوڑھ سکی، جو میرے اندر کی ویرانی کو ختم کر سکتی۔ ایک دوسرے شاعر نے اس موضوع کو یوں برتا ہے:

ترے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

۷۔ ظفر اقبال

ظفر اقبال ۲۷ستمبر ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے گریجویشن کیا۔ لا کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ وکالت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل بھی رہے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں انھیں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

آبِ رواں (۱۹۶۲ء) گلافتاب (۱۹۶۶ء) رطب و یاس (۱۹۷۰ء)، غبار آلود سمتوں کا سراغ (۱۹۸۵ء) سر عام (۱۹۸۷ء) عیب و ہنر (۱۹۹۰ء) اطراف (۱۹۹۶ء) بغاوت (۲۰۰۰ء) 'اب تک' کے عنوان سے ان کی شاعری کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

معاصر اُردو غزل گو شعرا میں ظفر اقبال کی شاعرانہ پہچان اپنے لہجے کے تیکھے پن اور اپنے اظہار کے دوٹوک انداز میں نمایاں ہوئی اور اِس منفرد انداز میں نمایاں ہوئی کہ غزل کے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ ہر دو حلقوں میں یکساں مقبولیت اختیار کرتی چلی گئی۔ اُنھوں نے اپنے اوّلین شعری مجموعے 'آبِ رواں' سے جس طرز کی شاعری کا آغاز کیا تھا، اُسے اپنے دوسرے شعری مجموعے 'گلافتاب' میں تبدیل کر دیا اور غزل کی کلاسیکی روایت سے الگ ہو کر اُس 'طرزِ فغاں' کی بنیاد رکھی، جو آگے چل کر ناقدینِ غزل میں خوب زیرِ بحث آئی۔ ظفر اقبال نے مذکورہ شعری مجموعے میں جس نوع کی شاعری کی، اُس سے جدید لسانی تحریک کا احیا نئے زاویے سے اُبھرا۔ جدید لسانی تشکیلات کے اِس رویے سے قطع نظر، اُن کی غزلیہ شاعری کا ایک خاطر خواہ حصّہ، ایسا بھی ہے، جس کی معیاری پیش کاری کی بنیاد پر ہم اُنھیں جدید اُردو غزل کا ایک نمائندہ شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی غزل کا لب ولہجہ عموماً عام بول چال کا سا ہوتا ہے، جس میں مکالمے کی فضا، اُسے بے تکلف بناتی ہے۔ ان کا اسلوب رواں دواں اور سپاٹ ہوتا ہے۔ اُن کی غزل میں فکری الہام نہیں ملتا، بلکہ سیدھے سادے انداز میں سچائی کا ادراک سامنے آتا ہے۔ طنزیہ پیرائے میں اُن کا شعورِ شعر زیادہ چمکتا ہے۔ اُنھوں نے عشقیہ مضامین کو بھی اپنی فکری قلم رو میں شامل کیا ہے۔ خیال کی ندرت، بیان کی قدرت، مشاہدے کی تازگی اور زبان کی نزاکت ان کی غزل کے بنیادی اوصاف ہیں۔

۷.۱ غزل:

مجھے تیری نہ تجھے میری خبر جائے گی
عید اب کے بھی دبے پانو گزر جائے گی

پَو پھٹے آئے گا اِک یاس کا جھونکا، جس سے
پتی پتی گُلِ حسرت کی بکھر جائے گی

سرخ سورج کی لچکتی ہوئی نوخیز کرن
تیغ بن کر مرے پہلو میں اُتر جائے گی

سوچتی آنکھوں میں پھر تیرے تصور کی پری
دل بدست آئے گی اور خاک بہ سر جائے گی

گلیوں بازاروں میں در آئیں گے کھلتے چہرے
پھر مرے دل کی کلی درد سے بھر جائے گی

۷.۲ تشریحات:

شعر نمبر۱:

لغت: دبے پانو (چپکے سے، خاموشی سے) پانو (پاؤں)

تشریح: شاعر نے اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ: اے میرے دوست! تو مجھ سے کتنی دُور ہے؛ تُو نے کبھی ملاقات کے لیے اپنے اندر تڑپ محسوس نہیں کی، جبکہ میں تیری جدائی میں مسلسل تڑپ رہا ہوں؛ انتظار کرتے کرتے اب تو ایک سال اور بیت گیا ہے؛ ایک اور عید کا موقع آ گیا ہے۔ عید کا تہوار خوشی اور ملن کی خوش خبری لیتا ہے؛ چاہتوں کا پیغام لاتا ہے؛ ہر طرف مبارک باد کی صدائیں گونجتی ہیں۔ دوست اپنے دوستوں سے ملتے ہیں، ہر طرف خوشیوں اور مسرّتوں کا سماں ہوتا ہے۔ یہاں شاعر خوشیوں کے اس ہجوم میں خود کو بہت تنہا اور اداس محسوس کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: نہ تمھیں میری کیفیت کا اندازہ ہے، نہ مجھے تمھاری حالت کا پتا ہے کہ تو کس حال میں ہے؟ جدائی اور فراق کے اِن لمحوں میں عید جیسا پُر مسرّت تہوار بھی خاموشی سے گزر جائے

گا۔ ایسے ہی جیسے اس سے قبل گزرا تھا۔ یہاں اب اور کے لیے الفاظ ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پہلے سے
اِس طرح کی خوشی کا موقع، یعنی عید کا دن انتظار اور جدائی کی حالت میں تڑپتے اور یاد کرتے گزر گیا ہے۔

شعر نمبر۲:

لغت: پو پھٹے (صبح دم)، یاس (نا امیدی، مایوسی)، گلِ حسرت (حسرت کا پھول)

تشریح: اِس شعر میں شاعر نے ہجر کی رات کے بعد مایوسی اور نا امیدی کے منظر کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: محبوب کی جدائی میں وہ بے چین اور بے قرار ہے، لیکن رات کے سناٹے میں؛ رات کی خاموش فضا میں محبوب کی یادوں کے سہارے وہ زندگی کی خوشیوں اور ان خوشیوں میں اُس سے ملنے کی آرزو جواں رکھے ہوئے تھا۔ اُس نے یادوں کے کتنے ہی حسین تاج محل تعمیر کیے ہوں گے، مگر اب صبح کا اُجالا طلوع ہونے کو ہے، وہ آرزوئیں اور حسرتیں جو رات کی خاموش فضا میں حسن و جمال کا پیکر بن کر شاعر کو دلاسا دینے کا سبب بن رہی تھیں، صبح ہوتے ہی حسرت کے پھول کی پتیاں بن کر فضا میں بکھر جائیں گی۔ اُسے ڈر ہے کہ صبح دم نا امیدی اور مایوسی کا جھونکا اس کے گلشنِ خیال سے گزرے گا، جس کے گزر جانے کے بعد اُس کی آخری امید کا دیا بھی بجھ جائے گا۔

شعر نمبر۳:

لغت: لچکتی ہوئی (بل کھاتی ہوئی)، نوخیز (نئی نویلی، تازہ)، تیغ (تلوار)، پہلو (دامن)

تشریح: شاعر اِس شعر میں پچھلے شعر کے مضمون کو آگے بڑھا رہا ہے۔ شاعر نے اِس شعر میں رات کی بے خواب آرزوؤں اور امیدوں کا ذکر تو نہیں کیا، لیکن رات جو سوچ بچار کا استعارہ ہوتی ہے، اُس میں ہر کوئی خیال وخواب کے تانے بانے بُنتا ہے۔ ایک عاشق رات کی خاموشی میں اپنے محبوب کو یاد کرتا ہے اور اُس کے تصور میں کھویا رہتا ہے۔ رات کا یہی منظر جب صبح کے اُجالے کی صورت میں اُترتا ہے، تو وہ صبح جو ایک طرف تازگی فرحت اور ٹھنڈک کا احساس لاتی ہے، وہ کچھ دیر کے بعد تپتے ہوئے سورج کا جلا دینا والا منظر بھی پیش کرتی ہے۔ لہٰذا شاعر کے نزدیک جیسے ہی صبح طلوع ہوگی؛ سورج چمکے گا؛ اُس کی بل کھاتی ہوئی سرخ روشنی جو کرن کی شکل میں اُترے گی، وہ تلوار بن کر میرے پہلو میں اُتر جائے گی۔ شاعر نے سرخ سورج کی کرن کو تلوار کہہ کر اپنے غموں اور دکھوں کے لیے خاتمے کی بنیاد بنایا ہے، گویا صبح ہوتے ہی اُس کے انتظار کی آخری گھڑی بھی ختم ہو جائے گی۔

لغت: تصور (خیال)، دل بدست آنا (دل ہاتھ پہ لیے آنا)، خاک بسر جانا (سر پہ خاک ڈالے جانا، بے مراد ہو کر چلے جانا)

تشریح: شاعر اپنے محبوب کی یادوں میں محو یہ بتا رہا ہے کہ: اے محبوب! تیری یاد بھی تیری طرح بے حد حسین ہے؛ تیرا تصور بھی تجھ جیسا حسین و جمیل ہے۔ میری سوچتی ہوئی آنکھوں میں تیرے خیال کی پری، جب بھی آتی ہے، تو جیسے اُس نے میرے لیے اپنا دل ہاتھ میں پکڑ رکھا ہو، مگر پھر خیال کی وہی پری اپنے سر پر خاک ڈال کر اور مایوس و بے مراد ہو کر لوٹ جاتی ہے، یعنی تیری یاد جاتے ہوئے مجھے دکھی کر جاتی ہے۔ اُس کا چلے جانا جدائی کی کیفیت میں ایسے محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی سخت صدمے کی حالت میں، آہ و فریاد کرتے ہوئے اپنے سر پر خاک ڈالتا ہے؛ بین کرتا ہے؛ سوگ مناتا ہے۔

دراصل یہاں شاعر محبوب کے محبت بھرے رویے کے جواب میں اپنی بے بسی اور مجبوری کا دکھ بیان کرتا ہے۔

شعر نمبر ۵:

لغت: درآئیں گے (چلے آئیں گے)، کھلتے چہرے (ایسے چہرے جو خوشی سے کھل رہے ہوں)

تشریح: اِس شعر میں شاعر نے اپنے اندر کی غم زدہ حالت کو پُر اثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اُس کے اندر خوشی کا سماں ہو، تو وہ باہر کی اداس فضا میں بھی خود کو مسرور رکھتا ہے۔

اس کے برعکس اگر اُس کا دِل اندر سے غم زدہ ہو، تو پھر اُس کے لیے باہر کی دنیا میں لاکھ خوشیوں کے میلے لگے ہوں، بیکار ہیں۔ ایسی ہی صورتِ حال سے شاعر دو چار ہے، اُس کے آس پاس گلیوں اور بازاروں میں ایسے لوگ آ جا رہے ہیں، جن کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے؛ جو پھولوں کی طرح مہک رہے ہیں؛ ہر طرف خوشیوں اور خوشبوؤں کا سلسلہ رواں دواں ہے، مگر اُس کا محبوب اُس سے جدا ہے اور اس کی جدائی: شاعر کے دل کو خوشی کے لمحوں میں بھی افسردہ بنائے ہوئے ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ اُس کی شاعری دل کی کلی کھلتے ہوئے چہروں کا ساتھ نہیں دے سکتی، وہ تو درد سے بھر گئی ہے، اُسے ان رونقوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ شاعر کے باطن میں اداسی کی جو لہر موجزن ہے، اُسے سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اِسی اداسی اور غم کی حالت کو بیان کرتے ہوئے اختر انصاری کہتے ہیں:

کون سمجھے گا مرے درد کو آہ
روح کا زخم کس نے دیکھا ہے

۸۔ شہزاد احمد

شہزاد احمد ۱۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو حافظ محمد بشیر کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور کے مختلف تعلیمی اداروں سے حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات کے مضمون میں ایم اے کیا۔ ازاں بعد دوسرا ایم اے فلسفے کے مضمون میں کیا۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۵ء کے دوران میں ہر دو مضامین میں ایم اے کرنے کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور کے جریدے 'راوی' کے مدیر کی حیثیت سے بھی اپنی فکری جولانی کا ثبوت دیا۔ ایم اے او کالج لاہور کی طلبہ یونین کے صدر بھی رہے۔ اسی کالج کی بریٹ فلاسوفیکل سوسائٹی کے سیکرٹری رہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اُبھرنے والے شعرا میں ایک نمایاں نام بن کر اُبھرے۔ ان کا اولین شعری مجموعہ 'صدف' کے نام سے منظرِ عام پر آیا، جس کا سال اشاعت ۱۹۵۸ء ہے۔ ۲۰۰۵ء تک ان کے تخلیقی کام کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

جلتی بجھتی آنکھیں (۱۹۶۹ء) ادھ کھلا دریچہ (۱۹۷۷ء) خالی آسمان (۱۹۸۵) بکھر جانے کی رُت (۱۹۸۷ء) 'ٹوٹا ہوا پل' (۱۹۹۳ء) کون اُسے جاتا دیکھے (۱۹۹۴ء) اُترے مری خاک پر ستارہ (۱۹۹۷ء) اندھیرا دیکھ سکتا ہے (۱۹۹۹ء) معلوم سے آگے (۱۹۹۸ء) ایک چراغ اور بھی (۲۰۰۴ء) 'آنے والا کل' (۲۰۰۵ء) اُردو شعری مجموعے، جبکہ جاگن والی رات (۱۹۹۶ء) پنجابی شعری مجموعہ شامل ہے۔

سائنس، نفسیات اور فلسفے کے ضمن میں تصنیف و ترجے کی شکل میں ان کی جو کتب شائع ہو چکی ہیں، ان کی تعداد بیس کے قریب ہے۔

انسانی ذہن کے بارے میں جدید تر نظریات کے مطالعے سے متعلق ایک کتاب 'ذہنِ انسانی کا حیاتیاتی پس منظر' کا نام پا کر ۱۹۸۷ء میں مقتدرہ قومی زبان کی جانب سے شائع ہوئی۔

ملازمتی ذمہ داریوں کے ضمن میں پاکستان نیشنل سنٹر اور پاکستان ٹیلی وژن سنٹر لاہور سے ان کی وابستگی رہی۔ مختلف تجارتی اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ آج کل ادارہ مجلس ترقیِ ادب لاہور میں ناظم کے طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شہزاد احمد ان شاعروں میں سے ہیں، جنھیں تقسیم کے بعد غزل کے اہم ترین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شہزاد احمد جدید اُردو غزل کے ایسے بنیاد گزاروں میں ہیں، جنھوں نے غزل کے رسمی موضوعات سے ہٹ کر اسے تخلیقی امکانات کے نقش اُبھارے اور اپنی شاعری میں ذاتی اسلوب ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی غزل فکری تہہ

داری اور حیات و کائنات سے جُڑے ہوئے مسائل و معاملات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتی رہی۔ اس میں سوچنے کا انداز اور چیزوں کو دیکھنے کا رویہ سطحی اور عمومی طرز کا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں معنوی جہتوں کے خصوصی زاویے اُبھرتے ہیں۔ ان کی غزل تہذیب کی زندہ روایات کی امین ہے۔ شہزاد احمد شائستہ، متین اور صاف لب و لہجے کی غزل کہتے ہیں، مگر ان کی بظاہر سادہ اور رواں دواں شاعری میں بھی ایک جہانِ معانی آباد ہوتا ہے۔ سائنسی علوم اور فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ ان کی شاعری جمال آفرینی کے پیکر تراشتی ہے۔

۸.۱ غزل:

سچ ہے کہ بندگی کا حق ہم نے ادا نہیں کیا
اپنے کرم کے باوجود، تُونے بھی کیا نہیں کیا

جس نے بھی عاجزی نہ کی، اُس سے بھی کچھ خفا ہے تُو
وہ بھی گنہگار ہے، جس نے گلہ نہیں کیا

اپنی تو ہیں کمائیاں، روز کی جگ ہنسائیاں
وہ بھی تو ہم سے خوش نہیں، جس کو خفا نہیں کیا

کیسی بھی تلخ بات تھی، پھر بھی زباں پہ آگئی
خود ہی شکار ہوگئے، تیر خطا نہیں کیا

چھوڑیے یہ حکایتیں، اوروں سے کیا شکایتیں
آپ سے کیا نہیں ہُوا، آپ نے کیا نہیں کیا

۸.۲ تشریحات:

شعر نمبر ۱:

لغت: کرم (مہربانی، لطف و عنایت)، بندگی (عبادت)، کیا نہیں کیا؟ (یعنی بہت کچھ کیا، شکوے کا انداز)

تشریح: شاعر اپنے خالق سے شکوے کے انداز میں مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ: اے خدا! بے شک ہم سے بندگی کا اُس طرح تو حق ادا نہیں ہوا، جیسا کہ ہم پر فرض تھا، گویا بقولِ غالب:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مگر ہماری اس کوتاہی کی کوئی وجہ بھی ہے، ہم پر سو سو طرح کی ذمہ داریاں ہیں۔ ہم کمزور اور عاجز بندے ہیں؛ خطا کار ہیں۔ تو نے ہمارے جینے میں طرح طرح کی مجبوریاں رکھ دی ہیں۔ زندگی کے ہزار سلسلے ہیں، جنھیں مختصر سی عمر میں نبھانا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر مشکلات اور دکھ ہیں، ایسے میں عبادت کا صحیح انداز میں ہم سے حق ادا نہیں ہوا، لیکن تُو تو مختارِ کل ہے، تیری مہربانیاں ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہیں؛ تیری رحمتوں کا کوئی حساب نہیں ہے؛ تیرے کرم کی کوئی حد نہیں، تو چاہتا؛ تو ہمیں تمام فکروں اور مسائل سے آزاد کر سکتا تھا، مگر تُو نے بھی ہمیں ہزار طرح کے امتحانوں اور آزمائشوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

شعر نمبر ۲:

لغت: عاجزی (عاجز ہونا، خود کو بے بس اور مسکین سمجھنا)

تشریح: یہ شعر بھی پہلے شعر کے موضوعاتی رُخ کا تسلسل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی سے سر جھکائے رکھنا؛ سچے دل سے اس کی عبادت کرنا؛ اُسی سے مدد طلب کرنا؛ ہر حال میں اُس کا شکر بجالانا اور تنگی و مصیبت میں بھی اُس کی ذات کو پکارنا، عینِ بندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے عاجز بندے کی اِس ادا کو پسند کرتا ہے۔ اِس کے برعکس وہ شخص، جو اِس نوع کا طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا۔ اُس کی نعمتوں، برکتوں اور رحمتون کے باوجود اُس کا گلہ کرتا رہے، اُس پر جب کوئی ناگہانی آفت آپڑے؛ کوئی مشکل اُسے گھر لے، تو وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا شکوہ کرے، وہ تو خطا کار ہے، مگر جو گلہ نہیں کرتا، وہ بھی گنہگاروں کی صف میں شامل ہو جائے۔ یہ سب کچھ عاجز بندے کی سوچ سے ماورا ہے؛ وہ اِس راز کو نہیں سمجھ سکتا۔ شاعر کے نزدیک خطا کار اور بے خطا کے درمیان گلہ کرنے اور گلہ نہ کرنے سے جو فرق پڑتا ہے، اُس کا نتیجہ اور ردِ عمل مختلف ہونا چاہیے۔

شعر نمبر ۳:

لغت: جگ ہنسائیاں (دنیا کے لیے ہنسی کا سامان)

تشریح: شاعر اپنے اردگرد کے ماحول میں بسنے والے انسانوں کی عام روش کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ ہمارے

ہاں ایک دوسرے سے بے تعلقی کی جو فضا پیدا ہو چکی ہے۔ اُس نے ہر شخص کو ایک عجیب بے چینی اور خدشے کا شکار کر دیا ہے۔ جسے دیکھو ایک مسلسل اضطراب اور لیے دیے انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ ایسے غیر یقینی حالات اور ماحول میں ایک حساس اور مخلص شخص خود کو ایک عجوبہ خیال کرتا ہے۔ اسے رہ رہ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے لوگ بلاوجہ اُس پر ہنس رہے ہیں، حالانکہ لوگوں کی اِس عمومی عادت میں اُس کا کوئی قصور نہیں، یعنی اُس نے لوگوں کو یوں بلاوجہ غصّے کی کیفیت میں مبتلا نہیں کیا؛ اُس نے کسی کو ناراض بھی نہیں کیا ہوتا، پھر بھی اُسے یوں لگتا ہے، جیسے وہ عزیز ترین احباب جو اُس کے حلقے کے لوگ ہیں، وہ بھی اُس سے خوش نہیں ہیں، حالانکہ اُس نے اُنھیں شکایت کا کوئی موقع بھی نہیں دیا ہوتا۔ ہر شخص جو اپنے آپ سے ناراض ہے، دراصل وہ اپنی ناراضگی کا سبب کسی کو سمجھ رہا ہے اور اس میں شاعر کی ذات بھی شامل ہے۔

اقبال نے کچھ ایسی ہی کیفیت کو دیکھتے ہوئے کہا تھا:

اپنے بھی خفا مجھ سے تو بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی نہ سکا قند

شعر نمبر ۴:

لغت: تلخ (کڑوی، تُرش)، تیر خطا ہونا (تیر کا بے کار چلے جانا)

تشریح: روز مرہ زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر کتنی ہی تلخ اور ترش باتیں ایسی ہیں، جو ہمارے باہمی معاملات کے دوران سنی اور کہی جاتی ہیں۔ ان کا اظہار لوگوں کے عمومی روّیے کی نشان دہی کرتا ہے اور ایک حسّاس شخص اِن تلخ باتوں سے اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا، اِس کے علاوہ کوئی بھی شخص جن تلخ تجربات سے گزرتا ہے۔ اُن کے [illegible] سے عموماً گریز کرتا ہے: کوئی شکایت لبوں تک نہیں لاتا، لیکن [illegible] [illegible] ہے۔ کیونکہ سچ سننے کی تاب نہیں [illegible] ہوتی۔ یوں وہ اپنے ہی [illegible]

اِسے شاعر نے زبان سے نکلے ہوئے ایک ایسے تیر سے تعبیر کیا ہے، جو اظہار کرنے والے کو شکار کر لیتا ہے۔ شاعر کے نزدیک تیر خطا نہیں ہوا، چلانے والا خود ہی اُس کا نشانہ بن گیا ہے۔

علامہ اقبال کو ''سر'' کا خطاب کب دیا گیا۔

اقبال کے کوئی سے چار شعری مجموعوں کے نام لکھیں۔

اقبال اور فیض کے استاد کا نام بتائیں۔

فیض احمد فیض کس ادبی تحریک سے وابستہ تھے۔

احمد ندیم قاسمی کے مطابق روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

'ہجرت' کس غزل گو شاعر کا اہم موضوع ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح لکھیں۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا مرا تنہا ہونا
آتش و آب کا ممکن نہیں یک جا ہونا

جو بھی ہم درد بن کے آتے ہیں
غم کا احساس ہی جگاتے ہیں

سرخ سورج کی لچکتی ہوئی نوخیز کرن
تیغ بن کر مرے پہلو میں اتر جائے گی

ح۔ قاسمی کے مطابق روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا کیا معنویت رکھتا ہے؟

ط۔ احمد فراز کو آشنا کے ہوتے ہوئے آشنا کی طلب کیوں ہے؟

ی۔ لوگ سروں پر ہما ہوتے ہوئے بھی کاسہ بدست کیوں پھرتے ہیں؟

۲۔ شعر مکمل کریں۔

الف: دل بینا بھی کر خدا سے طلب ....

ب۔ ناصبوری ہے زندگی دل کی ....

ج۔ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے ....

د۔ سرخ سورج کی لچکتی ہوئی نوخیز کرن ....

ر۔ جو بُرائی تھی مرے نام سے منسوب ہوئی ....

س۔ نہ کر کسی پہ بھروسہ کہ کشتیاں ڈوبیں ....

ش۔ جو بھی ہمدرد بن کے آتے ہیں ....

۳۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

الف۔ علامہ اقبال کی غزل کا دوسرا شعر

ب۔ فیض احمد فیض کی غزل کا چوتھا شعر

ج۔ احمد ندیم قاسمی کی غزل کا پہلا شعر

د۔ شکیب جلالی کی غزل کا دوسرا شعر

ہ۔ ظفر اقبال کی غزل کا تیسرا شعر

یونٹ نمبر......۷۔۸

نظمیں

تحریر: گوہر رحمٰن نوید
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

فہرستِ مضامین

۵.۴۔ خلاصہ

۵۔ ن م راشد

۵.۱۔ میں اے واقف الفت نہ کروں [نظم]

۵.۲۔ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی

۵.۳۔ تشریحات

۵.۴۔ مرکزی خیال

۵.۵۔ خلاصہ

۶۔ مجید امجد

۶.۱۔ نفیرِ عمل [نظم]

۶.۲۔ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی

۶.۳۔ تشریحات

۶.۴۔ مرکزی خیال

۶.۵۔ خلاصہ

۷۔ منیر نیازی

۷.۱۔ اپنے شہروں کے لیے دُعا [نظم]

۷.۲۔ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی

۷.۳۔ تشریحات

۷.۴۔ مرکزی خیال

۷.۵۔ خلاصہ

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا

۸.۱۔ کوندا [نظم]

۸.۲۔ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی

۸.۳۔ تشریحات

۸.۴۔ مرکزی خیال

۸.۵۔ خلاصہ

☆ خود آزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

اس یونٹ میں آپ بیسویں صدی کے آٹھ نمایندہ نظم نگاروں کی نظموں کا مطالعہ کریں گے۔ یہ نظمیں موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں اسلام، پاکستانی اور انسانی زندگی کے مختلف اور متنوع رنگ اپنی فکری اور معنوی جہات کا منظرنامہ پیش کرر ہے ہیں۔ یہ نظمیں مختلف ہیئتوں اور اسالیب کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ ان کے تناظر میں مختلف شعرا کے فکروفن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ شعرا کے احوال وآثار سے آگاہ ہوسکیں۔

۲۔ شامل نصاب نظموں کے مفاہیم سے متعارف ہوسکیں۔

۳۔ شاملِ نصاب نظموں کی تشریح کرسکیں اور ان کے خلاصے تحریر کرسکیں۔

۱۔ علامہ محمد اقبال

اقبال کے زمانے میں مسلمان بے عملی اور سستی و کاہلی کے ساتھ توہم پرستی کا شکار ہوکر بہت ذلیل وخوار ہورہے تھے۔ان حالات میں اقبال کی شاعری گرداب میں پھنسی ہوئی کشتیِ اسلام کا ناخدا بن گئی انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کو تلاطم خیز موجوں سے ٹکرانے کا درس دیا، بلکہ طوفان حوادث کا رخ موڑنے کے راز بھی بتادیے۔

عبدالرحمان بجنوری بالکل بجا فرماتے ہیں۔"مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان ایک مسیحا بن کر آئے، جس نے مُردوں میں زندگی کے آثار پیدا کردیے۔

ذیل میں اقبال کی شاعری کی چند بڑی خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ خودی:

اقبال کی شاعری کے اہم موضوعات میں خودی کو اولیت ومرکزیت حاصل ہے۔خودی کا مطلب ہے اپنے نفس اور اپنی ذات کا مکمل شعور۔حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، تو بیشک اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

گویا عرفانِ ذات عرفانِ خداوندی بن جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبال نے خودی کے فلسفے کو اپنی فکر کے مرکزی نکتے کی حیثیت دی۔

اقبال نے خودی کے تین مراحل بیان کیے ہیں:(۱) اطاعتِ الٰہی (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی

۲۔عشق:

اقبال خودی کی تکمیل کے لیے عشق کو ضروری سمجھتے ہیں۔وہ عقل کی افادیت سے انکاری نہیں، لیکن عشق کو اولیت دیتے ہیں۔ان کے نزدیک عشق ہی سے چیزوں کی حقیقت کا مکمل علم اور صحیح بصیرت حاصل ہوتی ہے۔اس کے علاوہ دنیا کے تمام ناقابلِ یقین کام عشق کی وجہ سے ممکن ہوسکے ہیں۔علم اور عقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتے ہیں، لیکن عشق کے بغیر منزل کو طے نہیں کراسکتے۔

۳۔مردِ مومن: اقبال نے اپنے کلام میں مردمومن کی صفات اور خصوصیات کو بھی کافی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہ مردِ مومن وہی ہے، جس نے اپنی خودی کی پوری طرح تشکیل کی ہے اور خودی کے تینوں مراحل سے گزرنے کے بعد اسے

اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ اقبال کا یہ مردِ مومن قرآنِ کریم سے ماخوذ ہے۔ مردِ مومن اسلامی تعلیمات کے مطابق سچا، پکا اور بالغ نظر مسلمان ہے۔ یہ مردِ مومن کائنات کا کامیاب ترین انسان ہے۔ اس میں تجدیدِ حیات، جذبۂ عشق، جہد و عمل، جمال و جلال، حق گوئی و بے باکی، فقر و استغنا اور خودی و خودداری مکمل طور پر موجود ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

۴۔ شاہین:

اقبال کے مردِ مومن میں شاہین کی تمام خصوصیات بھی موجود ہیں۔ اس کی نگہ بلند، سخن دلنواز اور جان پر سوز ہے۔ وہ کسی کے سامنے جھولی نہیں پھیلاتا؛ نہ مانگی ہوئی چیزیں کھاتا ہے، بلکہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ وہ دنیا کے کسی لالچ میں نہیں آتا؛ نہ ہی موسموں کی تبدیلیاں اس کو اپنے اعلیٰ و ارفع مقاصد سے روک سکتی ہیں۔ اس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔

پرواز ہے دونوں کا اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

۵۔ مغربی تہذیب پر تنقید:

اقبال مسلمانوں کو مغربی تہذیب سے دور رہنے کا درس دیتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان فرماتے ہیں کہ:
اقبال کو اہلِ یورپ سے شکایت ہے کہ انھوں نے ذہنی تربیت کے ساتھ دل کی تربیت کی طرف توجہ نہ کی۔ تہذیبِ فرنگی مادی آسائشوں پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ روحانی زندگی کے تقاضے پس پشت ڈال دیے۔

اقبال کے نزدیک خالص مادیت کی بنیاد پر کسی تہذیب کو استحکام نصیب نہیں ہوسکتا۔وہ مغربی تہذیب پر اس طرح تنقید کرتے ہیں:

یورپ میں بہت روشنی علم وہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

مغربی تہذیب نہ تو سرمایہ داری پر قابو پاسکی، جس کی بنیاد معاشی استحکام پر ہے اور نہ سائنس اورٹکنالوجی کو اخلاقیات کے تابع بناسکی، اس لیے اقبال پکار اٹھے:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

۸۔اتحادِ عالمِ اسلام:اقبال دنیا بھر کے مسلمانوں کو حرمِ کعبہ کی حفاظت کے لیے اکٹھا کرنا چاہتے ہیں۔انھوں نے مسلمانوں کو پیغام دیا کہ جب تک وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے نہیں تھامیں گے، تب تک وہ ترقی نہیں کرسکتے۔انھوں نے مسلمانوں سے شکوہ کیا کہ وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔اسی نااتفاقی کی وجہ سے مغربی طاقتیں ہمارے مسلم علاقوں پر قابض ہوئیں اور ہم صدیوں کی حکمرانی کے بعد غلام بنادیے گئے۔اقبال کو غلامی سے شدید نفرت ہے۔انھوں نے کہا کہ اگر آج بھی مسلمانوں میں ایمانِ ابراہیمی پیدا ہوجائے، تو آگ کے اندر گلستان پیدا ہوسکتا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کا شغر

۹۔عشقِ رسول اللہؐ:

اقبال کو حضرت محمدؐ کی شخصیت میں کاملیت و جامعیت مکمل طور پر نظر آتی ہے۔انھوں نے رسولِ اکرمؐ سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر صابر کلوروی فرماتے ہیں۔''اقبال کے کلام میں حیرت

انگیز تاثیر کا اصل راز ان کا عشقِ رسولؐ ہے۔ نظم جوابِ شکوہ میں انھوں نے عشق رسولؐ کو اس کائنات کا مرکزی ستون قرار دیا ہے''۔

اقبالؔ فرماتے ہیں کہ دنیا میں اجالا صرف اسم محمدؐ کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے، لیکن اس کے لیے عشق کی قوت شرط ہے، جو ہر پست کو بالا کردیتی ہے:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

۱.۱ مردِ مسلمان (نظم):

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
فطرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

۱.۲ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی:

لحظہ: لمحہ۔ غفاری: بخشنے والا۔ آن: ادا۔ شان: عزت۔ گفتار: بات چیت۔ برہان: دلیل۔ قدوسی: گناہوں سے پاک، فرشتہ صفت۔ جبروت: عظمت و بزرگی۔ عناصر: اصل اجزا۔ ہمسایہ: پڑوسی۔ جبریل امیں: ایک فرشتہ جو اللہ تعالیٰ کی امانت، یعنی وحی پیغمبروں کی طرف لاتا ہے۔ بندۂ خاکی: مٹی سے بنا ہوا، یعنی انسان۔ نشیمن: ٹھکانہ، گھر۔ بخارا: ترکستان کا ایک شہر، جو ایک زمانے میں علم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ بدخشاں: افغانستان کا ایک شہر، جس کے لعل و یاقوت بڑے مشہور تھے۔ عیار: کسوٹی۔ میزان: ترازو، جگرِ لالہ: لالہ کے پھول کا کلیجہ۔ دہل جانا: خوف کے مارے کانپنا۔ سرودِ ازلی: کائنات کی پیدائش کے وقت سے چھیڑا گیا گیت، ہمیشہ کا ترانہ۔ شب و روز: رات اور دن، مراد ہے، چوبیس گھنٹے۔ آہنگ: گانے کا الاپ، نغمہ۔ یکتا: بے مثال۔ صفت: مانند۔ سورۂ رحمان: قرآن کریم کے ۲۷ ویں پارے میں ۵۵ نمبر سورت ہے، جو اپنی فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ کارگہِ فکر: فکر و خیال کا کارخانہ۔ انجم: ستارے۔ مقدر کا ستارا: علم نجوم کے مطابق اس ستارے کو کہتے ہیں، جو انسان کی قسمت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۱.۳ تشریحات:

شعر(۱):

تشریح: پہلے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ مردِ مومن ہر لحہ نئے رنگ میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ پل پل میں اس کے اندر تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے اور اس کا ہر روپ پہلے سے زیادہ دلکش ہوتا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو بات بات میں اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حوالہ دیتا ہے۔ وہ کبھی بھی جھوٹی اور بے کار کی باتیں نہیں کرتا۔ اس کا ہر قول اور ہر عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اس کی گفتگو سن کر اور کردار دیکھ کر لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی کے طور پر موجود ہوتا ہے۔

شعر (۲):

تشریح: اس شعر میں اقبال نے مردِ مومن کی چار صفات بیان کی ہیں۔ انھی چار عناصر سے مردِ مومن کی ذات مکمل ہوتی ہے۔ ان عناصر میں پہلا عنصر قہاری ہے۔ مردِ مومن اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن اس کو دیکھ کر سہم جاتے ہیں اور اس سے مقابلے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دوسری صفت غفاری ہے۔ مرد مومن کی پہلی صفت سے اگرچہ قہر اور خوف ظاہر ہوتا ہے، تو اس کی دوسری صفت کا مطلب ہے بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔ مردِ مومن اپنے بھائی بندوں کی غلطیوں پر غضبناک نہیں ہوتا، بلکہ ان کی خطاؤں کو معاف کرتا رہتا ہے۔ یہ بھی صفتِ خداوندی ہے۔ مردِ مومن کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ گناہوں سے پاک ہوگا۔ اس کا دل نفسانی خواہشات اور آلودگیوں سے مکمل طور پر صاف ہوگا۔ یہ چیز اطاعتِ الٰہی اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بدولت ملتی ہے اور چوتھی صفت یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں خدا کی عظمت ہمیشہ موجود رہے گی۔ مردِ مومن اللہ تعالیٰ کو ہی ہمیشہ سپر پاور کے طور پر اپنا آقا و خالق تصور کرتا ہے۔ اس کا سر غیر اللہ کی بجائے صرف ربِ کعبہ کے سامنے جھکا رہتا ہے۔

شعر (۳):

تشریح: مردِ مومن اگرچہ خاک سے بنا ہوا ہوتا ہے، لیکن جب وہ خودی کی منزلیں طے کر کے بلندی کی طرف جاتا ہے ،تو وہ عرش کا مکین بنتا ہے ،تو وہاں وہ جبریل علیہ السلام کا پڑوسی بن جاتا ہے۔ اس کا گھر زمین میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ عرش پہ اللہ تعالیٰ کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے۔ مردِ مومن: دنیا کی جغرافیائی حد بندیوں سے نکل کر ماورا ہو جاتا ہے۔ وہ وطن دوست تو ہوسکتا ہے، وطن پرست ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ وطن کے جغرافیائی تصور کا اسیر ہو کر کسی مخصوص علاقے سے وابستہ ہوتا ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ساری دنیا کو اپنا وطن تصور کرتا ہے۔ بخارا و بدخشاں کے خوب صورت شہر اس کی عالمگیر سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ وہ اس دنیا کی جکڑ بندیوں اور پابندیوں سے آزاد ہو کر قربِ الٰہی کے حصول میں کوشاں رہتا ہے۔

شعر (۴):

تشریح: یہ راز آج تک کوئی نہ جان سکا کہ مردِ مومن جو بظاہر قرآنِ پاک پڑھتا ہے اور اس کی قرآت کرتا ہے

،درحقیقت وہ بذاتِ خود قرآن ہی ہے، یعنی اس کی پوری زندگی قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ مردِ مومن کی زندگی کے سارے کام قرآنِ پاک کی تعلیمات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی قرآنِ کریم کی عملی تفسیر ہوتی ہے۔ وہ چونکہ قرآنی احکامات پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہوتا ہے، اس لیے مردِ مومن چلتا پھرتا قرآن معلوم ہوتا ہے۔

شعر(۵):

تشریح: مردِ مومن عدل وانصاف کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کے ارادے قدرت کے مقاصد کی کسوٹی ہوتے ہیں۔ اگر قدرت کے ارادوں اور مقاصد کے بارے میں کوئی جاننا چاہتا ہے، تو اسے مردِ مومن کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ خدا کی مرضی کیا ہے؟ یہ مردِ مومن کے عزائم اور اعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ ترازو ہوتا ہے اور قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ کا ترازو بنے گا، یعنی مردِ مومن کی زندگی سے ہی کسی چیز کے صحیح اور غلط ہونے یا کھرا اور کھوٹا ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اسے نیکی اور بدی کو پرکھنے والی کسوٹی قرار دیا ہے۔ مردِ مومن ہی دنیا میں عدل وانصاف کے ذریعے امن وامان اور ترقی وخوشحالی کا باعث بنتا ہے۔

شعر(۶):

تشریح: اس شعر میں اقبال نے مردِ مومن کی مزید دو خصوصیات کا ذکر کیا ہے، جس میں ایک جمال اور دوسری جلال ہے۔ جب وہ محفل میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے، تو میٹھی اور شیریں زبان کے ساتھ نرم گفتگو کرتا ہے اور ہر سننے والے کا دل موہ لیتا ہے۔ وہ فضول بکواس نہیں کرتا، بلکہ اس کی بات چیت سے لوگوں کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے، لیکن دوسری طرف وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کا مذاق اڑاتے ہیں، تو ان کے لیے مردِ مومن کا وجود ایک تند وتیز طوفان کی طرح ہوتا ہے، جس سے کافروں کے دل خوف کے مارے کانپنے لگتے ہیں۔ کافروں کو تو چھوڑ و کائنات کی بے جان چیزیں: دریا، پہاڑ اور پتھر تک مردِ مومن کے ڈر کی وجہ سے سہمے رہتے ہیں۔ اس بات کو اقبال نے ایک اور مقام پر یوں بیان کیا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شعر(۷):

تشریح: اگر مومن کے شب و روز کو غور سے دیکھا جائے، تو اس میں فطرت کا ترانہ سننے کو ملتا ہے۔ مومن کی زندگی اس گیت کی طرح دل کش ہوتی ہے، جو قدرت نے ازل سے چھیڑا ہے، یعنی اس کی زندگی کے لمحات میں وہی ہم آہنگی، توازن اور دلکشی پائی جاتی ہے، جو کائنات کے اس نظام میں ابتدا سے موجود ہے۔ قرآنِ کریم کی سورۂ رحمٰن اپنے آہنگ اور سُر کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ دیگر سورتوں کے مقابلے میں یہ اپنے ترنم اور وزن و بحر کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ جو زیر و بم اور آہنگ اس سورت میں موجود ہے، وہ دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں ملتا، لیکن مردِ مومن کی باتوں اور قول و فعل میں یہ سر اور لے پائی جاتی ہے۔

شعر(۸):

تشریح: اقبال اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میری فکر کی جو دنیا ہے، اس میں کوئی بھی کم قیمت چیز موجود نہیں، بلکہ میری فکر کے کارخانے میں نت نئے ستارے تخلیق ہوتے ہیں۔ میری مفید اور کارآمد سوچ سے مسلمانوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں اپنی شاعری کے ذریعے زندگی کے حقائق اور کائنات کے پوشیدہ راز کھول رہا ہوں۔ اے مردِ مسلمان! اگر تو میری ان تعلیمات پر غور کر کے اس پر عمل پیرا ہو، تو تیری تقدیر بدل سکتی ہے۔ شعر میں 'کارگہِ فکر' سے مراد اقبال کی شعری استعداد اور 'انجم' سے مراد اقبال کے اشعار ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے کہ میرا تخیل جو ستارے بنا رہا ہے، ان میں سے آپ کو اپنے عروج کا ستارا پہچان لینا چاہیے۔ مطلب یہ کہ میں نے اپنی شاعری کے ذریعے جو راہیں اور منزلیں مسلمان کو دکھائی ہیں، ان میں سے اس کو اپنی تقدیر سنوارنے والے رستے کی تلاش کر کے اس پر چلنا چاہیے تاکہ وہ کامرانی کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

۱.۴ مرکزی خیال

نظم ''مردِ مسلماں'' میں اقبال نے بہت بلیغ اور جامع انداز میں اپنے مثالی انسان 'مردِ مومن' کے افکار و خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن دنیاوی جلال و جمال کے ساتھ اخروی کامیابیوں و کامرانیوں کا بھی ایک حسین اور دل کش مرقع ہے۔ یہ وہ انسانِ کامل ہے، جو اپنی خودی کی تکمیل کر چکا ہے اور اب اس نے اپنی زندگی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ مبارک کے مطابق ڈھالا ہے، اس لیے وہ ہر جگہ کامیاب اور سرخ رو ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر

ہم مسلمان اپنی زندگی کو قرآن وسنت کے احکامات کے مطابق بنانے کی کوشش کریں، تو دنیا و آخرت کی فتح ہماری مقدر بنے گی۔

1.5 خلاصہ:

علامہ اقبال کی شاعری اسلامی تعلیمات اور اسلامی افکار سے بھری پڑی ہے۔نظم 'مردِ مسلماں' بھی ان کی اس شاعری کے سلسلے کی ایک نمایاں کڑی ہے، جس میں وہ مسلمان کو مردِ مومن کے عظیم روپ میں دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ یہ نظم علامہ کی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ فکری پختگی کے دور کی ایک اہم دستاویز ہے۔اقبال مسلمان مرد کی صفات کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ مردِ مومن کا ہر قول وفعل اپنے رب کے احکامات کا تابع ہوتا ہے۔قہاری وغفاری اور قدوسی و جبروت کے عناصر سے ہی مردِ مومن کا وجود قائم ہوتا ہے۔وہ دوستوں کی محفل میں ریشم کی طرح نرم، جبکہ حق و باطل کے معرکے میں فولاد بن جاتا ہے۔مومن بظاہر قرآن پڑھنے والا نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت وہ خود قرآن ہے۔فطرت کے مقاصد کی تکمیل اور دنیا میں حق وانصاف کا نظام صرف مردِ مومن ہی قائم کرسکتا ہے۔

مردِ مومن سُر اور لے اور بول چال میں سورۂ رحمٰن کی طرح بے نظیر و بے عدیل ہوتا ہے۔اقبال کو مردِ مومن کی اصل صورت صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں نظر آتی ہے، اس لیے وہ مسلمان کو صفاتِ محمدیؐ کے اپنانے کا درس دیتے ہیں۔نظم کے آخر میں اقبال اپنی فکر اور شاعری کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ: اے مسلمان! آپ کو میرے افکار اور میری سوچ میں پرورش پانے والے ان خیالات سے استفادہ کرنا چاہیے جو آپ کو عروج اور بلندی تک بآسانی پہنچا سکتے ہیں۔

۲۔ اختر شیرانی

اختر شیرانی اردو ادب کے مشہور محقق حافظ محمود شیرانی کے گھر ۱۹۰۶ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ فارسی کا علم انھوں نے صابر علی شاکر سے حاصل کیا اور انھی کے صحبت نے اختر کو شاعری کی طرف مائل کیا۔ ۱۹۲۰ء میں اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اپنی آزادانہ روی کی وجہ سے باقاعدہ تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ محمود شیرانی جب نقل مکانی کر کے لاہور آئے، تو یہاں اختر کی شاعری کو پھلنے پھولنے کے بھرپور مواقع میسر آئے اور شاعرانہ حیثیت سے ان کی شہرت ہوگئی۔ حکیم نیر واسطی ان کی شاعری کے متعلق یوں فرماتے ہیں:

''اختر کی شاعری ایک ایسے رنگین ماحول پر مبنی ہے، جس میں سے ان کے شعر کو وہ تمام مواقع میسر آگئے، جنھوں نے صحیح معنوں میں ان کو اس دور کی رومانی شاعری کا پیغمبر بنا دیا''۔

لاہور میں کچھ عرصہ ادبی رسالے 'ہمایوں' کی ادارت کی۔ بعد میں ایک پرچہ 'خیالستان' خود بھی نکالا، جو زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۴۱ء میں 'شاہکار' کے ادارتی فرائض سنبھالے۔

۱۹۴۸ء میں وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہوئے۔

رومانویت:

اختر شیرانی کے ہاں رومانیت احساس کی شدت، محبت کی سماجی اور معاشرتی بندھنوں سے آزادی، تخیلی اور مثالی دنیا کی تعمیر اور فطرت سے لگاؤ سے پھوٹی ہے۔ وہ اپنی ایک نظم 'میرا موجود مشغلہ' میں اپنی رومانیت کے ایک خاص جزو، یعنی محبت کے بارے میں با آواز بلند یوں فرماتے ہیں:

ادب سے جا کے کہنا اے صبا اس شوخ پُر فن سے
کہ روماں اور محبت مشغلہ ہے میرا بچپن سے
محبت کے لیے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل میں
محبت ابتدا میری ، محبت انتہا میری
محبت ہی سے قائم ہے بقا میری ، فنا میری

موسیقیت اور غنائیت:

اختر شیرانی کی شاعری کی روح رواں اور بنیادی خصوصیت ان کی موسیقیت اور غنائیت ہے اور یہ غنائیت صرف انھی سے مخصوص ہے۔ ان کی شاعری میں موسیقیت کا طوفان امڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طوفان میں اس قدر جوش اور روانی ہے کہ پڑھنے والے کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ موقع ومحل کے مطابق مترنم الفاظ اشعار میں سموتے ہیں، اس لیے ان کے یہ الفاظ لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں، جن میں چمک اور کشش دونوں موجود ہیں۔ غنایت، نغمگی، شعریت اور موسیقیت کے حسین وجمیل امتزاج کا دوسرا نام اختر شیرانی کی شاعری ہے۔

فطرت پرستی:

اختر شیرانی کی رومانیت میں فطرت کو بھی بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ وہ مناظر قدرت کے بیان میں اپنے معجز رقم قلم کے ذریعے رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ ان کے رنگ بڑے شوخ ہیں۔ وہ اپنے تخیل سے فطرت کے حسن کو دوبالا کردیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ تشبیہ واستعارہ سے کام لیتے ہیں۔ یہ علامات رومانیت سے بھرپور ہوتے ہیں۔

اختر محض فطرت نگار ہی نہیں، بلکہ بہت بڑے فطرت پرست بھی ہیں اور اس فطرت پرستی میں ان کا خلوص، ہمت اور شوق شامل ہے۔ وہ فطرت سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔۔ ان کی نظمیں وادیٔ گنگا کی ایک رات، انتظار اور نورجہاں وغیرہ مناظر فطرت کے دلکش ترانوں سے بھری پڑی ہیں۔

انقلاب پسندی اور ماضی پرستی:

ہر رومانی شاعر انقلاب پسند ہوتا ہے۔ حالات کو بدلنے اور خوب صورت اور حسین دنیا کی تخلیق کی خواہش رومانی شاعر کے یہاں لازمی طور پر پائی جاتی ہے۔ اختر بھی حالات کو بدلنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی کثافتوں، ان کا اخلاقی دیوالیہ پن ،غلامی کی لعنت، رنج کی افراط اختر کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں، جن سے ان کا دل شکستہ ہو کر اس دنیا سے بددل ہوجاتا ہے اور اس کی کریہہ شکل کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

۲.۱ نغمۂ زندگی (نظم):

بربطِ کائنات پر، نغمہ سرا ہے زندگی مست نوا ہے زندگی
وادیٔ مہر و ماہ تک بال کشا ہے زندگی جلوہ نما ہے زندگی

جس کی کچھ ابتدا نہیں، جس کی کچھ انتہا نہیں — جس کو کبھی فنا نہیں
خواب گہہ فنا میں وہ موجِ صدا ہے زندگی — رقصِ صبا ہے زندگی

موسمِ شعلہ بار میں، دامنِ کشت زار میں — سینۂ کاشتکار میں
بن کے لہو کا اضطراب ہمہمہ زا ہے زندگی — نغمہ سرا ہے زندگی

جام ہیں مختلف تو ہوں، ان میں شراب ایک ہے — بادۂ ناب ایک ہے
سازِ فنا میں مشترک ایک صدا ہے زندگی — ایک نوا ہے زندگی

رہ رو راہِ ارتقا کے لیے اک مقام ہے — راہزنِ خرام ہے
لے کے عدم سے تا عدم ایک فضا ہے زندگی — راہ نما ہے زندگی

اس کی ہوائے تند پر تیر رہی ہے کائنات — مست شرابِ حیات
طائرِ دہر کے لیے ایک فضا ہے زندگی — کیا کہوں کیا ہے زندگی

۲.۳ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
بربط	خوشی کا ایک ساز	بال کشا	بال پھیلائے ہوئے
		جلوہ نما	جلوہ دکھانے والی
مست نوا	بے خود کردینے والی آواز	خواب گہ	خلوت خانہ
مہر و ماہ	سورج اور چاند	موجِ صدا	آواز کی لہر
رقصِ صبا	صبح کی ہوا کا ناچ	اضطراب	بے چینی
شعلہ بار	شعلے برسانے والی	شرابِ حیات	زندگی کی شراب
کشت زار	ہرا بھرا کھیت	ہمہمہ زا	آواز پیدا کرنے والی
بادۂ ناب	خالص شراب	راہِ ارتقا	آگے بڑھنے کا رستہ

ره رو	رستے پر چلنے ولا	راہزن	لٹیرا
خرام	ناز وادا کی چال	عدم	نیستی، نہ ہونا
راہ نما	رستہ دکھانے والا	ہوائے تند	تیز ہوا
طائر دہر	زمانے کا پرندہ		

تشریحات:

بند نمبر (۱)

تشریح: اختر شیرانی کہتے ہیں کہ کائنات کے باجے پر زندگی نغمہ گا رہی ہے اور وہ مستی میں مصروف ہے۔ دنیا کی حدود سے اُوپر آسمان کی وسعتوں میں چاند اور سورج میں بھی زندگی بال کھولے موجود ہے اور اس کے جلوے سب کو نظر آتے ہیں۔ یعنی زندگی کی رنگینیوں سے دنیا کا کوئی گوشہ محروم نہیں ہے۔

بند نمبر (۲):

تشریح: دوسرے بند کے اشعار میں شاعر فرماتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا اور انتہا کی کسی کو خبر نہیں۔ سب کچھ فنا پذیر ہے، لیکن زندگی برقرار رہتی ہے۔ زندگی میں ہی انسان خواب دیکھتا ہے اور آواز کی موجیں زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔ صبح کے وقت جو تازہ ہوا چلتی ہے، اس کے ساتھ بھی زندگی کا نزدیک ترین تعلق ہے۔

بند نمبر (۳):

تشریح: ایسا موسم جو شعلے برساتا ہے اور بہت زیادہ گرمی ہوتی ہے اور کھیت تپ رہے ہوتے ہیں، تو اس میں محنت کرنے والے کاشتکاروں کے سینوں میں بھی زندگی کی حرارت موجود ہوتی ہے۔ ان کی رگوں میں جو لہو دوڑتا ہے وہ دراصل زندگی کی سب سے بڑی علامت ہے۔ وہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اتنے دکھ برداشت کرتے ہیں۔ اُن کے دل میں زندگی نغمے گا رہی ہے۔

بند نمبر (۴):

تشریح: انسان مختلف صورتوں اور شکلوں کے ہوتے ہیں، مگر ان میں زندگی کا جذبہ ایک ہی طرح کارفرما ہوتا ہے۔ زندگی کی شراب ان تمام انسانوں کو ایک طرح سے متاثر کرتی ہے۔ دنیا کے تمام سازوں اور آوازوں میں جو قدر مشترک ہے اور جو آواز ایک ہے، وہ زندگی کی آواز ہے، جو دور ہی سے پہچانی جاتی ہے۔

بند نمبر (۵)

تشریح: وہ شخص یا مسافر جو آگے بڑھنے کے رستے پر جا رہا ہوتا ہے، اس کے لیے زندگی ایک مقام کا درجہ رکھتی ہے، یعنی وہ ستانے کے لیے یہاں پڑاؤ ڈال سکتا ہے۔ اگلے جہاں سے لے کر اس جہاں تک اور پھر اگلے جہاں تک زندگی ایک ایسی فضا ہے، جو انسان کی راہنمائی کر سکتی ہے۔

بند نمبر (٦):

تشریح: یہ زندگی کی ہوائیں ہی ہیں، جس کی وجہ سے کائنات کی خوب صورتی اور گہما گہمی برقرار ہے؛ زندگی کی شراب کی وجہ سے سب چیزیں مست ہیں۔ زمانے کے پرندے کے لیے زندگی ایک فضا اور ماحول کا درجہ رکھتی ہے۔ زندگی کے آسمان پر انسان پرواز کر سکتا ہے اور اس کے لیے مشکلات بھی موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود آدمی ان مشکلات پر قابو پا کر آگے بڑھتا ہے اور زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ الغرض شاعر کہتا ہے کہ میں مزید کیا بتاؤں کہ زندگی کیا ہے؟

۲.۴ مرکزی خیال:

اختر شیرانی نے اس نظم میں زندگی کے مختلف رنگ بیان کیے ہیں اور کہا ہے کہ کائنات کے سارے ہنگامے زندگی کے مرہونِ منت ہیں۔ سازِ فنا میں زندگی ہی ایک مشترکہ ساز ہے۔ ہر زندہ چیز میں اس کے اثرات خون بن کر دوڑ رہے ہیں اور اس کی کارفرمائیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔

۲.۵ خلاصہ:

اختر شیرانی کی نظم 'نغمۂ زندگی' ہیئت کے اعتبار سے ایک مستزاد نظم ہے۔

نظم میں بھی انھوں نے فلسفہ وفکر کی گتھیاں نہیں سلجھائیں، بلکہ عام اندازِ بیان کے ساتھ زندگی کے نغمے پیش کیے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ زندگی کا تعلق کائنات سے ہے۔ زندگی کبھی نہیں مرتی، بلکہ لوگوں کو مارتی ہے۔ زندگی کے مختلف رنگ وروپ ہیں۔ کبھی یہ راہزن کی شکل میں ملتی ہے اور کبھی راہنما کے طور پر سامنے آتی ہے۔ زندگی کبھی نغمے کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور کبھی آواز کی صورت۔ کائنات کے تمام اُتار چڑھاؤ زندگی کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کے بغیر دنیا کی کسی سرگرمی کا انجام دینا ناممکن ہے۔

۳۔ جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی شاعرِ شباب اور شاعر انقلاب دو حوالوں سے مشہور ہیں۔ وہ ملیح آباد میں ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد احمد خان اور دادا دونوں صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جوش نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ انگریزی کی تعلیم سینئر کیمبرج تک پائی، لیکن لا ابالی طبیعت کی وجہ سے انھیں تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ معاشی لحاظ سے لکھنؤ کے حالات زیادہ سازگار نہ تھے، جس کی وجہ سے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ ۱۹۲۴ء میں سرکار نظام میں دارالترجمہ میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۳۴ء میں ناظرِ ادب کی حیثیت سے علیحدہ ہوئے۔ جوش جب واپس آئے، تو سیاسی فضا بالکل بدل چکی تھی اس لیے انھوں بھی تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا۔ کچھ عرصہ تک دہلی سے ایک رسالہ 'کلیم' نکالتے رہے۔ رسالہ 'آج کل' کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۵۶ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ یہاں وہ اردو ترقی بورڈ سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۸۲ء میں اسلام آباد میں جوش کا انتقال ہو گیا۔

جوش بیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں سے ہیں، جن کی نظیر پیدا ہونا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے سامنے کسی کا چراغ نہ جلنے دیا۔ جوش نے اردو زبان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ رہتی دنیا تک انھیں یاد رکھا جائے گا۔ ذیل میں ان کی شاعری کی چیدہ چیدہ خصوصیات بیان کی جاتی ہیں:

رومانیت:

جوش انتہائی جذباتی انسان ہیں۔ ان کے ذہن و دل پر رومان کا ایسا غلبہ ہے کہ وہ جو موضوع بھی منتخب کرتے ہیں، وہ ان کے اندازِ بیان اور طرزِ تخیل کی وجہ سے رومانوی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب سیاسی یا مذہبی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں، تب بھی ان پر رومانیت غالب آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری 'ترقی پسند ادب' میں فرماتے ہیں:
''جوش سو فیصد رومانوی ہیں اور ان کے انقلاب کا تصور بھی رومانوی ہے، جس کے زیر اثر وہ بہت جلد مشتعل ہو کر جذبات اور ہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں''

رومانوی شاعر کی جو خصوصیات ہوتی ہیں، وہ تقریباً تمام کی تمام جوش کے ہاں ملتی ہیں۔ زندگی انھیں عزیز ہے؛ ماضی سے انھیں لگاؤ ہے؛ انفرادیت کا وہ جا بجا اظہار کرتے ہیں؛ درد اور کسک ان کی شاعری میں موجود ہے اور سب سے

بڑھ کر جذباتیت تو شروع سے آخر تک ہے؛ وطن سے محبت اور آزادی و انقلاب کا تصور بھی ان کے ہاں ملتا ہے۔ انھی جذبات کے پیشِ نظر ناقدینِ ادب نے جوش کو سو فیصد رومانوی شاعر قرار دیا ہے:۔

فطرت پرستی: رومانوی شاعر بنیادی طور پر فطرت پرست ہوتا ہے۔ فطرت پرستی اور قدرتی مناظر سے جوش کو والہانہ عشق ہے۔ ان کی رومانیت شدتِ جذبات کی ایک ایسی شکل ہے، جو زندگی کے سارے حسن اور اس کی رعنائیوں کو ان کی مادی شکل میں قلم کی ایک جنبش سے سمیٹ لینا چاہتی ہے۔

شاعرِ شباب: پروفیسر سید وصی رضا فرماتے ہیں:

''جہاں تک جوش کی شاعری کا تعلق ہے، وہ بنیادی اعتبار سے شاعر شباب تھے۔ حسن و شباب کے معنی اور اس حیثیت میں وہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے''۔

جوش کی لاتعداد نظمیں ان کے شاعرِ شباب ہونے پر مہر ثبت کرتی ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں حسن و جوانی کی تعریف سے بھری پڑی ہیں۔

شاعرِ انقلاب:

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش نہ صرف ایک بڑے شاعر تھے، بلکہ برِصغیر پاک و ہند میں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کے ایک روشن نشان بھی تھے۔ ان کی للکار روحِ عصر کی للکار ہے، جو غلامانہ ماضی کی زنجیروں کو پگھلا کر اور حال و مستقبل کے نئے خواب دکھا کر برِصغیر پاک و ہند کے لیے آس و امید کے نئے چراغ جلانے کا باعث ہوئی۔

جوش کے انقلاب میں بغاوت کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کی سب سے معرکہ آرا باغیانہ نظم 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے' ہے، جس انداز کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کو انھوں نے نظم میں للکارا ہے، بعد میں یہی لب و لہجہ جنگِ آزادی کے جوش میں جوش کی شمولیت کا نشان امتیاز بن گیا۔

اسلوب بیان:

نرمی، گرمی، زور اور روانی جوش کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ کبھی ان کی نظم جوالا مکھی بن جاتی ہے اور کبھی مرغزار کے چشمے کی طرح بہتی ہے۔ لفظوں اور ترکیبوں سے کبھی آتش فشاں ابل پڑتا ہے اور کبھی ان کی حلاوت اور نرمی صبح کی

چڑیوں کی طرح چہچہانے لگتی ہے۔ رزم اور بزم کے سارے دائروں میں جوش کی زبان کا سحر جاگتا رہتا ہے۔ وہ کبھی فردوسی کی طرح اور کبھی حافظ کے انداز میں گنگنانے لگتے ہیں۔ ان کا کمال فن اور اردو فارسی کے بہت سے عظیم شعرا کی یاد تازہ کرتا ہے۔

جوش میرانیس کے بعد دوسرے شاعر ہین، جنھوں نے اردو زبان کو بیش قیمت ذخیرۂ الفاظ عطا کیا ہے۔ زبان و بیان پر جو دسترس جوش کو حاصل تھی اور شعروں کی چست بندش کا جو ہنر جوش کے ہاں ملتا ہے، اس کی مثالیں اساتذہ کے ہاں بھی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔

جوش کی قادر الکلامی مسلم ہے۔ وہ ایک فطری اور جذباتی شاعر ہیں اور زبان و بیان کے تمام وسائل پر بے پناہ قدرت رکھتے ہیں۔ الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات کے استعمال پر ان کی چابکدستی ماہرانہ ہے۔ ان کے تجربات و مشاہدات بھی وسیع اور متنوع ہیں۔ وہ فارسی اور عربی کے پر شکوہ الفاظ یکساں اعتماد کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

۱.۳ البیلی صبح (نظم):

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمہ طرب ہے، چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیور بزم سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مدنظر ہیں کتنی رعائتیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلو کا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلو سکھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو ! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں یہ کس کی آواز آ رہی ہے

۲.۳ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
جبیں	پیشانی	نسیمِ فردوس	صبح کے وقت آنے والی جنت کی ہوا
عروسِ فطرت	فطرت کی دلہن	بیلے	چنبیلی کی قسم کا پودا
نغمۂ طرب	خوشی کا نغمہ	سحر	صبح
روش روش	قطار قطار	رعایتیں	آسانیاں
چشمِ خوں فساد	خون سے بھری آنکھیں	مدِ نظر	نظروں کے سامنے
طیور	پرندے	سبک	ہلکی، تیز
رسیلی	رس بھری ہوئی	اوڑھنی	چادر، دوپٹا
مطرب	گانے والا	فلک	آسمان
افشاں	چمکنے والی	کھٹک	اندیشہ
نرم رو	ملائم، نرم	ہلال	پہلی رات کا چاند
شلوکا	ایک قسم کا کرتا		

۳.۴ تشریحات:

شعر نمبر (۱):

تشریح: ایک رومانی شاعر ہونے کی وجہ سے جوش کو مناظرِ فطرت سے گہرا لگاؤ ہے۔ اس نظم میں وہ صبح کے دلفریب منظر کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس شعر میں صبح کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔ کہ فطرت کی دلہن نے اپنی نظریں جھکائی ہوئی ہیں اور اپنے حسین چہرے سے زلفیں ہٹا رہی ہیں۔ سحر کے ستارے خوف کے مارے لرز رہے ہیں۔ ان کے جانے کا وقت پورا ہو چکا ہے، ان کو موت آنے والی ہے۔ مطلب یہ کہ فطرت جو ایک دلہن کی طرح خوب صورت ہے، اس کی زلفیں جورات کی طرح کالی ہیں، اس نے اپنے روشن چہرے سے ہٹالی ہیں۔

شعر نمبر (۲):

تشریح: نور ظاہر ہوتے وقت سارے باغ میں خوب صورت رنگوں اور دلفریب خوشبوؤں کا جشن منایا جا رہا ہے۔ درختوں کی شاخوں پر سارے پرندے نغمے گا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کلی بھی خاموش نہیں ہے اور وہ بھی صبح کے وقت اتنی متاثر ہے کہ اس نے گنگنانا شروع کر دیا ہے۔ جوش مناظرِ فطرت سے بہت مانوس ہیں، اس لیے صبح کا اثر ہر چیز میں انھیں نظر آ رہا ہے۔

شعر نمبر (۳):

تشریح: صبح کے وقت کا ستارہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ اس کی رسیلی آنکھیں جب دیکھتا ہوں، تو اس میں مجھے کئی کہانیاں نظر آتی ہیں۔ اس طرح جب میں چاند کو دیکھتا ہوں، تو اس کی آنکھیں بھی مجھے فتنے سے بھری ہوئی ملتی ہیں۔ وہ بھی مکمل طور پر اپنا جادو جگاتا ہے۔ اگر انسان اس وقت ان کو دیکھے، تو اس پر ان کے جادو کا فوراً اثر ہو جائے گا۔

شعر نمبر (۴):

تشریح: صبح کے وقت پرندے چہچہا رہے ہوتے ہیں۔ جوش انھیں صبح کی محفل کے گویے قرار دیتے ہیں۔ وہ فنکاروں کی

طرح درخت کی ہر لچکتی شاخ پر بیٹھے نغمے الاپ رہے ہیں اور صبح کی تازہ ہوا جو ابھی ابھی جنت سے نکل کر دنیا میں وارد ہوئی ہے، وہ بھی اِس دلفریب انداز سے چلتی ہے کہ گویا وہ پھولوں کو سُلانے کے لیے جھولا جھلا رہی ہو۔

شعر نمبر (۵):

تشریح: شبنم بڑے پیارے انداز میں بیلے کی کلی پر پڑی ہے۔یوں لگتا ہے، جیسے یہ شبنم کا قطرہ نہیں، بلکہ کسی پری کی ناک کی کیل ہے، جس میں ہیرا جڑا ہوا ہے۔شاعر نے بڑے خوب صورت انداز میں شبنم کے قطرے کو کیل اور بیلے کی کلی کو پری قرار دیا ہے۔

شعر نمبر (۶):

تشریح: صبح کے دلفریب وقت کے لیے بہت سی آنکھوں نے خون بہایا، یعنی بہت سے لوگ اس سحر کی آمد کے لیے روئے ہیں، تب جا کر یہ صبح آئی ہے۔صحراؤں اور بیابانوں سے آنے والی ہواؤں میں جب انسان سانس لیتے ہیں، تو اس سے تازہ لہو پیدا ہوتا ہے اور زندگی میں تندرستی و توانائی آ جاتی ہے۔مطلب یہ کہ صبح کی تازہ ہوا صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

شعر نمبر (۷):

تشریح: شاعر بتاتے ہیں کہ صبح کے وقت پھولوں کی جو پنکھڑیاں ہوتی ہیں، یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے گلابی رنگ کا لباس پہن رکھا ہو اور ہر کلی اس لباس میں بہت آرام اور سکون سے ہے۔ہر کلی جب ہوا سے ہلتی ہے، تو ایسا نظر آتا ہے، جیسے اس نے اپنے دوپٹے کو نیا رنگ دیا ہے اور اب اس کے لیے دوپٹے کو خشک کرنے کیلئے اسے ہوا میں لہرا رہی ہے۔

شعر نمبر (۸):

تشریح: آسمان پر چاند کے اردگرد تارے اس طرح چھپ رہے ہیں، جیسے کوئی نئی دلہن اپنی پیشانی اور مانگ سے غازہ اُتار رہی ہو۔

شعر نمبر (۹):

تشریح: آخری شعر میں جوشؔ کہتے ہیں کہ میرے دل میں پھر ایک خدشہ پیدا ہوا ہے۔ اے کھلنے والی نئی کلیو آپ کو ذرا دیر کیلئے رکنا چاہئے۔ تا کہ میرے دل کا یہ خدشہ دور ہو جائے۔ اب باغ کے اندر لگے ہوئے درختوں کی خوبصورت اور نرم قطاروں میں مجھے کسی کی آواز آ رہی ہے۔ دراصل اس آواز نے جوشؔ کے دل میں کھٹکا پیدا کر دیا ہے۔

۳.۴ مرکزی خیال:

جوش اس نظم کے ذریعے اللہ تعالے کی قدرت کی حقانیت ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ نے صبح جیسا سہانا وقت پیدا کر کے انسان کو اپنی قدرت کی نشانیاں واضح طور پر بتا دی ہیں۔ صبح کا وقت بہت سہانا اور پیارا ہوتا ہے، اس دوران ہر منظر بڑا دلکش ہوتا ہے اور چاروں طرف پھولوں کی مہک کے ساتھ ساتھ پرندوں کی چہک نے ایک خوب صورت سماں پیدا کر دیا ہوتا ہے۔

۳.۵ خلاصہ:

جوش ملیح آبادی نے اس نظم میں صبح کے حسین منظر کا نقشہ بڑے دل فریب انداز میں کھینچا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: صبح کے وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور پرندوں کے چہکنے کی آوازوں سے ایک عجیب و غریب سُر پیدا ہوتا ہے۔ پھولوں کی مہک سے بھی پوری فضا معطر ہوتی ہے۔ آسمان پر رات بھر چمکنے والے ستارے کی بھی آنکھ جھپک رہی ہے اور وہ بھی ٹمٹما رہا ہے۔ شبنم کا موتی بیلے کی کلی پر ایک ادا کے ساتھ پڑا ہوا ہے۔ صحرا سے آنے والی ہوائیں انسان کے چہرے کی سرخی بڑھا رہی ہے اور پھولوں کے سرخ لباس کا حسن بھی قابلِ دید ہے۔ جب یہ کلیاں ہوا سے ہلتی ہیں، تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی حسینہ اپنے گیلے دوپٹے کو ہوا میں سکھا رہی ہے۔ چاند کے ارد گرد تارے اس طرح چھپ رہے ہیں، جیسے کوئی دلہن اپنی پیشانی اور مانگ سے غازہ اتار رہی ہو۔

۴۔ میراجی

میراجی جن کا اصل نام ثناء اللہ ڈار تھا، منشی مہتاب دین کے ہاں ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ریلوے میں اسسٹنٹ انجینیر تھے۔ میراجی کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہالول (اہاوہ گڑھ) کے اسکول سے ہوا۔ جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ بعد میں اپنے والد کے تبادلوں کی وجہ سے کئی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے میں میرا جی کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ان دنوں ان کا تخلص ساحری تھا اور جس کمرے میں ان کی رہائش تھی، اس کا نام انھوں نے ساحر خانہ رکھا تھا۔

میراجی ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔ مشرق ومغرب کے علوم کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک وہ اردو کے معروف رسالے 'ادبی دنیا' سے وابستہ رہے۔ اسی دوران ۱۹۴۰ء میں جب حلقہ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا تو میراجی اس میں شامل ہو گئے۔ وہ حلقے کے انتظامی امور میں دلچسپی لینے لگے، جس کی وجہ سے حلقہ مزید فعال ہو گیا۔ 'ادبی دنیا' سے وابستگی کے زمانے میں انھوں نے دنیا بھر کے منتخب شعرا کے تراجم اور ان کے کلام کے تنقیدی جائزے لکھنا شروع کیے، جو بعد میں 'مشرق ومغرب کے نغمے' کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں 'ادبی دنیا' سے الگ ہو کر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو گئے، بعد میں ماہنامہ 'ساقی' دہلی کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۱۶کتوبر ۱۹۴۷ء کو بمبئی گئے اور آخر دم تک وہاں رہے۔

میراجی نے ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو وفات پائی۔

۴.۱ دور و نزدیک (نظم):

ترا دل دھڑکتا رہے گا

مرا دل دھڑکتا رہے گا

مگر دور دور

زمیں پر سہانے سے آکے جاتے رہیں گے

یونہی دور دور

ستارے چمکتے رہیں گے

یونہی دور دور

ہر اک شے رہے گی

یونہی دور دور

مگر تیری چاہت کا جذبہ

یہ وحشی سا نغمہ

رہے گا ہمیشہ

مرے دل کے اندر

مرے پاس پاس

۴.۲ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی:

سہانے: (پیارے)، سمے: (لمحے)، شے: (چیز)، چاہت: (محبت)، وحشی: (پاگل)
، نغمہ: (گیت)، پاس پاس: (ساتھ ساتھ)

۴.۳ تشریحات:

(۱):

تشریح: میرا جی کی نظم میں دوری کا ایک بڑا حوالہ ملتا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی حصے میں وہ کہتے ہیں کہ اے میرے دو ست! آپ کے اور ہمارے دل کے درمیان جو دوری ہے، وہ کبھی بھی نزدیکی میں تبدیل نہیں ہوگی۔ اگر چہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو کے مر نہیں جائیں گے، مگر ہمارے دل ایک دوسرے کی جدائی میں دور دور دھڑکتے اور تڑپتے رہیں گے۔

(۲):

تشریح: اس حصے میں میرا جی کائنات کی دیگر چیزوں کی مثالیں دے کر محبوب سے کہتے ہیں کہ یہ زمین قائم ودائم رہے گی، یہاں پہ خوشیوں کے لمحے بھی آئیں گے، لیکن افسوس کہ ہم ان لمحوں سے دور ہوں گے۔ اسی طرح یہ

ستارے بھی چمکتے رہیں گے، لیکن ان کی روشنی ہماری دسترس میں نہیں ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز یونہی موجود رہے گی، لیکن ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ کوئی خوشی بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہوگی اور ہم ہمیشہ اس سے دور رہیں گے۔

(۳):

تشریح: اے میرے دوست! اگر چہ دنیا کی خوب صورتیوں اور خوشیوں پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے، لیکن ایک چیز میرے بس میں ہے اور وہ ہے تیری محبت کا لازوال جذبہ۔ یہ وہ نغمہ ہے، جس نے مجھے پاگل کر رکھا ہے۔ اگر دنیا والے تمام خوشیاں مجھ سے چھین لیں اور مجھے بے آسرا کر لیں، تو مجھے اس کا کوئی ملال اس لیے نہیں ہوگا کہ تیری محبت کا جذبہ میرے دل میں موجود ہوگا اور یہ زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا۔ اگر چہ تم مجھے بھول گئے ہو، لیکن میں ہر وقت تیری یاد کو دل میں لیے پھرتا ہوں۔

۴.۴ مرکزی خیال:

میراجی اپنی نظم 'دور و نزدیک' میں اپنے دوست کو بتاتے ہیں کہ میرے دل کے اندر جو محبت کا جذبہ ہے، اس میں اگر چہ دوری ہے، اس دوری کے باوجود یہ زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا اور میں مرتے دم تک تیری حسین یادوں کو اپنے دل میں لیے پھروں گا۔

۴.۵ خلاصہ:

دوری میراجی کی نظم کا ایک بڑا حوالہ ہے۔ نظم 'دور و نزدیک' میں انھوں نے اسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے دوست سے کہتا ہے کہ اے میرے دوست! جب تک ہم زندہ ہیں، تو میرا دل بھی دھڑکتا رہے گا اور آپ کا بھی، لیکن تو مجھے بھول جائے گا اور میں عمر بھر تیری یاد کو ساتھ لیے پھروں گا۔ یہ چاند ستارے، یہ زمین کے خوب صورت لمحے اور یہ زندگی کے دوسرے ہنگامے یونہی دور دور رہیں گے، لیکن میرے دل میں تیری چاہت کا جو جذبہ ہے اور اس سے ہر وقت جو نغمہ بلند ہوتا ہے، یہ سدا سلامت رہے گا، یہ ہمیشہ میرے دل کے پاس رہے گا۔

۵۔ ن م راشد

ن م راشد کا اصل نام نذر محمد راشد تھا اور یکم اگست ۱۹۱۰ء کو گوجرانوالہ کے قصبے علی پور چٹھہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں علی پور چٹھہ ہی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوگئے۔ اسی دوران جنگِ عظیم شروع ہوئی، تو ن م راشد فوج میں بھرتی ہوگئے اور یوں انھیں عراق، ایران، مصر اور سیلون میں وقت گزارنے کا موقع ، ملا تو وہاں کی تہذیب وتمدن سے بھی شناسائی ہوگئی، جس نے آگے چل کر راشد کی تخلیقی کاوشوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

۱۹۴۷ء میں فوج سے رخصت ہوئے اور لکھنؤ سٹیشن پر ریجنل ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان کے ہیڈکوارٹرز میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز رہے۔ ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ ۱۹۷۴ء میں یو این انفارمیشن سینٹر تہران سے ڈائریکٹر کی حیثیت میں ریٹائر ہوئے۔ ن م راشد کے کلام کے چار مجموعے: ماورا (۱۹۴۲ء) ایران میں اجنبی (۱۹۵۵ء) لا= انسان (۱۹۵۹ء) گماں کا ممکن (۱۹۷۷ء) شائع ہوئے۔ ایران میں قیام کے دوران بائیس فارسی شاعروں کی اسی (۸۰) نظموں کو اردو میں ترجمہ کر کے 'جدید فارسی شاعر' کے نام سے شائع کیا۔ ن م راشد کی شاعری کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔ ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو وفات پائی۔

ن م راشد نے اردو شاعری میں اردو نظم کو ایک مضبوط صنفِ سخن کے طور پر اپنایا اور آزاد نظم میں موضوعی اور ہیئتی سطح پر مختلف تجربات کیے۔ الڈس ہکسلے، آسکر وائلڈ، ڈی ایچ لارنس، ٹی ایس ایلیٹ، ای ایم فاسٹر، جیمز جوائس، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، ملارمے، ایذرا پاؤنڈ، رومی، حافظ اور سعدی نے ن م راشد کی شاعری اور علم ووجدان کو روشنی بخشی۔ ن م راشد کی شاعری کے موضوعات میں سے مذہب، جنس، سیاست اور انسان کی تلاش زیادہ اہم ہیں۔ ن م راشد نے موضوع اور ہیئت کے حوالے سے جس جدت اور روایت شکنی کا مظاہرہ کیا ہے، اسلوب کے اعتبار سے اتنے ہی زیادہ روایت پرست واقع ہوئے ہیں اور یہ اسلوب فارسی آمیز ہے اور اس کے تمام عناصر اپنے بنیادی مسئلے یا موضوع سے اخذ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے علامتی پیرایۂ اظہار بھی اختیار کیا ہے۔ ن م راشد علامتوں اور استعاروں کے ذریعے انسان اور زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو دریافت کرتے ہیں۔

۵.۱ میں اسے واقفِ الفت نہ کروں (نظم):

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسائے محبت نہ کروں
روح کو اس کی اسیرِ غمِ الفت نہ کروں
اس کو رسوا نہ کروں، وقف ِمصیبت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقفِ درد نہیں، خوگرِ آلام نہیں
سحرِ عیش میں اس کی اثرِ شام نہیں
زندگی اس کے لیے زہر بھرا جام نہیں

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں
اس نے دیکھا نہیں دنیا میں بہاروں کے سوا
نکہت و نور سے لبریز نظاروں کے سوا
سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا

سوچتا ہوں کہ غمِ دل نہ سناؤں اس کو
سامنے اس کے کبھی راز کوعریاں نہ کروں
خلشِ دل سے اسے دست و گریباں نہ کروں
اس کے جذبات کو میں شعلہ بد اماں نہ کروں

سوچتا ہوں کہ جلا دے گی محبت اس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گی
خود تو وہ آتشِ جذبات میں جل جائے گی
اور دنیا کو اس انجام میں تڑپائے گی

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں اسے واقفِ الفت نہ کروں

۵.۲ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شناسائے محبت	محبت سے باخبر	عریاں	ظاہر
اسیرِ غمِ الفت	محبت کے غم میں گرفتار	خلشِ دل	دل کی کسک
رنج	دکھ، غم	دست وگریباں	کشمکش میں ڈالنا
خوگرِ آلام	دکھوں کا عادی	شعلہ بداماں	جس کے دامن میں آگ بھری ہو
سحرِ عیش	خوشی کی صبح	آتشِ جذبات	آگ سے بھرے ہوئے جذبات
نکہت ونور	خوشبو اور روشنی	معصوم	گناہوں سے پاک
لبریز	بھری ہوئی		

۵.۳ تشریحات:

بند نمبر (۱):

تشریح: نظم کے پہلے بند میں شاعر ن۔م۔راشد اپنے محبوب کی معصوم جوانی کے بارے میں کہتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ میرا محبوب ابھی بہت سادہ ومعصوم ہے، اس لیے اس کو محبت سے آشنا نہ کروں۔ کیونکہ جب وہ محبت کے درد سے واقف ہوجائے گا اور اس کے متعلق سوچے گا،۔ تو اس کی روح بھی پریشان ہوگی، وہ نہ صرف بے چین ہوجائے گا، بلکہ وہ رسوا بھی ہوجائے گا۔ اور دنیا والے اسے طرح طرح کے طعنے دیں گے، اس کی زندگی کا سارا سکھ اور ہنسنا کھیلنا ختم ہوجائے گا۔ اگر اسے محبت کی ہوا لگی، تو وہ ہر وقت پریشان رہے گا۔

بند نمبر (۲)

تشریح: مجھے اپنے پیارے محبوب کی معصومیت اور بھولپن اچھا لگتا ہے۔ اگر میں نے اس سے محبت کا اظہار کیا اور اسے

اس مصیبت سے واقف کیا، تو بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ ابھی تو وہ رنج سے بالکل ناواقف ہے؛ اسے درد و تکالیف کی کوئی عادت بھی نہیں ہے؛ اس کی صبحیں خوشبوں سے بھری ہوئیں ہیں؛ ان میں شام کا یعنی دکھ کا کوئی لمحہ اور اثر موجود نہیں؛ زندگی نے ابھی تک اسے صرف مسرتیں دی ہیں اور غموں کا جام اس نے آج تک نہیں پیا؛ اس نے کوئی درد بھرا لمحہ نہیں دیکھا، کیونکہ اُس نے ساری عمر خوشیوں میں گزاری ہے۔

بند نمبر (۳):

تشریح: میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب جوانی میں کوئی محبت کر لیتا ہے، تو اس کی جوانی کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی جوانی کے باغ میں خزاں کا موسم چھا جاتا ہے۔ میرے دوست نے تو آج تک دنیا میں بہاروں کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اس نے جس طرف نظریں اٹھائیں، اسے رنگین اور روشن مناظر دیکھنے کو ملے ہیں۔ اس نے صرف سبزہ زاروں اور ستاروں کی سیر کی ہے۔ اس کے قدم کسی صحرا کی گرد سے واقف نہیں ہیں۔ نہ اس نے آسمان پر ستاروں اور روشنیوں کے سوا کوئی اور چیز دیکھی ہے۔ اس نے بہت ناز و نعم میں زندگی گزاری ہے۔

بند نمبر (۴):

تشریح: میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اسے اپنے دل کا غم نہ سناؤں۔ اس کو اپنی محبت کے بارے میں نہ بتاؤں، تو بہتر ہے؛ اس کے سامنے کبھی اپنی محبت کے راز کو ظاہر نہ کروں۔ اگر میں نے ایسا کیا، تو وہ بھی دل کی خلش اور محبت کی سوچوں سے ہر وقت لڑتا جھگڑتا رہے گا؛ اس کے دل اور محبت کے جھگڑے میں اس کے جذبات میں آگ لگ جائے گی۔ میں اسے اس عذاب میں بالکل مبتلا نہیں کرنا چاہتا؛ میری خواہش ہے کہ وہ یونہی ہنستا کھیلتا زندگی کے مزے لوٹتا رہے اور اسے کوئی غم نہ ملے۔

بند نمبر (۵):

تشریح: اِس بند میں شاعر کہتا ہے کہ محبت کا اگر میں نے اظہار کیا اور اس کو اس مصیبت میں گرفتار کیا، تو یہ ظالم چیز آگ کی طرح اس کو جلا دے گی۔ وہ اتنا سادہ اور معصوم ہے کہ وہ اس جذبے کی تاب بالکل نہیں لا سکتا۔ اس میں محبت کے جذبات پر قابو پانے کا مادہ بالکل موجود نہیں ہے۔ وہ جذبات کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائیگا۔ اس کی زندگی تباہی و بربادی کی داستان بن جائے گی۔ جب دنیا والے اس کی محبت کے انجام کے بارے میں سنیں

گے اور سوچیں گے تو وہ اس پر تڑپ جائیں گے اور ان کو رحم آجائیگا۔

۵.۴ مرکزی خیال:

ن۔م راشد نے اس نظم میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جو شخص محبت کے رمز سے آشنا ہو جاتا ہے، اسے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑے ہے۔

۵.۵ خلاصہ:

راشد کی نظم 'میں اسے واقفِ الفت نہ کروں' ایک رومانوی نظم ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ: میرا محبوب بہت سادہ اور معصوم ہے، اس نے ابھی رنج اور غم کا کوئی لمحہ نہیں دیکھا ہے؛ وہ بہاروں کا پروردہ ہے اور خزانوں سے ناواقف ہے؛ اس نے عمر بھر بہاروں اور سبزہ زاروں کے سوا دنیا میں کوئی موسم نہیں دیکھا۔ اگر میں نے اس سے محبت کا اظہار کیا، تو وہ ایک تلخ حقیقت سے واقف ہو جائے گا۔ خلشِ دل کی وجہ سے وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جائے گا؛ محبت اس کو مکمل طور پر تباہ کر کے رکھ دے گی اور دنیا کے لوگوں کو اس کے عبرت ناک انجام پر افسوس ہوگا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ابھی اس کو محبت اور الفت کے تلخ حقائق کے بارے میں کچھ بھی نہ بتاؤں، تا کہ وہ خوش وخرم زندگی گزار سکے۔

۶۔ مجید امجد

عبدالمجید نام اور امجد تخلص تھا۔ شہرت مجید امجد کے نام سے ہوئی۔ وہ ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو جھنگ صدر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں علی محمد تھا۔ مجید امجد کی پرورش ان کے نانا نے کی، جن کا شمار جھنگ کے اہلِ علم میں ہوتا تھا۔ مجید امجد نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے نانا ہی سے حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے اسلامیہ ہائی اسکول جھنگ سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پھر اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور سے (بی۔اے) کا امتحان پاس کیا۔

بی۔اے کرنے کے بعد مجید امجد واپس جھنگ آئے، تو ایک ہفت روزہ اخبار 'عروج' کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء تک وہ عروج کے مدیر رہے اور اس عرصے میں ان کے افکارِ نظم و نثر برابر عروج میں شائع ہوتے رہے۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں برطانوی سامراج کے خلاف ان کی ایک نظم 'قیصریت' عروج کے صفحۂ اول پر شائع ہوئی، جس کی پاداش میں انھیں 'عروج' چھوڑنا پڑا اور وہ ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں کلرک ہو گئے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ محکمہ سول سپلائیز میں انسپکٹر منتخب ہوئے اور چند برسوں کے بعد ترقی پا کر اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ اس محکمے کی ملازمت کے دوران میں وہ مختلف علاقوں میں تعینات رہے، مگر ان کی ملازمت کا زیادہ عرصہ منٹگمری (حال ساہیوال) میں بسر ہوا اور یہیں سے وہ جون ۱۹۷۲ء کو ریٹائر ہوئے۔

مجید امجد کی وفات ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کو ساہیوال میں ہوئی، مگر انھیں دفن جھنگ میں کیا گیا۔

مجید امجد کا کلام مقدار اور معیار دونوں کے لحاظ سے دورِ حاضر کے اہم شاعروں سے بڑھ کر ہے۔ 'شبِ رفتہ' ان کا پہلا شعری مجموعہ تھا، جو ۱۹۵۸ء میں نیا ادارہ، لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ وفات کے بعد احباب اور قدردانانِ فن کی سعی کی بدولت دوسرا ضخیم مجموعہ 'شبِ رفتہ کے بعد' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں نے ان کے بعض مجموعہ ہائے کلام شائع کیے، جن میں 'میرے خدا، میرے دل (تاج سعید) ان گنت سورج (خواجہ زکریا) 'لوحِ دل' (تاج سعید) چراغِ طاقِ

جہاں (تاج سعید) گلاب کے پھول (محمد حیات سیال) طاقِ ابد (شمیم حیات سیال) مرگِ صدا (محمد امین) قابلِ ذکر ہیں۔ اب ان کا بیشتر کلام یکجا ہو کر 'کلیاتِ مجید امجد' (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا) کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

مجید امجد کا شمار ایسے نابغۂ روزگار شاعروں میں ہوتا ہے، جنھیں اپنی زندگی میں تو کوئی خاص شہرت نہیں ملی، مگر ان

کی وفات کے بعد دنیا ان کے فن کو پہچانتی اور ان کی فنکارانہ عظمت کو مانتی ہے۔ ان کی زندگی میں کوئی ادبی حلقہ انھیں دوسرے، بلکہ تیسرے چوتھے درجے کا شاعر ماننے کو تیار نہیں تھا، مگر ان کی وفات کے بعد ہر ادبی حلقہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر انھیں اور ان کی شاعرانہ عظمت کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے۔

ا۔ موضوعات کا چناؤ:

مجید امجد کے کلام کی نمایاں ترین خصوصیت موضوعات کا چناؤ ہے۔ وہ اردگرد پھیلی ہوئی زندگی اور اس کے مناظر سے کوئی ایسی بات یا تصویر منتخب کرتے ہیں، جو بظاہر بہت عام ہوتی ہے اور کوئی اسے توجہ کے قابل سمجھتا، مگر مجید امجد اس کے ایسے ایسے گوشے سامنے لاتے ہیں اور نظم کو زندگی کے بڑے بڑے مسائل کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ وہی عام اور معمولی سی بات ایک غیر معمولی نظم کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ 'ایک کوہستانی سفر کے دوران' نظمیں موضوعات کے حسنِ انتخاب کی نمایاں مثالیں ہیں۔

۲۔ دردمندی اور حساسیت:

مجید امجد کے کلام کا ایک وصف یہ ہے کہ ان کی نظمیں ایک دردمند، حساس، باخبر اور منفرد ذہن و دل کی عکاس ہیں۔ ان کی شاعری اپنے اندر فکر و نظر اور احساسِ درد و کرب کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ وہ ایسے حادثات پر بھی تڑپتے ہیں، جنھیں کوئی حادثات کہنے اور سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ان کا دل ایسے المیوں پر بھی خون کے آنسو روتا ہے، جنھیں لوگ المیے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ 'توسیعِ شہر' ان کے دل کی دردمندی کی ایسی ہی مثال ہے کہ شہر کی توسیع کی خاطر نہر کے کنارے لگے ہوئے درختوں کے کٹنے سے کسی کو کوئی صدمہ محسوس نہیں ہوتا، مگر مجید امجد ان درختوں کے کٹنے کا نوحہ پڑھتے اور درختوں کے کٹنے کے غم سے ہلکان ہوتے نظر آتے ہیں۔

۳۔ ہیئت کے تجربات:

مجید امجد کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں نظمِ معریٰ اور نظمِ آزاد کی ہیئت کے حوالے سے نئے نئے تجربات کیے ہیں، جس طرح ان کی ہر نظم کا موضوع دوسری نظموں سے الگ ہے، اسی طرح ان کی ہر نظم دوسری نظموں سے مختلف ہیئت میں تخلیق ہوئی ہے۔ ان نظموں میں ہیئت کے نو بہ نو تجربات کرتے ہوئے جہاں جہاں انھوں نے روایتی بحر اور وزن کی پابندی کی ہے، وہاں ردیف قافیے کا نظام بھی خود ہی ایجاد کیا ہے، جو روایتی نظام سے

یکسر مختلف ہے۔ چنانچہ آج یہ تجربات جدید دور کے شاعروں کو نئی نئی راہیں سمجھا رہے ہیں۔

۴۔ معاشرتی کرب اور جبر کا گہرا شعور:

مجید امجد کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظموں میں معاشرتی کرب اور جبر کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ وہ اس کرب اور جبر کو اپنی نظم کا موضوع بناتے ہوئے خود بھی تڑپتے ہیں اور قاری کو بھی تڑپاتے ہیں۔ وہ اس کرب اور اس جبر کو الفاظ کے ایسے سانچے میں ڈھالتے ہیں کہ قاری پڑھ کر تڑپ اُٹھتا ہے۔

وہ انسان کے دکھوں میں شامل ہو کر، دوسروں کے حوالے سے اپنے دکھ کو بیان کرتے ہیں۔ وہ غمِ ذات کو، غمِ کائنات کا رنگ دے دیتے ہیں اور آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرتے ہیں۔

۵۔ جدتِ تراکیب:

مجید امجد کے کلام کا ایک وصف یہ ہے کہ ان کا ذخیرۂ الفاظ منفرد اور انوکھا ہے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اور عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بلا مبالغہ سیکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں نئی تراکیب وضع کی ہیں، جو عربی فارسی اور ہندی سے ان کے غیر معمولی شغف کا ثبوت ہیں۔ ان تراکیب کی جدت اور ندرت نے ان کے کلام کے فنی حسن کو چار چاند لگائے ہیں اور ان کی نظموں کو ایک منفرد رنگ و آہنگ بخشا ہے۔ تراکیب کی جدت اور ندرت کا یہ حسن نظموں کے متن ہی میں نہیں، ان کے عنوانات میں بھی نظر آتا ہے۔ طلوعِ فرض، نفیرِ گل، کلبۂ ایوان، سازِ فقیرانہ، باہر ایک دریا، دل کا چھالا، جیسے: بیسیوں عنوانات ہیں جو مجید امجد کی ذہنی اپج کا پتا دیتے ہیں اور جن کی ندرت بے اختیار قاری کے دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔

۶۔ جذباتی گہرائی:

مجید امجد کے کلام کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں میں بڑی شدید جذباتی گہرائی پائی جاتی ہے۔ ایسی شدید جذباتی گہرائی عصرِ حاضر کے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اگرچہ ان کے بیشتر کلام میں زبردست آورد پائی جاتی ہے، اس کے باوصف یہ آورد روایتی آمد سے کہیں زیادہ شدید جذباتیت کی حامل ہے۔ وہ بیک وقت شاعری کے مختلف اور متضاد رجحانات کو اپنے دل و دماغ کی بھٹی میں پگھلا کر اور پھر ان سے نئے سانچے تخلیق کرتے ہیں اور پھر قاری کو اپنے جذبات کی گہرائی سے متحیر اور مسحور کر دیتے ہیں۔

۶.۱ نفیرِ عمل (نظم):

آہ کب تک گلۂ شومئی تقدیر کریں
کب تلک ماتمِ ناکامیٔ تدبیر کریں
کب تلک شیونِ جورِ فلکِ پیر کریں
کب تلک شکوۂ بے مہریٔ ایام کریں
نوجوانانِ وطن آؤ کوئی کام کریں

آج بربادِ خزاں ہے چمنستانِ وطن
آج محرومِ تجلّی ہے شبستانِ وطن
مرکزِ نالہ و شیون ہے دبستانِ وطن
وقت ہے چارۂ دردِ دلِ ناکامِ وطن
نوجوانانِ وطن !آؤ کوئی کام کریں

آؤ اجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں
آؤ جکڑی ہوئی روحوں کو پھر آزاد کریں
آؤ کچھ پیرویٔ مسلکِ فرہاد کریں
یہ نہیں شرطِ وفا، بیٹھ کے آرام کریں
نوجوانانِ وطن !آؤ کوئی کام کریں

ایک ہنگامہ سا ہے آج جہاں میں برپا
آج بھائی ہے سگے بھائی کے خوں کا پیاسا
آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی زمانے میں وفا
آؤ اس جنسِ گرانمایہ کو پھر عام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

جاہِ جم سے نہ ڈریں، شوکتِ کے سے نہ ڈریں
حشمتِ روم سے اور صولتِ رے سے نہ ڈریں

ہم جواں ہیں تو یہاں کی کسی شے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو نہ کچھ خدشۂ آلام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

رشتۂ مکر و ریا توڑ بھی دیں ، توڑ بھی دیں
کاسۂ حرص و ہوا، پھوڑ بھی دیں، پھوڑ بھی دیں
اپنی یہ طرزِ ادا چھوڑ بھی دیں، چھوڑ بھی دیں
آؤ کچھ کام، کام کریں، کام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

٦.٢ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی:

نفیرِ عمل: عمل کی بانسری، پکار، واویلا۔ آہ: افسوس۔ گلہ: شکوہ۔ شومئی تقدیر: قسمت کی خرابی، بدنصیبی۔ ناکامیٔ تدبیر: سوچ بچار کی ناکامی۔ تلک: تک۔ شیون: واویلا، آہ و زاری۔ جور: مظالم۔ فلکِ پیر: بوڑھا آسمان، کیونکہ جب سے دنیا بنی ہے یہ آسمان اس وقت سے موجود ہے، لہذا شعرا کے خیال میں یہ اب بوڑھا ہو چکا ہے۔ یہ ترکیب عام طور پر تقدیر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ مسلکِ فرہاد: فرہاد کا دستور، فرہاد ایک مشہور سنگ تراش تھا۔ بربادِ خزاں: جس کو خزاں نے برباد کر رکھا ہو۔ چمنستانِ وطن: وطن کا باغ۔ محرومِ تجلّی: جلوے سے محروم۔ شبستانِ وطن: وطن کی راتیں، یعنی وہ مقامات جہاں اہلِ وطن رات گزارتے ہیں۔ دبستانِ وطن: وطن کے اسکول۔ چارہ: علاج۔ دردِ دل: دل کا درد، بے چینی۔ اجڑی: تباہ شدہ۔ جکڑی ہوئی: گرفتار، پھنسی ہوئی۔ پیروی: نقش قدم پر چلنا، تقلید۔ بے مہریِ ایام: وقت کی بے وفائی۔ برپا: جاری۔ ڈھونڈے سے: تلاش سے۔ جنسِ گرانمایہ: بہت نایاب اور قیمتی چیز۔ جاہِ جم: جمشید بادشاہ کا رعب و دبدبہ۔ کَے: ایران کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے، جن میں کیخسرو، کیقباد اور کیکاؤس زیادہ مشہور ہیں۔ حشمتِ روم: روم کے بادشاہ قیصر کا جاہ و جلال۔ خدشۂ آلام: مصیبتوں سے ڈرنا۔ مکر و ریا: دھوکہ بازی، منافقت۔ کاسۂ حرص و ہوا: حرص ولالچ کا کاسہ۔ پھوڑنا: توڑ دینا۔ طرزِ ادا: طور طریقہ۔

۶.۳ تشریحات:

بند نمبر (۱):

تشریح: مجید امجد قوم کے نوجوانوں کو بے عملی کی زندگی چھوڑ کر عمل کرنے اور آگے بڑھنے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اے میری قوم کے نوجوانو! آپ سب اپنی تقدیر کی بدبختی کا رونا روتے ہو اور یہ گلہ کرتے ہو کہ ہماری قسمت خراب ہے؛ کبھی اپنے بنائے ہوئے منصوبے کی ناکامی پر افسوس کرتے ہیں؛ کبھی آسماں کے ستم کا ماتم کرتے ہیں اور کبھی وقت کی بے رحمی اور بے وفائی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن کبھی آپ نے یہ سوچا ہے کہ اس میں آپ کی قسمت اور وقت کی بے وفائی سے زیادہ آپ کا اپنا ہی ہاتھ ہے۔ اگر آج بھی آپ مل جل کر کسی کام کے کرنے کے لیے محنت پر تیار ہو جائیں، تو کامیابی آپ کا مقدر بن جائے گی۔

بند نمبر (۲):

تشریح: اے میرے وطن کے نوجوانو! آج آپ دیکھ رہے ہو کہ ہمارا وطن، جو ایک باغ کی طرح خوب صورت ہے، اس میں ہر طرف خزاں ہی خزاں ہے اور تباہی و بربادی پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے وطن کے لوگ جہاں رات گزارتے ہیں، وہاں بھی کوئی روشنی نہیں ہے اور اندھیرا چھایا ہوا ہے وطن کی درس گاہوں کو دیکھ کر ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے، کیونکہ ان درس گاہوں میں ہمارے وطن کے نونہالوں کو جس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے، وہ ہر لحاظ سے قابلِ افسوس ہے، لیکن اس تباہ شدہ ماحول کو ٹھیک کرنے کا صحیح وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم عمل کر کے آگے آئیں، تو ہماری یہ تباہی و بربادی ختم ہو سکتی ہے اور ہم ایک بار پھر تعمیرِ وطن کے نیک کام میں ایک دوسرے کے ساتھی بن سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے محنت اور لگن ضروری ہے۔

بند نمبر (۳):

تشریح: ہمارے شہر؛ ہمارے قصبے اور ہمارے گاؤں تباہی و بربادی کے دہانے پہنچ چکے ہیں؛ ہم نے ان کو بسانے کا عمل چھوڑ دیا ہے، اس لیے وقت کی آندھی انھیں مٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہماری سوچیں غلام ہیں؛ بے عملی کی باتوں اور خیالوں نے ہماری روحوں کو گرفتار کر رکھا ہے۔ اس کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ ہم میں فرہاد جیسا حوصلہ ہو اور اس کی طرح اپنے مقصد کو پانے کی دھن ہم میں موجود ہو۔ ہمیں محنت و جدوجہد میں فرہاد کے

نقشِ قدم پر چلنا ہوگا۔ اس سے تو بات نہیں بنے گی کہ ہم آرام سے بیٹھے؛ اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگنے بیٹھ جائیں۔ مقصد صرف ان لوگوں کا پورا ہوتا ہے، جو دن رات سخت محنت کرتے ہیں، اس لیے اے میرے وطن کے نوجوانو! آؤ ہم سب بھی مل کر وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے محنت کرنا شروع کر دیں۔

بند نمبر (۴):

تشریح: حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ دنیا بھر میں دولت کی ہوس کی وجہ سے سگے بھائی آپس میں دشمن ہیں اور ایک دوسرے کو بے دریغ قتل کر رہے ہیں۔ پچھلے زمانے میں لوگوں میں محبت و مروت کی فراوانی تھی، لیکن آج وفا نامی چیز کسی شخص میں بھی موجود نہیں۔
آج تلاش کرنے کے باوجود خلوص اور مہر و محبت کہیں پر بھی نظر نہیں آتی۔ ہر شخص پریشان اور مسائل کا شکار ہے۔ ان پریشانیوں کا واحد حل آپس میں محبت اور پیار ہے۔ لہٰذا انسانوں میں محبت کے جذبات جیسی نایاب اور قیمتی چیز کو عام کرنے اور انھیں پھر سے ایک دوسرے کا سچا بھائی بنانے کے لیے جدوجہد اور محنت کی ضرورت ہے اور یہ کام وطن کے نوجوان ہی بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔

بند نمبر (۵):

تشریح: دنیا کی کوئی طاقت ہمارے نوجوانوں کے رستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اگر ہمارے جذبے جواں ہوں، تو ہمیں نہ ایران کے جمشید جیسے بادشاہ کی تدبیر شکست دے سکتی ہے اور نہ ایران کے 'کے' خاندان کے حکمرانوں کی طاقت ہمیں ڈرا سکتی ہے۔ قیصر روم کا جاہ و جلال نہ ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ 'رے' خاندان کا رعب و دبدبہ ہمارے حوصلے پست کر سکتا ہے۔ اگر ہم جوان ہیں اور ہمارے بازوؤں میں قوت ہے، تو ہمیں دنیاوی مصیبتوں اور آج کل کی بڑی طاقتوں سے ہرگز ڈرنا نہیں چاہیے، بلکہ ان مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر کے ہی ہم کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

بند نمبر (٦):

تشریح: آج ہم سب مکر و فریب میں مبتلا ہیں اور سب ایک دوسرے کے ساتھ منافقت کر رہے ہیں۔ چونکہ دولت کی لالچ اور ہوس نے ہمیں اندھا کر رکھا ہے، اس لیے تباہی و بربادی ہمارا مقدر ہے۔ اس مکر و دغابازی کے رشتے

کو توڑنا وقت کی اہم ضرورت ہے اور ہر شخص کے ہاتھ میں جو کاسۂ حرص ہے، اس کو بھی ٹکڑے کرنا لازمی ہے۔ اپنا یہ طرزِ زندگی ہمیں چھوڑنا ہوگا اور محبت و امن کو عام کرنا ہوگا، لیکن اس کے لیے بہت زیادہ محنت اور کام کی ضرورت ہے۔ اے میرے وطن کے باہمت نوجوانو! آؤ ہم سب مل کر وطن کی حفاظت اور ترقی کے لیے کام اور محنت شروع کر دیں۔

۶.۴ مرکزی خیال:

اس نظم میں شاعر نے اپنے ہم وطن نوجوانوں کو محنت و مشقت کا درس دیا ہے اور انھیں یہ بتایا ہے کہ ہمارے وطن کی تعمیر و ترقی آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ اپنی محنت و مشقت سے وطن کی بگڑی ہوئی قسمت سنوار سکتے ہیں۔ اے نوجوانو! آپ سب کو آگے بڑھ کر وطن کی تعمیر و ترقی کے کام میں بھرپور حصہ لینا چاہیے، تاکہ آپ کے دشمنوں کے مذموم مقاصد خاک میں مل جائیں۔

۶.5 خلاصہ:

مجید امجد اپنی نظم 'نفیرِ عمل' میں وطن سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے نوجوانوں سے فرماتے ہیں کہ اے میرے وطن کے نوجوانو! آپ کب تک اپنی تقدیر کی خرابی کا گلہ کریں گے: کب تک آپ کبھی آسمان اور کبھی وقت کی بے وفائی کا ماتم کریں گے۔ آؤ کہ ہم سب وطن کی ترقی کے لیے کام کریں۔ آج ہمارے ملک کی حالت بالکل اس چمن کی طرح ہو چکی ہے، جس کو خزاں نے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ آئیں! سب مل کر اپنے وطن کو کامیاب و کامران کرنے کے لیے متحد ہو جائیں، کیونکہ آرام سے بیٹھ کر کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ آج دنیا میں ہنگامہ برپا ہے؛ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو چکا ہے؛ وفا نامی چیز زمانے میں نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ آؤ کہ ہم سب وفا کے جذبات کو پھیلائیں اور محبت کی باتوں کو عام کریں۔ چونکہ ہم سب مسلمان ہیں، اس لیے بڑے بڑے غیر مسلم حکمرانوں اور ان کی طاقت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس ضروری ہے تو یہ کہ ہم آپس میں مخلص ہوں اور مکر و ریا کو چھوڑ دیں۔ اگر ہم حرص و لالچ کے کاسے کو توڑ دیں اور عمل و جدوجہد کریں، تو ہم دوبارہ عروج حاصل کر سکتے ہیں۔

۷۔ منیر نیازی

منیر نیازی جن کا پورا نام محمد منیر خان تھا، فتح محمد خان کے گھر ۱۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور کی ایک قریبی بستی خانپور میں پیدا ہوئے۔ منیر نیازی کا خاندان کاروبار کے سلسلے میں خانپور سے ساہیوال آکر آباد ہوا تھا۔ منیر نیازی کی پیدائش کے دو ماہ بعد ہی ان کے والد انتقال فرما گئے۔ منیر نیازی نے گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری (ساہیوال) سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد ایم اے او کالج میں داخلہ لینا چاہا، لیکن چچا نے ان کی مرضی کے برعکس انھیں بحریہ میں بھرتی کروا دیا۔ ایف اے کا امتحان انھوں نے بہاولپور سے پاس کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ منٹگمری آ گئے انھوں نے ۱۹۴۹ء میں ایک اشاعتی ادارہ 'ارژنگ پبلشرز' کے نام سے بنایا، جہاں سے وہ ایک ہفت روزہ ''سات رنگ'' نکالتے تھے۔ منٹگمری میں ان کا زیادہ تر وقت مجید امجد کے ساتھ گزرتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں منیر نیازی لاہور آ گئے۔

۱۹۴۹ء میں انھوں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کی پہلی نظم کا نام 'بازگشت' ہے۔ منیر نیازی کا تخلیقی سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کالم نگاری، تنقید نگاری، سفرنامہ نگاری، ترجمہ نگاری اور کہانی لکھنے کے علاوہ اور بھی بہت سے ادبی کام کیے، لیکن ان کا اصل میدان شاعری ہے۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے ہیں، جن میں: 'تیز ہوا اور تنہا پھول، دشمنوں کے درمیاں، ماہِ منیر، چھے رنگین دروازے، پہلی بات ہی آخری تھی'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی کلیات: 'کلیاتِ منیر' کے نام سے پہلی دفعہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ منیر نیازی ۲۰۰۶ء میں انتقال کر گئے۔

دوسرے شعرا کے برعکس منیر نیازی کی شاعری میں کئی منفرد حوالے ملتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

پُراسراریت:

منیر نیازی کی نظم کا سب سے دلچسپ اور منفرد حوالہ اس کی پُراسراریت اور روحانی قسم کی فضا ہے، جس سے ان کی نظم روحانیت، پُراسراریت اور رومانیت کا ایک حسین امتزاج بن گئی ہے۔ ان کی ایک نظم 'صدا بہ صحرا' میں ان کیفیات کا نمونہ دیکھیے:

چاروں سمت اندھیرا گھپ
ہے اور گھٹا گھنگھور

وہ کہتی ہے: ''کون''؟

میں کہتا ہوں: ''میں''

کھولو یہ بھاری دروازہ

مجھ کو اندر آنے دو''

اس کے بعد اک لمبی چپ

اور تیز ہوا کا شور

داخل اور خارج:

منیر نیازی کی نظم میں داخل اور خارج کا تعلق بہت مضبوط ہے۔ وہ جب نظم لکھتے ہیں، تو باہر کی تنہائی کو اندر جذب کر لیتے ہیں اور اندر کے آشوب کو باہر کی طرف منتقل کر کے اس سے کائناتی پیکر سجاتے ہیں۔

خوف اور آسیب: ان کی نظم تنہائی، خوف اور آسیب سے تشکیل پاتی ہے۔ منیر کی نظمیں پڑھ کر ایک آسیب کردار کا پیکر اُبھرتا ہے، جسے ہر بند دروازے کے پیچھے چڑیلیں، ہر تاریک راستے میں آسیب اور ہر کھلے میدان میں جادو نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد، ان کی نظم کے خدوخال یوں واضح کرتے ہیں:

> ''ان کی نظموں میں ایک خوف زدہ دوڑتے ہوئے انسان کی تصویر اُبھرتی ہے، جس کے پیچھے کوئی جلاد ننگی تلوار لے کر بھاگ رہا ہو۔ یہ انسان دراصل اس دور کا خوف زدہ انسان ہے، جس کے پیچھے ضرورتیں اور قدریں چڑیلیں بن کر دوڑ رہی ہیں؛ اسے ڈرا رہی ہیں۔ اگر کبھی اس خوف زدہ انسان کی ذہنی گرہ کو کسی نفسیاتی، سماجی یا سیاسی پس منظر میں کھول لیا گیا، تو ان نظموں کا مفہوم یکسر بدل جائے گا''۔

۷.۱ اپنے شہروں کے لیے دُعا (نظم):

پاکستان کے سارے شہرو!

زندہ رہو! پائندہ رہو

روشنیوں، رنگوں کی لہرو

زندہ رہو پائندہ رہو

عکس پڑیں جس جگہ تمھارے

چمکے زمین ان کی ضیا سے

میرے وطن کے چاند ستارو!

زندہ رہو پائندہ رہو

موسم آئیں گزرتے جائیں

تم پر رنگ برستے جائیں

ارضِ خدا پہ مہکتے باغو

زندہ رہو پائندہ رہو

باطل سے تم کبھی نہ ڈرنا

کفر کبھی منظور نہ کرنا

عظمت و ہیبت کی دیوارو

زندہ رہو پائندہ رہو

حق کی رضا ہے ساتھ تمھارے

میری وفا ہے ساتھ تمھارے

نئے اُجالوں کے سرچشمو

زندہ رہو پائندہ رہو

۷.۲ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی:

پائندہ: ہمیشہ زندہ رہنے والے۔ عکس: شبیہ، تصویر۔ ضیا: روشنی۔ ارضِ خدا: خدا کی زمین مراد یہ دنیا۔ مہکتے: خوشبوئیں پھیلاتے۔ باطل: جھوٹا، جو حق پر نہ ہو۔ عظمت: بڑائی، بزرگی۔ ہیبت: خوف۔ حق: سچائی، یہاں مراد اللہ تعالٰی ہے۔ رضا: مرضی۔ اجالوں: روشنیوں۔ سرچشمو: جہاں سے چشمے پھوٹتے ہیں، منبع۔

۷.۳ تشریحات:

(۱):

تشریح: پہلے حصے میں شاعر منیر نیازی پاکستان کے سارے شہروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم سب ہمیشہ کی زندگی پاؤ اور تمھاری تابناکی سدا برقرار رہے۔ تم روشنیوں اور رنگوں کی حسین لہروں کی طرح رہو اور یہ سب اُجالے اور رنگ ہم کو بہت پسند ہیں۔ میری دعا ہے کہ تم سدا سلامت اور آباد رہو، تاکہ تمھارے رہنے والے خوشحال زندگی گزار سکیں۔

(۲):

تشریح: جس جگہ پر تمھاری روشنیوں کے عکس پڑتے ہیں، وہاں کی زمین اس روشنی سے چمک اٹھتی ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے یہ پاکستان کے شہر میرے وطن کے چاند اور ستارے ہیں، جس سے یہاں کے گوشے گوشے چمکتے اور دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اللہ ان شہروں کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔

(۳):

تشریح: میرے وطن میں چار موسم آتے ہیں۔ ہر ایک کے اپنے رنگ ہیں۔ اے میرے وطن کے شہرو! یہ موسم تو یوں ہی آتے اور گزرتے جائیں گے اور تم پر اپنے خوب صورت رنگ بکھیرتے جائیں گے، جن سے تمھارے حسن میں مزید اضافہ ہوگا۔ تم اللہ تعالیٰ کی اس دنیا کے وہ باغ ہو، جو خوشبوؤں اور خوش رنگ پھولوں سے بھرے رہتے ہیں۔ تم یونہی زندہ و پائندہ اور مہکتے رہو۔

(۴):

تشریح: اے میرے وطن کے شہرو! تم نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے، کیونکہ تمھارے در و دیوار میں بہت سے حق پرست رہتے ہیں۔ اس لیے تمھیں باطل سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور تمھیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے خلاف کوئی بھی بات منظور نہیں کرنی چاہیے۔ تم بزرگی اور خوف کی وہ علامت ہو، جسے دیکھ کر دشمن کانپ اٹھتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر کوئی برا وقت آیا، تو تمھارے چاہنے والے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔

(۵):

تشریح: نظم کے آخری حصے میں منیر نیازی اپنے شہروں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر حالات خراب بھی ہو جائیں، تو تمھیں مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا تمھارے ساتھ ہے اور جب اللہ کسی کے ساتھ ہوتا ہے، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس کے علاوہ میری وفائیں اور نیک تمنائیں بھی تمھارے ساتھ ہیں۔ تم سے اُجالے پھوٹتے ہیں اور تم روشنی پھیلانے کا منبع ہو۔ میری دعا ہے کہ تم یونہی ہنستے بستے اور زندہ و تابندہ رہو۔

۷.۴ مرکزی خیال:

اس نظم 'اپنے شہروں کے لیے دُعا' میں شاعر منیر نیازی نے والہانہ انداز میں اپنے شہروں سے لازوال محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور ان کی سلامتی اور بقا کے لیے دعائیں مانگی ہیں کہ اے میرے وطن کے شہرو! تم سدا سلامت اور آباد رہو ،تا کہ تمھارے دشمنوں کے حوصلے پست ہوں اور یہاں ہمیشہ حق و صداقت کا بول بالا رہے؛ یہاں علم کا نور پھیلے اور جہالت کی تاریکیوں کا خاتمہ ہو سکے۔ اے شہرو! تم نور و روشنی کی علامت ہو، تم شاد اور آباد رہو۔

۷.۵ خلاصہ:

نظم 'اپنے شہروں کے لیے دُعا' میں منیر نیازی نے اپنے ملک پاکستان کے تمام شہروں سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ وہ والہانہ انداز میں اپنے شہروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے پاکستان کے سارے شہرو! تم سب زندہ اور آباد رہو، کیونکہ تم روشن رنگوں کی لہریں ہو؛ جس جگہ تمھارے عکس پڑتے ہیں وہ زمین چمک اٹھتی ہے؛ جس طرح آسمان پر چاند ستارے ہیں، تم بالکل زمین پر ان کی طرح رہو۔ موسم آ کر تم پر اپنے خوب صورت رنگ برساتے رہیں گے۔ کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر مہکتے باغوں کی مانند ہو۔ باطل تمھیں نقصان پہنچانے کے درپے ہے، لیکن تم اس سے کبھی نہ ڈرنا اور کفر کی روک تھام کر کے اس کے رستے میں عظمت و ہیبت کی دیوار بن جاؤ، تا کہ وہ تمھارے خوف کی وجہ سے شکست کھانے پر مجبور ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور حمایت تمھارے ساتھ ہے، اس کے علاوہ میری دعائیں اور وفائیں بھی تمھارے ساتھ ہیں، اس لیے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم نئی روشنیاں پھیلانے والے سرچشموں کی طرح ہو۔ خدا کرے کہ تم ہمیشہ زندہ اور پائندہ رہو، تا کہ ہمارے ملک میں علم کا نور پھیل جائے اور ہر جگہ سے ظلمت کے اندھیرے ختم ہو جائیں۔

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا

وزیر آغا دورِ حاضر کے ایک منفرد نظم گو شاعر ہیں۔ وہ تصوف کی بات کرتے ہیں، نہ ترقی پسندی کی۔ انھوں نے عام روش پر چلنے کی بجائے اپنے لیے ایک الگ راستہ تلاش کیا۔ وہ کسی سے متاثر نہیں، البتہ ان کی شاعری پر میرا جی کے علاوہ مغربی شاعری کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے مغرب سے نہ صرف استعارات و علامات کا ایک پورا ذخیرہ حاصل کیا، بلکہ اس سے انفرادیت بھی سیکھی۔

ابہام: وزیر آغا کی نظم میں ابہام بھی موجود ہے، لیکن یہ اس طرح کا ابہام ہرگز نہیں، جو قاری کی سمجھ میں ہی نہ آسکے۔ اس میں تھوڑی بہت آسانی ضرور موجود ہے۔ وہ آزاد تلازمۂ خیال کے قائل ضرور ہے، لیکن اس سے پیدا ہونے والی تصویروں کو وہ شعور کی کسوٹی پر پرکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

امیج:

وزیر آغا امیج اور علامت کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کی تقریباً ہر نظم ایک امیج پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ امیج فطرت سے ماخوذ ہوتا ہے، جس سے وہ لاشعوری طور پیار کرتے ہیں۔ ان کی فکر کا عنصر امیج اور اسلوب کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا سب سے پہلے امیج کی خوب صورتی سے لطف اٹھاتا ہے اور پھر خیال و معنی ہے۔

علامت:

ان کی نظم میں علامت ایک نازک اور مہین پردے کا کام کر کے دلکشی پیدا کرتی ہے، لیکن یہ قاری کو معنی کی تلاش میں سرگرداں نہیں کرتی، بلکہ تھوڑی سی کوشش سے پڑھنے والا آسانی کے ساتھ مطلب تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ فن کو معما یا پہیلی نہیں بناتے، اس لیے ان کی علامت قابلِ قبول ہوتی ہے۔

موت کا خوف:

ان کے ہاں موت کا خوف مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ ان کی نظم میں تیرگی کا ذکر دراصل موت کی طرف اشارہ ہے، لیکن بنیادی طور پر وہ قنوطی نہیں، انھیں زندگی اور زمین دونوں سے پیار ہے۔

عرش صدیقی ان کی شاعری کے اس رخ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔

''تیرگی اس کے ہاں موت کا اشارہ ہے۔زندگی کی ظالمانہ خاموشی اور اس کے جذبات سے بے تعلقی اور عشق اور جذبے کی بے چارگی یہ سب اس کے لیے پریشانی کا سبب ہیں، لیکن وہ چیختا چلاتا نہیں، بلکہ بڑے سکون کے ساتھ اپنے احساس کا اظہار کرتا ہے''۔

ان کی نظموں میں 'جسم، میں اور تو، دکھ، زندگی، ملاقات اور چمکتا لمحہ' وغیرہ نہ صرف یہ کہ عمدہ نظمیں ہیں، بلکہ مندرجہ بالا خصوصیات کا واضح اظہار بھی ان میں موجود ہے۔

۸.۱ کوہ ندا (نظم):

صبح سویرے
ایک لرزتی کانپتی سی آواز آتی ہے
سونے والو ! تم مالک کو بھول گئے ہو
تم مالک کو بھول گئے ہو
پھر چمکیلی مل کا سائرن
ایک غلیظ ڈرانے والی تند صدا۔ کے روپ میں ڈھل کر
دیواروں سے ٹکراتا ہے
اور گلیوں کے
تنگ اندھیرے باڑے میں کہرام مچا کر
بھیڑوں کے گلّے کو ہانک لے جاتا ہے
پھر انجن کی سیٹی
سیخ سی بن کر میرے کان میں گڑ جاتی ہے
اور شب بھر کی تھکی ہوئی اک ریل کی بوگی
اپنی کلائی انجن کے پنجے میں دے کر
چل پڑتی ہے
پھر اک دم سناٹا چھا جاتا ہے

اور میں گھڑی کی ظالم سوئیوں کی ٹک ٹک میں
دن کے زرد پہاڑ پہ چڑھنے لگتا ہوں

۸.۲ مشکل الفاظ وتراکیب کے معانی:

مِل: کارخانہ۔ سائرن: آواز۔ غلیظ: غلاظت یعنی گندی۔ تند صدا: تیز آواز۔ روپ: شکل۔ باڑے: چاردیواری۔ کہرام: شور۔ گلے: ریوڑ۔ ہانک کر: بھیڑوں کو باہر نکالنے کا عمل، بھیڑوں کو چلانا۔ سیٹی: ہلکی اور باریک آواز۔ سیخ: لوہے کی سلاخ۔ گڑ جاتی: سختی سے اندر جاتی ہے۔ نچی: اکیلی، بے سہارا۔ بوگی: ڈبہ۔ سناٹا: خاموشی۔ ٹک ٹک: گھڑی چلنے کی آواز۔

۸.۳ تشریحات:

(۱):

تشریح: ڈاکٹر وزیر آغا اپنی اس علامتی نظم کے آغاز میں فرماتے ہیں کہ صبح سویرے ایک کمزور سی آواز آتی ہے، جو سونے والے لوگوں سے مخاطب ہوتی ہے۔ اس لرزتی آواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ اے سونے والو! تم غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے ہو، تم یہ بھول گئے ہو کہ تمھارا مالک کون ہے؟ کس نے تمھیں پیدا کیا ہے اور کون تمھیں رزق دیتا ہے؟ یوں لگتا ہے۔ شاعر نے جس آواز کی طرف اشارہ کیا ہے وہ موذن کی اذان ہے، جس میں وہ لوگوں کو بیدار کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے۔

(۲):

تشریح: دوسرے حصے میں شاعر نے یہ واضح کیا ہے کہ بستی کے قریب جو کارخانہ ہے، اس سے سات بجے کے قریب ایک تیز آواز نکلتی ہے، جو ایک چیخ کی مانند ہوتی ہے۔ اس سے شفٹ تبدیل ہو جاتی ہے اور رات کو کام کرنے والے مزدوروں کی چھٹی ہوتی ہے، جبکہ دن والے مزدور اپنی ڈیوٹی کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جب مل کی یہ تلخ آواز بستی کی گلیوں کی دیواروں سے ٹکراتی ہے، تو سارے لوگ بیدار ہو جاتے ہیں اور زندگی کی بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ بستی جانوروں کے ایک باڑے کی طرح ہے جس میں کسی کے داخل

ہوتے ہی جانور اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں؛ سارے لوگ اپنے کاموں کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔

(۳):

تشریح: صبح ہوتے ہی ریل کا انجن بھی آواز لگا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ وہ بھی سفر پر روانہ ہو جاتا ہے اور اس کی چیخ میرے کان میں نیزے کی طرح اُترتی ہے۔ مجھے اس کی آواز سے بہت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ انجن کے پیچھے ریل کا وہ ڈبہ بھی لگایا جاتا ہے، جو رات بھر پٹڑی پر کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ انجن کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چلنا شروع کر دیتی ہے اور انجن کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔

(۴):

تشریح: آخری حصے میں شاعر اپنی تنہائی کا نقشہ بیان کرتا ہے کہ صبح کی اذان، مل کی آواز اور ریل کی سیٹی کے بعد جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں، تو اس کے بعد مکمل خاموشی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ اتنے سارے ہنگاموں کے باوجود میں تنہا ہو جاتا ہوں اور پھر گھڑی کی چلنے والی سوئیوں کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں، جو نہ کسی کا انتظار کرتی ہیں اور نہ کسی کی تنہائی کا لحاظ، بلکہ اپنی دھن میں وقت کو آگے بڑھاتی ہیں۔ میں بھی وقت کے اس اعداد و شمار میں تنہائی کا وہ دن جو ایک پہاڑ کی طرح مشکل ہوتا ہے، کاٹنے لگ جاتا ہوں۔

۸.۴ مرکزی خیال:

اس علامتی نظم میں ڈاکٹر وزیر آغا اپنی تنہائی کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک طرف تو صبح ہوتے ہی زندگی کے ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں، سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر جاتے ہیں؛ بے جان چیزیں بھی کسی نہ کسی طرح رفاقت اختیار کر لیتی ہیں، لیکن دوسری طرف میری تنہائی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے اور میں اکیلا بیٹھ کر سارا دن کسی کے انتظار میں گھڑیاں گنتا ہوں؛ یہ انتظار بالکل پہاڑ کاٹنے کے برابر اور مترادف ہے۔

۸.۵ خلاصہ:

شاعر اس نظم میں زندگی کے ہنگاموں میں اپنے اکیلے پن کے بارے میں بتاتا ہے کہ صبح سویرے موذن ایک

لرزتی کانپتی آواز میں بستی کے رہنے والوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے یہ صدائیں لگاتا ہے کہ اے سونے والو! تم اپنے رب کو بھول گئے ہو۔ اس کے بعد قریب کے مل سے ایک خوفناک سائرن نکلتا ہے، جو ساری بستی کو جگا دیتا ہے۔ بستی کے وہ لوگ جو تھوڑی دیر پہلے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے تھے اب اپنے اپنے مقاصد اور مطالب کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چرواہا بھیڑوں کے باڑے میں آ گیا ہو اور انھیں ہانک کر لے جا رہا ہو۔ اس کے بعد ریل کا انجن بھی چل پڑتا ہے اور وہ بوگی جو رات اکیلے پٹڑی پر کھڑی تھی، وہ بھی انجن کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر سفر شروع کر دیتی ہے۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ سب لوگ یہاں تک کہ بے جان چیزیں بہت مصروف ہیں اور دوسری طرف میں ہوں کہ اکیلا پڑا، وقت کی ساعتیں گن رہا ہوں؛ بڑی مشکل سے صبح سے شام کرتا ہوں، نہ کوئی میرے پاس آتا ہے نہ مجھے کوئی بلاتا ہے۔

خود آزمائی

ا۔ سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف۔ اقبال کے مطابق: مومن کی شخصیت کے چار عناصر کون سے ہیں؟

ب۔ 'مردِ مسلماں' کی کوئی سی چار صفات تحریر کریں۔

ج۔ نظم 'مردِ مسلماں' کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

د۔ 'قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن' اس مصرع کی وضاحت کریں۔

ہ۔ اختر شیرانی کی نظم 'نغمۂ زندگی' کا مرکزی خیال لکھیں۔

و۔ 'سینۂ کاشتکار' میں زندگی کا نغمہ کیسے گونجتا ہے۔

ز۔ اختر شیرانی کے مطابق 'رہ روِ ارتقا' کے لیے زندگی کیا معنی رکھتی ہے۔

ح۔ 'البیلی صبح' کا مرکزی خیال لکھیں۔

ط۔ صبح کی آمد کا منظر تحریر کریں۔

ی۔ بیلے کی کلی پر شبنم کے قطرے کو دیکھ کر کیا گمان گزرتا ہے؟

ک۔ چاند کے گرد و پیش چھپتے ہوئے ستاروں کا منظر کس کی یاد دلاتا ہے؟

ل۔ 'میں اسے واقفِ الفت نہ کروں' کا مرکزی خیال لکھیں۔

م۔ شاعر اپنے محبوب کو واقفِ الفت کیوں نہیں کرنا چاہتا؟

ن۔ ن م راشد کے مطابق: دنیا میں الفت کا انجام کیا ہوتا ہے؟

س۔ 'دور و نزدیک' کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

ع۔ 'اپنے شہروں کے لیے دعا' کا مرکزی خیال قلم بند کریں۔

ف۔ منیر نیازی نے پاکستان کے شہروں کو کیا دعا دی ہے؟

ص۔ 'کوہ ندا' کا مرکزی خیال لکھیں۔

ق۔ صبح سویرے ایک کانپتی سی آواز سونے والوں کو کیا پیغام دیتی ہے؟

ر۔ وزیر آغا کے مطابق صنعتی شہر کی زندگی صبح سویرے کیا منظر پیش کرتی ہے؟

ش۔ علاّمہ اقبال کی شاعری میں 'خودی' سے کیا مراد ہے؟

ت۔ علاّمہ اقبال نے خودی کے کتنے مراحل بتائے ہیں؟

ث۔ علاّمہ اقبال کی شاعری میں 'مردِ مومن' کے کیا اوصاف گنوائے گئے ہیں؟

خ۔ علاّمہ اقبال کے مردِ مومن اور شاہین میں کیا صفات مشترک ہیں؟

ذ۔ مغربی تہذیب اور تعلیم کے بارے میں علاّمہ اقبال کی رائے کیا تھی؟

ض۔ علاّمہ اقبال مغربی جمہوریت کو تنقید کا نشانہ کیوں بناتے ہیں؟

ظ۔ اختر شیرانی اور حافظ محمود شیرانی کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

غ۔ اختر شیرانی کی دو کتابوں کے نام لکھیں۔

ٹ۔ اختر شیرانی کے ہاں رومانیت کے کیا تقاضے ہیں؟

ڈ۔ جوش ملیح آبادی اردو شاعری میں کن دو حوالوں سے مشہور ہیں؟

ڑ۔ حلقہ ارباب ذوق میں میرا جی کا کیا مقام ہے؟

ز۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی کوئی سی چار تصانیف کے نام لکھیں۔

یونٹ نمبر......۹

قواعد و انشا

تحریر: ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

فہرستِ مضامین

۳۔ آپ بیتی

۳.۱۔ آپ بیتی کیا ہے؟

۳.۲۔ آپ بیتی کے لوازم

۳.۳۔ آپ بیتی کیسے لکھیں؟

۳.۴۔ ایک شکستہ عمارت کی آپ بیتی

۳.۵۔ گلاب کے پھول کی آپ بیتی

۴۔ مضمون نگاری

۴.۱۔ مضمون کیا ہے؟

۴.۲۔ مضمون نویسی کے لوازمات

۴.۳۔ مضمون کے حصے

۴.۴۔ مضمون کیسے لکھا جائے؟

۴.۵۔ اچھے مضمون کی خوبیاں

۴.۶۔ چند اہم مضامین کے خاکے

☆ خود آزمائی

یونٹ کے مقاصد

عزیز طلبہ و طالبات!

اس یونٹ میں آپ قواعد اور انشا کا مطالعہ کریں گے۔ قواعد کے حصے میں: علم بدیع کی مختلف صنعتوں کی تعریف اور ان کی شعری مثالیں دی گئی ہیں، تا کہ آپ کو ان کے معنی و مفہوم سے آگاہی ہو سکے اور ان کی جو مثالیں دی گئی ہیں۔ ان کے تناظر میں بدیع کی مختلف صنائع کو پہچاننے میں ... رموزِ اوقاف میں مختلف رموز اور علائم کی مثالوں کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے، تا کہ انھیں سمجھنے ... کی علامتی معنویت کو جاننے اور سمجھنے سے آگاہی ہو سکے۔

انشا کے حصے میں آپ: آپ بیتی اور مضمون نگاری کے مختلف اصول و ضوابط کا مطالعہ کریں گے۔ شامل نصاب انشائی پہلوؤں کے مختلف نمونے اور خاکے دیے گئے ہیں، تا کہ ان کی روشنی میں آپ مختلف اشیاء کی آپ بیتی لکھ سکیں اور مختلف عنوانات پر مضامین تحریر کر سکیں۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔ علم بدیع اور اس کی مختلف صنعتوں سے آگاہ ہو سکیں۔

۲۔ رموزِ اوقاف کی علامات پہچان کر ان کے درست استعمال سے متعارف ہو سکیں۔

۳۔ کسی بھی چیز کی آپ بیتی اور کسی بھی عنوان پر مضمون لکھ سکیں۔

ا۔ علم بدیع

علم بدیع وہ علم ہے جس کے ذریعے محسناتِ کلام یا خوبی ہائے شعر کے کوائف دریافت کیے جاتے ہیں۔ یہ محسنات یا الفاظ میں ہوں گے یا معنی میں، لیکن ان کی موجودگی فنکار پر واجب نہیں ہے، البتہ موزوں و مناسب ہے کہ اس کا کلام خوبیوں سے آراستہ ہو۔

صنائع لفظی:

صنائع معنوی:

۱.۱ مراعاۃ النظیر :

کلام میں کئی ایسی چیزیں مذکور ہوں، جو باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہوں، لیکن یہ مناسبت بطور تضاد نہ ہو۔

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

۱.۲ صنعتِ تضاد یا طباق:

شعر میں دو ایسے الفاظ کا استعمال جن میں تضاد ہو، جیسے:

ہم وحشیوں نے صحنِ گلستاں سے اے خزاں

تنکے بھی چن لیے کہ شریکِ بہار تھے

۱.۳ حسنِ تعلیل:

کسی امر کے لیے ایسی وجہ بیان کی جائے، جو درحقیقت اس کی وجہ نہ ہو۔ حقیقی وجہ کچھ اور ہو یا وجہ معلوم ہی نہ ہو۔

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی

ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

۱.۴ صنعتِ مبالغہ:

یعنی کسی امر کو شدت وصنعت میں اس حد تک پہنچا دینا کہ اس حد تک اس کا پہنچنا محال ہوتا، کہ سننے والے کو یہ

گمان نہ رہے کہ اس وصف کا اب کوئی مرتبہ باقی ہے:

اب یہ حالت ہے کہ ان سا بے درد
میرے مرنے کی دعا مانگے ہے

1.5 صنعتِ تلمیح:

شاعر اپنے کلام میں کسی مشہور مسئلے یا قصے یا اصطلاح وغیرہ کی طرف اشارہ کرے اور یہ اشارہ توضیح کا رنگ اختیار نہ کرے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

1.6 صنعتِ مہملہ:

ایسے الفاظ کا استعمال، جن میں نقطے استعمال نہ ہو:

ہم طالعِ ہما مرا وہم رسا ہوا
طاؤسِ کلکِ مدح اُڑا اور ہما ہوا

۲۔ رموزِ اوقاف

ہم اپنی بات دوسروں تک دو ذرائع سے پہنچاتے ہیں۔ایک گفتگو یا تقریر کے ذریعے اور دوسرا تحریر کے ذریعے ------۔تقریر یا گفتگو میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ ہم چہرے کے تاثرات یا اشاروں (باڈی لینگویج) اور ٹھہر یا رک کر یا استفہامیہ انداز اپنا کر اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں، جب کہ تحریر میں یہی کام علامتوں سے لیا جاتا ہے، جنھیں رموزِ اوقاف کہتے ہیں۔

رموز (رمز کی جمع) سے مراد اشارے اور اوقاف (وقف کی جمع) کا مطلب رکنا یا ٹھہرنا ہے۔گویا رموزِ اوقاف ایسی علامات ہیں، جو ایک جملے کو دوسرے جملے یا ایک جملے کے مختلف حصوں کو الگ الگ کرتی ہیں۔ان علامات کو دیکھ کر قاری سمجھ جاتا ہے کہ یہاں رکنا ہے، تو کتنی دیر یا جملے کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ یہ اشارات اور وقفے دنیا کی تمام زبانوں میں درج ہیں، ہم انھیں قرآنِ پاک میں بھی دیکھتے ہیں۔..........ان کا فائدہ یہ ہے کہ زبان ونظر کو سکون میسر آتا ہے اور تفہیمِ عبارت میں سہولت میسر آتی ہے

ذیل میں ہم زیادہ استعمال ہونے والے رموزِ اوقاف کی وضاحت کریں گے۔یاد رہے کہ ان کی تعداد دو درجن سے زائد ہے۔

اردو نام	علامت	انگریزی نام
۱۔ سکتہ	،	Comma
۲۔ وقفہ	؛	Semi colon
۳۔ رابطہ	:	Colon
۴۔ تفصیلیہ	:۔	Colon dash
۵۔ ختمہ	۔	Full stop
۶۔ سوالیہ	؟	Mark of Interogation
۷۔ فجائیہ، ندائیہ، استعجابیہ	!	Mark of Excalmation
۸۔ قوسین	[ ] , { } , ( )	Barkets
۸۔ خط	______	Dash or line
۱۰۔ واوین	" "	Inverted Commas

یاد رہے کہ رموزِ اوقاف کے نہ ہونے سے تحریر کی تفہیم میں دقت ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات قاری اپنی مرضی کا مطلب اخذ کر سکتا ہے، جو لکھنے والے کی منشا کے الٹ بھی ہوسکتا ہے، مثلاً:

رکومت دوڑو۔

اس جملے سے دو مفہوم لیے جا سکتے ہیں۔ایک یہ کہ رکو مت، بس دوڑتے رہو اور دوسرا یہ کہ رک جاؤ اور دوڑنا ختم کر دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب ہم علامت لگا دیں، تو بات واضح ہو جائے گی۔

رکومت! دوڑو۔

مفہوم واضح ہے کہ دوڑنا ہے اور اگر علامت اس طرح لگا دی جائے۔

رکو! مت دوڑو۔

اب جملے کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ رک جانا ہے، دوڑنا نہیں۔ یہ مثال علاماتِ وقف کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرتی ہے۔اب ہم ایک ایک علامت کو ذرا تفصیل سے اور وضاحت سے لکھتے ہیں۔

۲.۱ سکتہ (،) Comma:

تعریف:

یہ ایک چھوٹا سا وقفہ ہے۔ جملے میں جہاں ذرا دیر رکنا ہو، وہاں یہ علامت لگاتے ہیں۔

علامت: (،)

وضاحت:

اگر کسی جملے میں دو سے زائد نام آئیں، تو آخری کو چھوڑ کر باقی کے درمیان سکتے کی علامت دیتے ہیں، جیسے:

اشفاق، قاسم اور علی محمد لاہور آئے۔اشفاق، قاسم، محمد علی، نوید اور حامد سیر کو نکل گئے۔

۳۔ بچے، مرد اور عورتیں میلہ دیکھنے گئے۔

☆ اگر اسما کی جگہ ضمائر آئیں، تو ان ضمائر کے مابین بھی سکتے کی علامت لگاتے ہیں، جیسے: میں، آپ اور وہ ایک ہی ریل کے مسافر ہیں۔

☆ اسما کی بجائے اگر اوصاف (Adjictive) دو سے زائد ہوں، تو بھی یہ علامت لگاتے ہیں، جیسے:

ارشد ذہین، زود فہم اور دیانت دار افسر ہے۔

☆ دو سے زائد افعال کے درمیان، جیسے: وہ آیا، دیکھا اور بیٹھ گیا۔

☆ کسی طویل جملے کو حصوں میں تقسیم کرنا، جیسے: کیسی ہی مشکلات آئیں، آسمان ٹوٹے یا زمین پھٹے، آپ خدا کی یاد دل میں بسائے رکھیں۔

☆ ایسے اسما، ضمائر یا الفاظ جو ایک دوسرے کے بدل کے طور پر آئیں، جیسے: بانی پاکستان، قائدِ اعظم ۱۴ اگست کو قوم کے سامنے سرخرو ہو گئے۔

آقائے دو جہاں، سرورِ کائنات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے بعد سب سے بڑی ہستی ہیں۔

☆ تشریحی اجزا کے درمیان، جیسے: حامد گل کا وزن ۷۰ کلوگرام، قد دو میٹر اور چھاتی ۳۸ میٹر ہے۔

☆ شرطیہ جملوں میں، جیسے: اگر تیز دوڑتے، تو اول آتے۔

☆ اگر کسی جملے میں "کر" "یا" "کے" حذف ہو، تو ان کی جگہ، جیسے: زمیل گھوڑے پر بیٹھ، اسلحہ لگا، شکار کو چلا گیا۔

اسی طرح اور بھی بہت سے مقامات ایسے ہیں، جہاں سکتہ لگایا جاتا ہے۔

۲.۲ وقفہ (؛) Semi Colon

تعریف:

جہاں سکتے کی نسبت زیادہ ٹھہراؤ ہو، وہاں یہ علامت لگاتے ہیں۔

علامت: (؛)

وضاحت:

☆ بڑے جملے کے حصوں کو الگ کرنے کے لیے:

اردو ذریعۂ تعلیم سے مافی الضمیر کے اظہار میں آسانی ہوتی ہے؛ عمومی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں؛ شرح خواندگی

میں یقینی طور پر اضافہ ہوتا ہے۔

ہمارا سماجی ڈھانچہ درہم برہم ہو چکا ہے؛ اخلاقیات کا نظام کھوکھلا ہو چکا ہے؛ قومی اتحاد نام کی کوئی چیز نہیں رہی ؛ ہم دنیا میں مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔

☆ جب جملوں میں تاکید مقصود ہو، تو یہ علامت لگاتے ہیں، جیسے: جیو تو شان سے؛ مرو تو مسلمان مرو۔ آپ کو اس ملک نے آزادی دی؛ روزگار دیا؛ عزت دی؛ محبت دی؛ آخر اور کیا چاہتے ہو۔

☆ جب اجزا پر زور دینا مقصود ہو، جیسے: تم روئے، تو ماں تڑپ اٹھی؛ تم پریشان ہوئے، تو اس کے آنسو اُمڈ آئے؛ اس نے تمھیں پالا پوسا؛ پرورش کی؛ بڑا کیا اور اب تمھاری یہ گستاخیاں۔

۲.۳ رابطہ (:) Colon

تعریف:

جہاں وقفے سے زیادہ ٹھہراؤ ظاہر کرنا ہو، وہاں یہ علامت لگاتے ہیں۔

علامت: (:)

وضاحت:

☆ کسی ضرب المثل یا معروف قول سے پہلے، جیسے: قائد اعظم کا قول: کام، کام اور بس کام۔

☆ ایک دانا کا فرمان ہے: چاند کا تھوکا منہ پر۔

☆ مثالوں سے پہلے، جیسے: لاہور میں کئی ایک مغل بادشاہوں کی یادگاریں ہیں، مثلاً: شاہی مسجد، شاہی قلعہ، مقبرۂ جہانگیر اور شالا مار باغ وغیرہ۔

☆ الفاظ اور معنی کے درمیان، جیسے: چار و ناچار: مجبوراً۔ ڈھب پر چڑھنا : قابو میں آنا

☆ حرفِ توجیہہ اور حرفِ تاکید کی جگہ پر، جیسے: نشے سے بچو: نشہ موت کا دوسرا نام ہے۔ دعوے بہت کرتا ہے: عمل نہیں کرے گا۔

☆ توجیہی جملوں میں، جیسے: نیکی ہر دو جہاں میں کامیابی کا ضامن ہے۔ اس جہاں میں اخلاقیات کے سبب اور آخرت میں بخشش کا ذریعہ۔

۲.۴ تفصیلیہ (:-) Colon Dash

تعریف:

جب کسی بات کی تفصیل بتانا مقصود ہو، یہ علامت لگاتے ہیں۔

علامت: (:-)

وضاحت:

☆ عموماً مندرجہ ذیل، درجِ ذیل، مختصر یہ کہ........ کے بعد، جیسے:

☆ لازمی مضامین یہ ہوں گے:-

خطبہ حجتہ الوداع کے اہم نکات درجِ ذیل ہیں:-

☆ جب کسی اصول یا قاعدے کی مثال پیش کرتے ہیں اور مثلاً یا جیسے نہیں لگاتے، کسی خوبی کی بنا پر دوسری چیز جیسا قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے:- خرگوش کی کھال کی طرح ملائم

☆ طویل اقتباس کے لیے

سیالکوٹ میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:-

"..

....

...."

۲.۵ ختمہ (-) FULL STOP

تعریف:

کسی جملے کے اختتام پر یہ علامت لگائی جاتی ہے۔ انگریزی میں نقطہ اور اردو میں مختصر لائن لگاتے ہیں۔

علامت: (-)

وضاحت:

☆ جملے کے اختتام پر: علم کے بغیر افراد اور اقوام دھرتی پر بوجھ ہیں۔

☆ مختلف الفاظ سے مخفف درج کرتے ہوئے، جیسے: پی ایچ۔ ڈی

نوٹ: یہ انگریزی زبان سے ہو بہو اپنا لیا گیا ہے۔ انگریزی میں تو حروف تہجی کے آپس میں گڈ مڈ ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے، اردو میں ایسا کوئی خدشہ نہیں، مثلاً: ایم بی اے یا سی ایس ایس لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲.۶ سوالیہ (؟) MARK OF INTERROGATION

تعریف:

سوالیہ یا استفہامیہ جملوں کے آخر میں لگایا جاتا ہے۔

علامت : (؟)

وضاحت :

☆ آپ کب تشریف لائے؟

☆ دوسرا پریڈ کے بجے ہوگا؟

☆ آپ کا اسمِ گرامی؟

۲.۷ فجائیہ، استعجابیہ، ندائیہ (!) MARK OF EXCLAMATION

تعریف:

اس جملے میں یہ علامت لگائی جاتی ہے، جس میں کسی جذبے، مثلاً: غصّے، ناراضی، حیرت، خوف یا خوشی کا اظہار کیا گیا ہو---اسے فجائیہ کہیں گے۔

آہا ! ہم نے میچ جیت لیا۔

اف ! میں تو مارا گیا۔

افوہ ! اتنی گرمی اور لوڈ شیڈنگ۔

استعجابیہ: حیرت:

اتنی بلند عمارت !

سبحان اللہ ! پھر پڑھیے۔

ندائیہ: جس کسی کو پکارا جائے، جیسے:

شاہد ! کہاں ہو؟

اللہ ! رحم کر۔

۲.۸ قوسین ( ) :Barckets

اس کو خطوطِ وحدانی بھی کہا جاتا ہے۔ کسی لفظ یا جملے کو ممتاز کرنا یا اس کی وضاحت کرنا مقصود ہو، تو یہ علامت لگاتے ہیں۔

پروفیسر ارشد (علم عروض کے ماہر) طلبہ کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔

مشتاق یوسفی (ممتاز مزاح نگار) کی آخری کتاب عنقریب چھپے گی۔

حنا عباس کی بہن (ہما) جماعت میں اول آئی۔

۲.۹ خط (____) :Dash

یہ قوسین کا متبادل استعمال ہوتا ہے۔

☆ میرے دوست ! یہ آپ کی حماقت ہے کہ رمیز جیسے بد نام آدمی ____ جسے آدمی کہنا بھی آدمیت کی توہین ہے، پر اعتماد کیا۔

☆ یہ علامت بعض اوقات وضاحت اور تشریح کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

وہ اپنا سارا اثاثہ ____ جاگیر، کوٹھی اور دکانیں بیچ کر لندن چلا گا۔

استادِمحترم کی اصل متاع ــــــ کتابیں، رسائل اوراسادان کے لیے باعثِ افتخار تھیں۔

۲.۱۰ واوین ("   ") INVERTED COMMAS("   ")

یہ علامت کسی اقتباس یا قول کے دونوں طرف لگاتے ہیں۔

☆ اس اقتباس کی تشریح کریں:

"-------------------------

-------------------------"

حضورؐ کا فرمان ہے:

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے"

۲.۱۱ چند مزید علامات

مذکورہ بالا علامات کے علاوہ بھی کچھ علامات ایسی ہیں، جو اردو میں مستعمل ہیں، لیکن ان کا استعمال کم ہوتا ہے، اس لیے ان کا ذکر ذرا مختصر ہوگا۔

۲.۱۱.۱ علامتِ حذف (-----) Dots of mission(-----)

جب کوئی پیراگراف لکھا جارہا ہو یا کوئی مصرع اور جملہ اور ہم پورا نہیں لکھتے، اُن کے کچھ الفاظ یا سطریں حذف کردیتے ہیں۔ تو یہ علامت لگائی جاتی ہے۔

شام کو-------------روتے سو گیا۔

یاد رہے کہ حذف کی ڈاٹس کی نسبت حذف شدہ سطروں اور الفاظ سے راست متناسب ہونی چاہیے۔

۲.۱۱.۲ اکہرے واوین (' ـــــ ')

جہاں واوین کے درمیاں کسی اور کا قول نقل کیا جائے، وہاں لگاتے ہیں۔ حامد نے تقریر کرتے ہوئے کہا: "ہم

آزاد ہیں، لیکن ذہنی غلامی اب بھی نہیں چھوڑ سکے۔ مجھے قائداعظم کے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔ ' تم اس وقت ۔۔۔' مگر ہم نے سب کچھ بھلا دیا۔"

ان کے علاوہ ترچھا خط، خطِ زیریں، علامتِ تسویہ، علامتِ تجزیہ اور تحقیق میں چند اور علامات بھی استعمال ہوتی ہیں، مگر علامات اور ان کا استعمال آپ کے نصاب کا حصہ نہیں۔

۳۔ آپ بیتی

۳.۱ آپ بیتی کیا ہے؟:

آپ بیتی خودنوشت سوانح عمری ہوتی ہے۔اس میں کوئی بھی شخص اپنے اوپر گزرے حالات اور واقعات شروع سے تادمِ تحریر ایک تسلسل اور ترتیب سے بیان کرتا ہے۔اسے انگریزی میں آٹو بائیوگرافی اور فارسی میں خودنوشت کہتے ہیں۔ ہر شخص کی زندگی کے چونکہ بہت سے گوشے دوسروں کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں، اس لیے جب وہ ان گوشوں سے پردہ اٹھاتا ہے، تو قارئین کے لیے دلچسپی کے کئی پہلو نکل آتے ہیں۔آپ بیتی ایسی صنفِ ادب ہے، جسے نہایت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

اردو ادب میں بہت سی آپ بیتیاں موجود ہیں۔البتہ نصاب کے مطابق جو آپ بیتی لکھنے کو کہا جاتا ہے، وہ فرضی آپ بیتیاں ہوتی ہیں اور ان کا زیادہ تر تعلق جانوروں، پودوں یا بے جان اشیا سے ہوتا ہے اور ان اشیا کو ناطق سمجھ کر ان پر بیتے ہوئے احوال کا ذکر کیا جاتا ہے، مثلاً: اگر برگد کے درخت کی آپ بیتی لکھنے کو کہا جائے، تو آپ خود کو برگد تصور کر کے تخیل کے زور پر وہ باتیں لکھیں گے، جو ایک برگد کو پیش آسکتی ہیں۔

۳.۲ آپ بیتی کے لوازم:

۱۔ اگرچہ آپ بیتی ایک ڈرائیور، ڈاکیے، کلرک، شاعر یا معلم کی بھی لکھی جاسکتی ہے، لیکن زیادہ تر آپ بیتیاں فرضی، خیالی اور غیر انسانی ہوتی ہیں۔فرض کر لیا جاتا ہے کہ متعلقہ جانور یا چیز کو قوت گویائی مل گئی ہے اور وہ صیغہ واحد متکلم (میں) میں اپنی کہانی بیان کر رہا ہے۔آپ کو چاہیے کہ آپ بیتی لکھتے وقت واحد متکلم کا صیغہ استعمال کریں۔

۲۔ معیاری آپ بیتی لکھنے کے لیے چونکہ ٹھوس معلومات درکار ہوتی ہیں، اس لیے آپ کی قوتِ مشاہدہ میں گہرائی اور وسعت ہونی چاہیے اور آپ کی معلومات کا ذخیرہ وسیع ہونا چاہیے۔مختلف اشیا کے بارے میں حقائق کا علم مشاہدے اور مطالعے سے حاصل ہوتا ہے۔آپ کو چاہیے کہ شعوری طور پر مختلف جانوروں، پرندوں، پھولوں، پودوں، درختوں اور اشیا کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور مختلف افراد اور کتب کا مطالعہ کریں،

مثلاً: آپ ہد ہد کی آپ بیتی لکھنا چاہیں، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآنِ کریم میں حضرتِ سلیمانؑ کے حوالے سے ہد ہد کا ذکر آیا ہے۔ یہ خوراک کیسے حاصل کرتا ہے اور اس کا ٹھکانا کہاں ہوتا ہے؟ اس کی شکل کیسی ہوتی ہے؟ اتنا کچھ جان کر ہی آپ اس کی آپ بیتی لکھ سکیں گے۔

۳۔ نصاب میں آپ بیتی کو شامل کرنے کا ایک مقصد چونکہ آپ کے تخیل کی صلاحیت بڑھانا ہے، اس لیے آپ اپنی قوتِ متخیلہ کی جتنی تربیت کریں گے، آپ کے لیے آپ بیتی لکھنا اتنا ہی آسان ہوتا جائے گا۔

۴۔ تحریری مشق کے بغیر نہ صرف اچھی آپ بیتی بلکہ مضمون اور خط بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ آپ کو چاہیے کہ آپ بیتیاں لکھنے کی تحریری مشق کریں۔ آپ کو مطلوبہ الفاظ اور اصطلاحات کے درست استعمال کا سلیقہ آئے گا؛ آپ کو کئی دقتیں پیش آئیں گی؛ فنی اور تکنیکی معلومات کی ضرورت کا احساس ہوگا، آپ ان رکاوٹوں کو مشق سے دور کریں گے؛ آپ کی تحریر میں اس مشق سے پختگی آئے گی اور ایک وقت آئے گا کہ آپ معیاری آپ بیتی لکھنے کے لائق ہو جائیں گے۔

۵۔ آپ جو آپ بیتی لکھنا چاہ رہے ہیں، یہ ایک فرضی کہانی ہے، جو حقیقت کے قریب تر ہونی چاہیے اور اس کا انداز ایسا ہو کہ دلچسپی کا پہلو نمایاں رہے؛ اس میں تحریر کی کیفیت بھی ہو اور قاری یہ سمجھے کہ سچ مچ ایسا ہی تھا۔

۶۔ زبان اور بیان حالات و واقعات کے مطابق ہو اور مبالغے کا داستانی عنصر شامل نہ ہو۔ فطری انداز میں اور فطرت کے قریب ہو؛ بے ساختگی اور شگفتگی کے عناصر موجود رہیں۔

ایک مثال کے ذریعے ان لوازم کے درست استعمال کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

۴.۳ آپ بیتی کیسے لکھیں؟

فرض کریں آپ کتاب کی آپ بیتی لکھنا چاہتے ہیں، تو آپ سے موضوع یہ تقاضا کرتا ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ پاکستان میں کاغذ چارسدہ پیپر ملز یا پیکجز لمیٹڈ لاہور میں تیار ہوتا ہے یا باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ کاغذ کارخانوں میں بڑے بڑے تختوں کی شکل میں تیار ہوتا ہے اور بڑے بڑے بنڈلوں کی صورت میں کارخانے سے باہر لایا جاتا ہے۔ پھر یہ گٹھے ریل یا ٹرکوں کے ذریعے پیپر مارکیٹ تک پہنچائے جاتے ہیں۔ وہاں سے آپ تخیل کے زور پر کاغذ کی کٹائی، مصنف کی صلاحیت، موضوع کی اہمیت اور کمپوزنگ کے مراحل طے کریں گے۔ یہ مواد پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ کے مراحل طے کر کے بٹر پیپر یا سفید کاغذ پر آخری پروف کی شکل اختیار کرے گا۔ اس کے بعد پریس میں چھپائی ہوگی اور

کتاب مارکیٹ میں پہنچے گی۔ وہاں سے کوئی شخص یا لائبریرین خریدے گا اور پھر بہت سے ہاتھوں سے گزر کر ابتر حالات کو پہنچے گی۔ کبھی میز پر سجے گی؛ کبھی تکیے کے نیچے، کوئی بے ذوق اپنی بھدی لکھائی سے اس کا حلیہ خراب کرے گا؛ تو کوئی اسے ذوق وشوق سے پڑھے گا۔ آپ کی قوتِ متخیلہ اس میں کتنے ہی رنگ بھر سکتی ہے۔ ایک مدت بعد یہ کتاب پرانی ہو کر ردی کی دکان پر پڑی ہوگی۔

آئندہ صفحات میں دو آپ بیتیاں دی جارہی ہیں اور ایک کا مختصر خاکہ۔ یہ محض نمونے ہیں۔ آپ مختلف عنوانات پر طبع آزمائی کی کوشش اور مشق کریں، مگر بہت اختصار یا بے جا طوالت سے آپ بیتی کے فنی پہلوؤں کو مجروح نہ کریں۔

۴.۳ ایک شکستہ عمارت کی آپ بیتی:

کاش آپ چشمِ تصور سے ڈیڑھ صدی پہلے کے مناظر دیکھ سکتے اور اگر اس زمانے میں ذرائع ابلاغ بہتر ہوتے، تو آج میں آپ کو منہ زبانی آپ بیتی سنانے کی بجائے وڈیو دکھاتی۔ آپ کی عقل دنگ رہ جاتی اور شاید آپ بھی اس زمانے کے ناظرین کی طرح میری شان وشوکت اور حسن و جمال دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے۔ گھر گھر اور جگہ جگہ میرے حسن کے چرچے کرتے۔ ابھی جہاں آپ پتھروں کے ڈھیر پہ کھڑے ہو کر مووی بنا رہے تھے۔ یہ کبھی میرا زنان خانہ ہوا کرتا تھا؛ یہاں آراستہ و پیراستہ کمرے تھے؛ دنلان تھے۔ اس زمانے میں کہ لوگوں نے قالینوں کا نام بھی کم کم سنا تھا، میرے کمروں میں قالین بچھے تھے، ریشمیں پردے سرسراتے؛ یہاں مسندوں پر بیگمات اور ان کی شہزادیاں بھاری بھر کم ملبوسات میں گاؤ تکیے لگا کر بیٹھا کرتیں؛ خوشبوئیں پھیل پھیل جاتیں اور خادماؤں کے جھرمٹ میں وہ روزانہ ہی شام کو شمالی باغ کی روشوں کو زینت بخشتیں۔

آج سے ڈیڑھ صدی قبل جی ٹی روڈ سے مغرب میں دو کلومیٹر دور کوٹ جمال سے ذرا فاصلے پر دریا کے کنارے میری بنیاد رکھی گئی۔ ملک سکندر خان نے سنگِ بنیاد رکھنے کی زحمت وزیرِ زراعت سرضیا الدین چودھری کو دی۔ اس روز کوٹ جمال کی آرائش دیکھنے کے لائق تھی۔ میری بنیادوں میں رواج کے مطابق کچھ سکے بھی دفن کیے گئے۔ اب جو تعمیر شروع ہوئی، تو مسلسل دو سال تک جاری رہی اور دور سے لائے گئے کاریگروں نے میرا انگ انگ نکھار دیا۔ سیکڑوں مزدور جو ملک سکندر خان کے مزارع تھے، بیگار میں لائے جاتے رہے اور پھر وہ دن آیا جب رنگ و روغن سے مجھے مزین کر دیا گیا۔ قالین بچھائے گئے؛ اعلیٰ درجے کا فرنیچر سیٹ کیا گیا؛ ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام ہوا؛ کئی ایک جاگیردار، ملک سکندر خان کے دوست اور افسران تشریف لائے۔ اس زمانے میں بجلی نہیں تھی، لیکن روشنی کا ایسا اہتمام کیا گیا تھا کہ دن کا سماں پیدا ہو گیا۔ اس روز مجھے اپنے حسن پر خود ہی رشک آیا۔

میں نہ صرف تاریخ کا حصہ ہوں، بلکہ تاریخی واقعات کی چشم دید گواہ بھی ہوں۔ میں نے برِ عظیم میں قائم انگریز راج دیکھا۔ انھوں نے اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے جو جاگیرداری نظام قائم کیا تھا، میں نے اس کا عروج دیکھا۔ میں نے سکندر خان، جسے انگریزوں نے جاگیر دے کر اور دفعہ ۳۰ کے مجسٹریٹ کے اختیارات دے کر علاقے کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا، کے رعب اور طنطنے دیکھے؛ اسے ظلم اور کبھی کبھی انصاف کرتے دیکھا۔ انسانوں کو انسان کے سامنے روتے بلکتے اور جھکتے دیکھا۔ پھر وہ دور آیا کہ ایک روز جب بیٹے کی شادی کی تقریبات عروج پر تھیں، تو ملک سکندر خان

اچانک دنیا سے منہ موڑ گیا۔ چالیس روز تک صفِ ماتم بچھی رہی اور چہلم کے بعد اس کے دونوں بیٹے شہر لوٹ گئے۔ اب یہاں رونقیں کم ہونے لگیں۔

ملک میں آزادی کی لہر اٹھی، تو جمال کوٹ میں بھی اس کی آواز سنائی دینے لگی۔ ملک بھر میں قائدِ اعظمؒ، گاندھی اور نہرو کا نام گونجنے لگا۔ علامہ اقبالؒ اور ظفر علی خان کی نظمیں آزادی کی تڑپ پیدا کرتیں اور جگہ جگہ جلسے جلوس ہونے لگے تھے۔ اب عزت خان اور عظمت خان نے جاگیر کا کچھ حصہ بیچ دیا تھا۔ وہ دوستوں کو لے کر شکار کے لیے آتے، تو میرے ہاں رونق میلہ ہو جاتا، ورنہ ان کے مزارع اور نوکر چاکر ہی یہاں رہتے۔ میری حالت خستہ ہونے لگی؛ دریا کی سیلن میری دیواروں کو کمزور کر رہی تھی اور سیلاب نے تو میرے کئی حصوں کو تباہ کر ڈالا تھا۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ میرے سامنے ملک سکندر خان کی تیسری نسل کی جوانیاں ڈھلنے لگی تھیں، مگر اب ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے رفعت خان اور شمروز خان مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے اور واپسی پر ڈگری کے ساتھ ایک ایک میم بھی لے آئے۔ ان کی فیکٹریاں شاید سونا اگلنے لگی تھیں۔ جب کبھی زمینوں کے چکر لگاتے، تو ان کے پاس نئے نئے ماڈل کی گاڑیاں ہوتیں اور سکندر خان کے زمانے میں زنان خانے کے اوپر سے پرندے بھی نہ گزرتے تھے۔ خواتین مردوں کے سامنے کبھی نہ آتی تھیں، اب ان کی چوتھی نسل مخلوط پارٹیوں کی دلدادہ تھی۔ ایسے ایسے لباس میں مرد و زن آتے کہ میرے لیے تو ان کی تمیز مشکل ہو جاتی۔ اب نوکر چاکر بھی مجھے کھنڈر ہوتا دیکھ کر یہاں سے اٹھ گئے تھے اور میں ایک ویرانے کا روپ لیے وقت کے قدموں کی چاپ سنے جا رہی تھی۔

۱۹۷۶ء میں تین روز بارشوں نے اور پھر ایک زلزلے نے مجھے زمین بوس کر دیا۔ اب ایک آدھ کمرے کی آدھی چھت اور دو دیواریں باقی ہیں اور دیگر سب کچھ کھنڈر بن چکا ہے۔ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی اور کمال کو زوال آتے احساس تک نہیں ہوتا۔ کل جن چھتوں سے فانوس لٹکتے تھے، وہ چھت زمین کا حصہ ہو چکی اور جو باقی ہے، وہاں فانوسوں کی جگہ چمگادڑیں لٹکتی ہیں۔ اب یہاں کبھی کبھار ڈاکو یا جرائم پیشہ لوگ کچھ وقت گزارتے ہیں؛ کبھی کوئی الو یا چیل آ بیٹھتی ہے؛ رات کو میں گیدڑوں کی آوازیں سنتی ہوں۔

کبھی کبھار آثارِ قدیمہ والے آ دھمکتے ہیں اور میری اینٹوں اور خاک کے نمونے لے جاتے ہیں؛ کبھی کبھی سیاحوں کی ٹولیاں آ جاتی ہیں اور فوٹو بنا کر مجھے میرا ماضی یاد دلاتی اور میرے زخموں کو ہرا کر دیتی ہیں۔ آپ کی طرح وہ بھی میری آواز نہیں سن پاتے، ورنہ ان سے کہوں کہ:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

شاید چند سال اور لگیں۔ دریا کا ایک آدھ ریلا آیا، تو میں کیا اور میرے آثار کیا؟ سب اسی دریا کا حصہ ہو جائیں گے۔ یہ سیاح، مؤرخ اور آثارِ قدیمہ والے بہت دفعہ آئے اور میرے آثار کی کڑیاں: تہذیب کے مختلف ادوار سے جا ملائیں، حالانکہ میں تہذیب کا مدفن ہوں۔ لوگوں کے لیے میرا زوال باعثِ تفریح نہیں، بلکہ عبرت انگیز۔ ،۔ میرے پاس بیٹھ کر ایک شاعر نے بڑی خوب صورت بات کی:

اجڑا سا وہ نگر کہ ہڑپہ ہے جس کا نام
اس قریۂ شکستہ و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹا تک برآمد نہ ہو سکی
کچھ نقل پڑا ہے منوں کے حساب سے

[نمونہ تحریر: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی]

۳.۵ گلاب کے پھول کی آپ بیتی:

میں ہوں پھولوں کا بادشاہ، گلاب کا ایک پھول۔ مشک عطار کے کہنے سے نہیں، اپنی خوشبو سے خود کو تسلیم کراتی ہے۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن رہا، بلکہ میں نے خود اپنے کانوں سے لوگوں کو اپنی تعریف میں رطب اللسان پایا ہے؛ ادب میرے تذکروں سے بھرا پڑا ہے۔ شاعروں نے خاص طور پر مجھے جس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ آخر بلبل ایسے تو نہیں مرمٹی۔ حکما اور علم نباتات کے ماہرین نے الگ سے میری تعریف و توصیف کی ہے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے بھی میری تحسین کی اور کہا کہ: گلاب کو جس نام سے پکارو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ یہ سن کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ میں مسرتوں سے اور عقیدوں کے اظہار کا ذریعہ ہوں۔ دولھا کے سر کا سہرا مجھی سے سجتا ہے اور بزرگوں کے مزاروں پر میری ہی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ جب سے ویلنٹائن ڈے منایا جانے لگا ہے، تو میں تحفہ بن کو دلی جذبات کا ترجمان بننے لگا ہوں۔ میں دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں پایا جاتا ہوں۔ میری سیکڑوں قسمیں ہیں۔ میں حسین ہوں اور حسینوں کی پسند بھی۔ میں اپنی مختصر سی زندگی کی کتھا سناتا ہوں، جس کے کئی پہلو خوش کن ہیں اور کچھ عبرت انگیز بھی۔

موسمِ بہار کی ایک چمکیلی صبح کو میں نے ایک کالج کے چمن زار میں آنکھ کھولی اور سبز پتیوں سے نکل کر ماحول کا جائزہ لیا، تو نئی دنیا مجھے بہت حسین لگی۔ میرے اردگرد گلاب کے بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ بلاشبہ مجھ سے زیادہ

حسین تھے کہ پورے جوبن پر تھے اور میں نے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھا تھا۔ ہوا کے شریر جھونکے ہم سب سے اٹھکیلیاں کرتے رہے۔ ایک جھونکا آیا اور مجھے گدگدایا اور میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اتنے میں لڑکیوں کا ایک غول آیا اور قریب کے چبوترے پر بیٹھ کر خوشگوار ماحول سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ایک لڑکی نے جو دوسری لڑکیوں میں زیادہ نمایاں تھی اسے یہ کہہ کر چھیڑا کہ تم بھی گلِ سرسبد کہلاتی ہو؟ مگر اس پھول کو دیکھ کہ کتنا حسین ہے؟ غزالہ نے شرما کر سر جھکا لیا اور میں اس کی رنگت میں گلاب ہی کے رنگ دیکھ رہا تھا۔ یہ مہذب لڑکیوں کا گروہ تھا وہ کچھ دیر بیٹھ کر ایک دوسری سے ٹھٹھا مذاق کرتی اور قہقہے لگاتی رہیں۔ میں حسن کے دونوں روپ آمنے سامنے دیکھتا رہا؛ مسکراتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کوئی پھول توڑے بغیر چل دیں۔

موسم خوشگوار تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سورج کی حیات بخش کرنوں میں تمازت تو تھی، لیکن گوارا؛ بلکہ وہ ہمیں اور توانا کرتی۔ رات کو شبنم ہمیں غسل کراتی، تو ہماری نرم و نازک پتیاں کٹوریوں سے رس چوستی پھرتی تھیں؛ کچھ بھونرے بھی آموجود ہوتے؛ بلبلیں آتیں اور ہمیں گیت سناتیں اور ہماری بے وفائی پر گلے شکوے بھی کرتیں؛ ان کی شاعرانہ باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر تھیں۔

دو دن تو خوب مزے سے گزرے، اچانک شمال سے تیز ہوائیں چلنے لگیں اور بادل گھرے ہونے لگے؛ پھر بارش برسنے لگی۔ پورا باغ خوشبو سے مہک اٹھا۔ اب میں پورے جوبن پر تھا اور اگر آپ مجھے اپنے منہ میاں مٹھو کا طعنہ نہ دیں، تو آپ کو بتاؤں کہ بارش نے میرے سبز زرد پتیوں کو بکھیر دیا تھا، جب کہ میری پنکھڑیوں پر نکھار سا آگیا تھا۔ اب تتلیوں اور بھونروں کا مرکز نگاہ میں ہی تھا۔ میں بارش کے پانی میں اپنے آپ کو دیکھتا، تو میرا چہرہ اور گلاب ہو جاتا۔ مجھے اپنے تکبر سے خوف بھی آنے لگا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ تیسرے دن گھنٹی بجنے سے ذرا پہلے مالی چمن میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے ظالم سماج والی بات یاد آئی، تو ایک دن پہلے ساتھ والے پھول نے بتائی تھی اور وہ خود بھی مالی کے ستم کا نشانہ بن گیا۔ مالی نے سب سے پہلے مجھی پر ہاتھ صاف کیا۔ اس نے بے دردی سے کچھ اور پھول چنے اور ہم ساتھیوں سے جدا کر دیے گئے۔ سارے حسن و غرور کے باوجود ہم بے بس ہو کر رہ گئے۔ مالی نے گلدستہ بنا کر ایک خوب صورت سے گلدان میں سجا کر پرنسپل کی میز کی زینت بنا دیا۔ اب نہ اٹھکیلیاں کرتی سورج کی کرنیں تھیں اور نہ گدگداتی ہوائیں اور نہ تتلیوں اور بھونروں کا ہجوم، البتہ ہم نے سٹاف ممبران اور پرنسپل کے حالاتِ حاضرہ پر تبصرے سنیے، تو اندازہ ہوا کہ بظاہر بڑے بڑے گریڈوں کے یہ لوگ بھی مہنگائی اور حالات کے ہاتھوں کتنے پریشان ہیں۔ ہم شاخ سے ٹوٹے، زندگی سے بیزار پھول پژمردہ ہونے لگے اور خوف

آگئی کہ ہماری حسن و رعنائی اور مہک بس چند گھڑیوں کی مہمان ہے۔ یہ خیال ہمیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔

اب میں زندگی کے آخری سانس لے رہا ہوں۔ حسن کا یہ انجام اور دنیا میں ہر شے کی یہ بے ثباتی بڑی عبرت انگیز ہے۔ میری اس داستان سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ: ہر کمال کا مقدر اور انجام زوال ہے۔

ایک پھٹے پرانے جوتے کی آپ بیتی: (خاکہ)

ایک خستہ حال پھٹا پرانا جوتا۔۔۔۔۔۔۔ہر کوئی نفیر اور بے زار۔۔۔مگر ماضی شاندار، ایک خوش رنگ بیل کی قربانی کی کھال۔۔۔۔۔کھال ٹرکوں میں شہر۔۔۔۔۔نمک لگا کر گودام میں۔۔۔۔۔پھر گجرات لایا گیا۔۔۔۔۔جوتا ساز کارخانے دار نے خریدا۔۔۔۔۔۔کانٹ چھانٹ کر۔۔۔۔۔مشینوں سے گزارا۔۔۔۔۔درد سے بلبلاتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔خوب صورت ڈبوں میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔لاہور انارکلی بازار کا شوکیش۔۔۔۔۔۔نظارے۔۔۔پھر ایک صاحبِ ذوق کے پاؤں کی زینت۔۔۔۔۔اترایا۔۔۔۔۔۔پالش سے لشکایا۔۔۔۔۔ہر کوئی تعریف۔۔۔۔۔اب پرانا۔۔۔۔ایک فقیر کو زندگی۔۔۔۔چند دن بعد اس نے ڈھیر پر پھینک۔۔۔۔۔۔حسن کا انجام

۴۔ مضمون نگاری

۴.۱ مضمون کیا ہے؟

مضمون علم و ادب کی ایک ایسی صنف ہے، جس میں مضموں نگار اپنے افکار و خیالات اور جذبات کے علاوہ مختلف النوع موضوعات پر معلومات قارئین تک پہنچاتا ہے۔ ان موضوعات کا تعلق زندگی کے حقائق اور مسائل سے ہوتا ہے اور ایک مؤثر مضمون کے۔لیے ضروری ہے کہ مضمون نگار کا اسلوب دلکش، زوردار، شگفتہ ہو اور مضمون پُر مغز ہو۔

یہ ضروری ہے کہ مضمون میں خیالات کو ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے پیش کیا جائے اور مضمون نگار قوتِ اظہار و بیان رکھتا ہو۔ محض معلومات کا بیان یا تحریر مضمون نہیں کہلاتا، بلکہ مافی الضمیر کا دلکش پیرائے میں اظہار ہی مضمون نگاری ہے۔

۴.۲ مضمون نویسی کے لوازمات:

۱۔ **وسیع مطالعہ**: مضمون نگاری ایک فن ہے اور فن سیکھنے کے لوازمات میں وسیع مطالعہ خصوصاً اچھے مضمون نگاروں کے مضامین کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اس سے ان اصولوں اور طریقوں کا انداز ہوتا ہے، جو مضمون نویسی کا لازمہ ہیں۔ معلومات میں اضافہ اور فکر و نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے، بلکہ بلند پایہ ادیبوں کی تحریریں رہنمائی کا کام دیتی ہیں۔

۲۔ **مشاہدہ** : دنیا کی موجودات اور حیاتِ انسانی کا گہرا مشاہدہ مضمون نویسی میں ممد و معاوں ہوتا ہے۔ یہ دراصل براہِ راست معلومات کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔

۳۔ **غور و فکر کی عادت**: کسی فن میں عمق حاصل کرنے کے لیے غور و فکر کی عادت اہمیت رکھتی ہے۔ تفکر و تدبر سے مسائل کے اسباب کا پتا چلتا ہے اور مسائل کے حل کا سلیقہ ہاتھ آتا ہے۔

۴۔ **انسانی نفسیات کا مطالعہ**: ایک ادیب کی تحریر اگر دوسرے سے زیادہ پسند کی جاتی ہے، تو اس کی ایک وجہ انسانی فطرت اور نفسیات کا گہرا مطالعہ ہے اور یہ بات مضمون نویسی میں مفید ہوتی ہے۔

۵۔ **مشق**: آپ بیتی ہو، روداد نویسی یا مضمون نگاری۔ وسعتِ مطالعہ اور مشاہدہ کائنات اور انسانی نفسیات کے

ادراک کے باوجود یہ سب کچھ رائیگاں رہتا ہے، جب تک کہ مسلسل تحریری مشق نہ کی جائے۔ مشق سے تحریر میں پختگی آتی ہے۔

۴.۳ مضمون کے حصے:

ہر مضمون تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ **تمہید / آغاز:** مضمون کے اس حصے میں موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ یہ حصہ مختصر اور دلکش ہونا چاہیے۔ اگر مضمون ذرا طویل ہو، تو ابتدائیہ دو یا تین پیراگرف پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

۲۔ **نفسِ مضمون:** اس حصے میں مضمون نگار اپنے افکار و جذبات کا مربوط انداز میں اظہار کرتا ہے۔ یہ حصہ قدرے طویل ہوتا ہے۔ مضمون کی عمدگی کا انحصار اسی حصے پر ہے۔

۳۔ **اختتام / انجام:** چند اختتامی جملوں سے مضمون ختم کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل مضمون کا ماحصل اور نچوڑ ہوتا ہے۔ دلکش انداز میں خاتمہ تا دیر قاری کے ذہین پر اثر قائم رکھتا ہے۔

۴.۴ مضمون کیسے لکھا جائے؟

مضمون کی بہت سی اقسام ہیں: تعلیمی، علمی و ادبی، سائنسی، تاریخی، فنی وغیرہ اسی طرح نفسِ مضمون کے حوالے سے کچھ اور اقسام بھی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مضمون کیسے لکھا جائے؟

جس موضوع پر مضمون لکھنا مقصود ہو، اس پر غور و فکر کر لیا جائے اور عنوان کی پیچیدگیوں کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔ ذہن میں ایک نقشہ بٹھا لیا جائے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کچھ لکھنا ہے۔

۱۔ غور و فکر کے بعد ایک خاکہ بنایا جائے اور کسی صفحے پر مختصر ارشارات لکھ کر انھیں ترتیب دے دیا جائے۔ آغاز کیا ہو اور نفسِ مضمون میں کیا کچھ لکھا جائے اور خاتمہ کن الفاظ میں زیادہ موثر ہوگا؟ یہ طے کر لیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے آیات، احادیث اور اقوال بھی نوٹس میں لکھ لیے جائیں۔

۲۔ مضمون کی ابتدا دلکش پیرائے میں کی جائے، تاکہ یہ قاری کو آغاز ہی سے اپنی گرفت میں لے لے۔

۳۔ ابتدائیے کے بعد ایک منطقی ترتیب سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے۔ موضوع کے مطابق: اشعار، ضرب الامثال اور محاورات کا استعمال کیا جائے، لیکن زبان کو ثقیل نہ بنایا جائے، بلکہ سادہ زبان استعمال کی جائے۔ جملے مختصر ہوں اور عبارت بھی سادہ رہے۔

۴۔ تکرار سے گریز کیا جائے۔

۵۔ انگریزی یا دوسری زبانوں کے الفاظ کم سے کم اور صرف ناگزیر صورت میں استعمال کریں۔

۶۔ صحتِ زبان کا خیال رکھا جائے۔

۷۔ اختتامیہ پُرکشش ہو۔

۸۔ آخر میں مضمون کو ایک دفعہ پڑھ لیا جائے اور غلطیوں کو درست کر لیا جائے۔

۴.۵ اچھے مضمون کی خوبیاں:

۱۔ اچھا مضمون دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی زبان سادہ و سلیس ہوتی ہے۔

۳۔ ترتیب اور تسلسل اس کی اہم خوبی ہوتی ہے۔

۴۔ جامعیت اور اختصار مضمون کی جان ہوتی ہے۔

۵۔ اعتدال و توازن مضمون کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

۴.۶ چند اہم مضامین کے خاکے:

انٹرمیڈیٹ کی سطح کے لیے مضامین میں: مشاہیر، ریفارمر، علمی و ادبی شخصیات، قابلِ دید مقامات کی سیر، ایجادات اور ملک و ملت سے متعلق موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کا نفسِ مضمون آغاز و انجام ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ کو اچھا مضمون لکھنے کے لیے وسیع معلومات اور مطالعے کی ضرورت ہوگی۔ آپ کی رہنمائی کے لیے ذیل میں چند خاکے دیے جا رہے ہیں:

میرا پسندیدہ شاعر:

سخن فہمی اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ------ وسیع مطالعۂ شعر --- قدیم و جدید شاعری ------ اقبال اپنے کلام کی خوبیوں کی وجہ سے میرا پسندیدہ شاعر

سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء ------ والدین متقی ----- ابتدائی تعلیم و تربیت مولوی میر حسن ----- گورنمنٹ کالج لاہور میں ------- مشاعروں میں شرکت ------ فطری موزونیِ طبع ------ شاعری کا بامقصد

ہونا ---------تخیل کی بلند پروازی ---------خودی کا مفہوم ----اقبال کا شاہین
-------شعر میں اسلامی جذبے کا سمونا---------حسنِ اخلاق ، فقراور استغنا کی تلقین -------عملی
جدوجہد ----امتِ مسلمہ کے دکھوں کا ادراک -------مغربی تہذیب پر تنقید ------تصورِ پاکستان
----جدوجہد کے لیے شاعری بانگِ درا----فارسی شاعری----مجموعہ ہائے کلام ----نوجوانوں کے لیے
اپیل۔

ان کی شاعری بے مثال اور لافانی -------شاعرِ فردا----ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں بسنے
والے شاعر----شاہی مسجد کے باہر آسودۂ خاک۔

قومی زندگی میں نظم وضبط کی اہمیت:

نظامِ کائنات اٹل قوانین اور نظم وضبط کا پابند----کائنات میں نظامِ شمسی یا دیگر نظم وضبط پر عمل کرنے والے
عناصر نظام سے ہٹیں، تو کائنات کی تباہی----

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کی آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

انسان کی زندگی میں نظم و ضبط اہم ----خالقِ کائنات کے دیے ضابطے ہی زندگی کے لیے فائدہ
مند------نظم و ضبط خوشگوار زندگی کا لازمہ ----اطاعت کی اہمیت ------نظم و ضبط سے تسخیر
------نظم وضبط سے بغاوت تباہی -------دفاعی اداروں میں نظم وضبط ------احکاماتِ اسلام میں نظم و
ضبط کی پابندی کی تلقین -----نماز، روزہ، حج ،نظم وضبط اور عمدہ زندگی کی مثالیں-------جنگِ بدر اور جنگِ احد
میں نظم وضبط کی اہمیت ------نظم وضبط ترقی کا زینہ -------ہماری مشکلات کا حل ------شائستگی کا مظہر
------مہذب اور خوشگوار زندگی کا لازمہ۔

اصلاح معاشرہ میں خواتین کا کردار:

عورت انسانی تہذیب میں بلند مقام ------اللہ تعالیٰ کا دیا بلند درجہ اس کے بغیر ترقی کا تصور بے معنی۔
عورت کے مقام و مرتبے سے ناواقفیت ----تباہی ----عورت کا مقام: خدا اور رسولؐ کے فرمودات کی
روشنی میں ------ماں کی گود پہلا مکتب ----قوموں کی ترقی میں تربیت کا حصہ------بحیثیت ماں ترقی کی

ضامن ۔۔۔۔۔۔اخلاقی تربیت، نشو ونما اور شائستہ ومہذب بنانے میں کردار۔۔۔۔۔۔مختلف معاشروں میں عورتوں کا تاریخی کردار محبت ، رحم ، حلیمی طبع ، ایثار اور شفقت جیسی خوبیاں ۔۔۔۔۔۔۔وقت پڑنے پر اہم کردار ۔۔۔۔کفایت شعاری اور گھر۔۔۔۔۔۔۔۔اصلاح معاشرہ اس کے بغیر ناممکن ۔۔۔۔۔۔۔عورت کا معاشرتی کردار روشن مستقبل کی ضمانت۔

کمپیوٹر۔۔۔۔۔۔اکیسویں صدی میں اہمیت:

ایجادات: انسان کی اختراعی قوتوں کا اظہار ۔۔۔۔۔۔۔راحت اور سکون ماضی کی ایجادات اور آج کا دور۔۔۔۔۔۔۔انقلاب انگیز چیز۔

کمپیوٹر اہم ترین ایجاد ۔۔۔۔۔کمپیوٹر کیا ہے ؟۔۔۔۔۔کمپیوٹر کی زبان۔۔۔۔۔۔۔۔۔علمی دنیا میں انقلاب ۔۔۔۔۔سہولت ۔۔۔۔۔۔۔وقت کی بچت ۔۔۔۔۔کاروباری دنیا میں انقلاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔تعلیمی پیش رفت ۔۔۔۔۔۔مزے کی تفریح ۔۔۔۔۔۔بہت سی خوبیاں یک جا ۔۔۔۔۔۔ جدید ترین کمپیوٹر مختصر اور جامع۔۔۔۔

احتیاط کی ضرورت ۔۔۔۔۔۔۔نازک اور حساس آلہ جو بہت زیادہ احتیاط کا طالب ہے۔۔۔۔۔ صرف مثبت کام لیا جائے۔

اہم موضوعات:

- ☆ پاکستان کیسے ترقی کر سکتا ہے؟
- ☆ ہمارا نظامِ تعلیم
- ☆ میری پسندیدہ کتاب
- ☆ میرا پسندیدہ مزاح نگار
- ☆ قومی زبان کی اہمیت
- ☆ وقت کی قدر و قیمت
- ☆ میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ

☆ ایک تاریخی مقام کی سیر

☆ سائنس کی ایجادات

☆ آج کے دور میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت

خود آزمائی

ا۔ مختصر جواب دیں۔

الف۔ علم بدیع کی تعریف کریں۔

ب۔ علم بدیع کی کتنی اقسام ہیں؟

ج۔ صنعت حسن تعلیں سے کیا مراد ہے؟

د۔ صنعتِ مبالغہ کی تعریف کریں اور مثالیں بھی دیں۔

ہ۔ رموزِ اوقات سے کیا مراد ہے؟

و۔ مندرجہ ذیل کی تعریف کریں اور ان کی علامت بھی لکھیں۔

واوین، سکتہ، وقفہ، ختمہ

۲۔ ایک پرانے کوٹ کی آپ بیتی لکھیں۔

۳۔ ایک پرندے کی آپ بیتی لکھیں۔

۴۔ مندرجہ ذیل عنوانات پر مضمون لکھیں۔

ا۔ نظریہ پاکستان

۲۔ تحریک پاکستان

۳۔ نشانِ حیدر

۴۔ کسی تاریخی مقام کی سیر

۵۔ اردو ہماری قومی زبان

آ نے لگا کہ ہماری حسن و رعنائی اور مہک بس چند گھڑیوں کی مہمان ہے۔ یہ خیال ہمیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔

اب میں زندگی کے آخری سانس لے رہا ہوں۔ حسن کا یہ انجام اور دنیا میں ہر شے کی یہ بے ثباتی بڑی عبرت انگیز ہے۔ میری اس داستان سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ: ہر کمال کا مقدر اور انجام زوال ہے۔

ایک پھٹے پرانے جوتے کی آپ بیتی: (خاکہ)

ایک خستہ حال پھٹا پرانا جوتا۔۔۔۔۔۔۔ ہر کوئی نفیر اور بے زار۔۔۔۔ مگر ماضی شاندار، ایک خوش رنگ بیل کی قربانی کی کھال ۔۔۔۔۔ کھال ٹرکوں میں شہر ۔۔۔۔۔ نمک لگا کر گودام میں۔۔۔۔۔ پھر گجرات لایا گیا ۔۔۔۔۔ جوتا ساز کارخانے دار نے خریدا۔۔۔۔۔۔ کانٹ چھانٹ کر۔۔۔۔۔ مشینوں سے گزارا ۔۔۔۔۔ درد سے بلبلاتے۔۔۔۔۔۔۔۔ خوب صورت ڈبوں میں۔۔۔۔۔۔۔۔ لاہور انارکلی بازار کا شوکیش۔۔۔۔۔۔ نظارے ۔۔۔۔ پھر ایک صاحبِ ذوق کے پاؤں کی زینت ۔۔۔۔۔۔ اترایا۔۔۔۔۔۔ پالش سے لشکایا۔۔۔۔۔۔ ہر کوئی تعریف۔۔۔۔۔۔ اب پرانا۔۔۔۔۔ ایک فقیر کو زندگی ۔۔۔۔ چند دن بعد اس نے ڈھیر پر پھینک۔۔۔۔۔۔ حسن کا انجام

۴۔ مضمون نگاری

۴.۱ مضمون کیا ہے؟

مضمون علم و ادب کی ایک ایسی صنف ہے، جس میں مضموں نگار اپنے افکار و خیالات اور جذبات کے علاوہ مختلف النوع موضوعات پر معلومات قارئین تک پہنچاتا ہے۔ ان موضوعات کا تعلق زندگی کے حقائق اور مسائل سے ہوتا ہے اور ایک مؤثر مضمون کے لیے ضروری ہے کہ مضمون نگار کا اسلوب دلکش، زوردار، شگفتہ ہو اور مضمون پُر مغز ہو۔

یہ ضروری ہے کہ مضمون میں خیالات کو ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے پیش کیا جائے اور مضمون نگار قوتِ اظہار و بیان رکھتا ہو۔ محض معلومات کا بیان یا تحریر مضمون نہیں کہلاتا، بلکہ مافی الضمیر کا دلکش پیرائے میں اظہار ہی مضمون نگاری ہے۔

۴.۲ مضمون نویسی کے لوازمات:

۱۔ **وسیع مطالعہ:** مضمون نگاری ایک فن ہے اور فن سیکھنے کے لوازمات میں وسیع مطالعہ خصوصاً اچھے مضمون نگاروں کے مضامین کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اس سے ان اصولوں اور طریقوں کا انداز ہوتا ہے، جو مضمون نویسی کا لازمہ ہیں۔ معلومات میں اضافہ اور فکر و نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے، بلکہ بلند پایہ ادیبوں کی تحریریں رہنمائی کا کام دیتی ہیں۔

۲۔ **مشاہدہ:** دنیا کی موجودات اور حیاتِ انسانی کا گہرا مشاہدہ مضمون نویسی میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ یہ دراصل براہِ راست معلومات کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔

۳۔ **غور و فکر کی عادت:** کسی فن میں عمق حاصل کرنے کے لیے غور و فکر کی عادت اہمیت رکھتی ہے۔ تفکر و تدبر سے مسائل کے اسباب کا پتا چلتا ہے اور مسائل کے حل کا سلیقہ ہاتھ آتا ہے۔

۴۔ **انسانی نفسیات کا مطالعہ:** ایک ادیب کی تحریر اگر دوسرے سے زیادہ پسند کی جاتی ہے، تو اس کی ایک وجہ انسانی فطرت اور نفسیات کا گہرا مطالعہ ہے اور یہ بات مضمون نویسی میں مفید ہوتی ہے۔

۵۔ **مشق:** آپ بیتی ہو، روداد نویسی یا مضمون نگاری۔ وسعتِ مطالعہ اور مشاہدہ کائنات اور انسانی نفسیات کے

ادراک کے باوجود یہ سب کچھ رائیگاں رہتا ہے، جب تک کہ مسلسل تحریری مشق نہ کی جائے۔ مشق سے تحریر میں پختگی آتی ہے۔

۴.۳ مضمون کے حصے:

ہر مضمون تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ **تمہید / آغاز:** مضمون کے اس حصے میں موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ یہ حصہ مختصر اور دلکش ہونا چاہیے۔ اگر مضمون ذرا طویل ہو، تو ابتدائیہ دو یا تین پیراگرف پر مشتمل ہوسکتا ہے۔

۲۔ **نفسِ مضمون:** اس حصے میں مضمون نگار اپنے افکار و جذبات کا مربوط انداز میں اظہار کرتا ہے۔ یہ حصہ قدرے طویل ہوتا ہے۔ مضمون کی عمدگی کا انحصار اسی حصے پر ہے۔

۳۔ **اختتام / انجام:** چند اختتامی جملوں سے مضمون ختم کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل مضمون کا ماحصل اور نچوڑ ہوتا ہے۔ دلکش انداز میں خاتمہ تادیر قاری کے ذہین پر اثر قائم رکھتا ہے۔

۴.۴ مضمون کیسے لکھا جائے؟

مضمون کی بہت سی اقسام ہیں: تعلیمی، علمی و ادبی، سائنسی، تاریخی، فنی وغیرہ اسی طرح نفسِ مضمون کے حوالے سے کچھ اور اقسام بھی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مضمون کیسے لکھا جائے؟

جس موضوع پر مضمون لکھنا مقصود ہو، اس پر غور وفکر کر لیا جائے اور عنوان کی پیچیدگیوں کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔ ذہن میں ایک نقشہ بٹھا لیا جائے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کچھ لکھنا ہے۔

۱۔ غور وفکر کے بعد ایک خاکہ بنایا جائے اور کسی صفحے پر مختصر اشارات لکھ کر انھیں ترتیب دے دیا جائے۔ آغاز کیا ہو اور نفسِ مضمون میں کیا کچھ لکھا جائے اور خاتمہ کن الفاظ میں زیادہ موثر ہوگا؟ یہ طے کر لیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے آیات، احادیث اور اقوال بھی نوٹس میں لکھ لیے جائیں۔

۲۔ مضمون کی ابتدا دلکش پیرائے میں کی جائے، تا کہ یہ قاری کو آغاز ہی سے اپنی گرفت میں لے لے۔

۳۔ ابتدائیے کے بعد ایک منطقی ترتیب سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے۔ موضوع کے مطابق: اشعار، ضرب الامثال اور محاورات کا استعمال کیا جائے، لیکن زبان کو ثقیل نہ بنایا جائے، بلکہ سادہ زبان استعمال کی جائے۔ جملے مختصر ہوں اور عبارت بھی سادہ رہے۔

۴۔ تکرار سے گریز کیا جائے۔
۵۔ انگریزی یا دوسری زبانوں کے الفاظ کم سے کم اور صرف ناگزیر صورت میں استعمال کریں۔
۶۔ صحتِ زبان کا خیال رکھا جائے۔
۷۔ اختتامیہ پُرکشش ہو۔
۸۔ آخر میں مضمون کو ایک دفعہ پڑھ لیا جائے اور غلطیوں کو درست کر لیا جائے۔

۴.۵ اچھے مضمون کی خوبیاں:

۱۔ اچھا مضمون دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے۔
۲۔ اس کی زبان سادہ و سلیس ہوتی ہے۔
۳۔ ترتیب اور تسلسل اس کی اہم خوبی ہوتی ہے۔
۴۔ جامعیت اور اختصار مضمون کی جان ہوتی ہے۔
۵۔ اعتدال و توازن مضمون کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

۴.۶ چند اہم مضامین کے خاکے:

انٹرمیڈیٹ کی سطح کے لیے مضامین میں: مشاہیر، ریفارمر، علمی و ادبی شخصیات، قابلِ دید مقامات کی سیر، ایجادات اور ملک و ملت سے متعلق موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کا نفسِ مضمون آغاز و انجام ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ کو اچھا مضمون لکھنے کے لیے وسیع معلومات اور مطالعے کی ضرورت ہوگی۔ آپ کی رہنمائی کے لیے ذیل میں چند خاکے دیے جا رہے ہیں:

میرا پسندیدہ شاعر:

سخن فہمی اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ------وسیع مطالعۂ شعر---قدیم و جدید شاعری ------اقبال اپنے کلام کی خوبیوں کی وجہ سے میرا پسندیدہ شاعر

سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء------والدین متقی -----ابتدائی تعلیم و تربیت مولوی میر حسن----- گورنمنٹ کالج لاہور میں-------مشاعروں میں شرکت-----فطری موزونیِ طبع------شاعری کا بامقصد

ہونا ---------تخیل کی بلند پروازی --------خودی کا مفہوم ----اقبال کا شاہین ------شعر میں اسلامی جذبے کا سمونا--------حسنِ اخلاق ، فقر اور استغنا کی تلقین ------عملی جدوجہد ----امتِ مسلمہ کے دکھوں کا ادراک -------مغربی تہذیب پر تنقید -----تصورِ پاکستان ----جدوجہد کے لیے شاعری بانگِ درا----فارسی شاعری----مجموعہ ہائے کلام ----نوجوانوں کے لیے اپیل۔

ان کی شاعری بے مثال اور لافانی ------شاعرِ فردا-----ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں بسنے والے شاعر-----شاہی مسجد کے باہر آسودۂ خاک۔

قومی زندگی میں نظم وضبط کی اہمیت:

نظامِ کائنات اٹل قوانین اور نظم وضبط کا پابند-----کائنات میں نظامِ شمسی یا دیگر نظم وضبط پر عمل کرنے والے عناصر نظام سے ہٹیں، تو کائنات کی تباہی----

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کی آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

انسان کی زندگی میں نظم و ضبط اہم ----خالقِ کائنات کے دیے ضابطے ہی زندگی کے لیے فائدہ مند------نظم و ضبط خوشگوار زندگی کا لازمہ -----اطاعت کی اہمیت ------نظم و ضبط سے تسخیر ------نظم وضبط سے بغاوت تباہی-------دفاعی اداروں میں نظم وضبط-----احکاماتِ اسلام میں نظم و ضبط کی پابندی کی تلقین-----نماز، روزہ، حج ،نظم وضبط اور عمدہ زندگی کی مثالیں-------جنگِ بدر اور جنگِ احد میں نظم وضبط کی اہمیت-----نظم وضبط ترقی کا زینہ------ہماری مشکلات کا حل-----شائستگی کا مظہر ------مہذب اور خوشگوار زندگی کا لازمہ۔

اصلاح معاشرہ میں خواتین کا کردار:

عورت انسانی تہذیب میں بلند مقام------اللہ تعالیٰ کا دیا بلند درجہ اس کے بغیر ترقی کا تصور بے معنی۔ عورت کے مقام و مرتبے سے ناواقفیت ----تباہی ----عورت کا مقام: خدا اور رسولؐ کے فرمودات کی روشنی میں -----ماں کی گود پہلا مکتب ----قوموں کی ترقی میں تربیت کا حصہ------بحیثیت ماں ترقی کی

ضامن ۔۔۔۔۔۔اخلاقی تربیت، نشو ونما اور شائستہ ومہذب بنانے میں کردار۔۔۔۔۔۔مختلف معاشروں میں عورتوں کا تاریخی کردار محبت ، رحم، حلیمی طبع ، ایثار اور شفقت جیسی خوبیاں ۔۔۔۔۔۔۔وقت پڑنے پر اہم کردار۔۔۔۔کفایت شعاری اور گھر۔۔۔۔۔۔۔اصلاح معاشرہ اس کے بغیر ناممکن ۔۔۔۔۔۔عورت کا معاشرتی کردار روشن مستقبل کی ضمانت۔

کمپیوٹر۔۔۔۔۔۔اکیسویں صدی میں اہمیت:

ایجادات: انسان کی اختراعی قوتوں کا اظہار ۔۔۔۔۔۔راحت اور سکون ماضی کی ایجادات اور آج کا دور۔۔۔۔۔۔۔انقلاب انگیز چیز۔

کمپیوٹر اہم ترین ایجاد ۔۔۔۔۔کمپیوٹر کیا ہے ؟۔۔۔۔۔کمپیوٹر کی زبان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علمی دنیا میں انقلاب۔۔۔۔۔۔سہولت ۔۔۔۔۔۔۔وقت کی بچت۔۔۔۔۔کاروباری دنیا میں انقلاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تعلیمی پیش رفت ۔۔۔۔۔۔مزے کی تفریح ۔۔۔۔۔۔بہت سی خوبیاں یک جا ۔۔۔۔۔۔ جدید ترین کمپیوٹر مختصر اور جامع۔۔۔۔۔

احتیاط کی ضرورت۔۔۔۔۔۔۔نازک اور حساس آلہ جو بہت زیادہ احتیاط کا طالب ہے۔۔۔۔۔۔ صرف مثبت کام لیا جائے۔

اہم موضوعات:

☆ پاکستان کیسے ترقی کرسکتا ہے؟

☆ ہمارا نظامِ تعلیم

☆ میری پسندیدہ کتاب

☆ میرا پسندیدہ مزاح نگار

☆ قومی زبان کی اہمیت

☆ وقت کی قدر و قیمت

☆ میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ

☆ ایک تاریخی مقام کی سیر

☆ سائنس کی ایجادات

☆ آج کے دور میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت

خود آزمائی

۱۔ مختصر جواب دیں۔

الف۔ علم بدیع کی تعریف کریں۔

ب۔ علم بدیع کی کتنی اقسام ہیں؟

ج۔ صنعت حسن تعلیل سے کیا مراد ہے؟

د۔ صنعتِ مبالغہ کی تعریف کریں اور مثالیں بھی دیں۔

ہ۔ رموزِ اوقات سے کیا مراد ہے؟

و۔ مندرجہ ذیل کی تعریف کریں اور ان کی علامت بھی لکھیں۔

واوین، سکتہ، وقفہ، ختمہ

۲۔ ایک پرانے کوٹ کی آپ بیتی لکھیں۔

۳۔ ایک پرندے کی آپ بیتی لکھیں۔

۴۔ مندرجہ ذیل عنوانات پر مضمون لکھیں۔

۱۔ نظریہ پاکستان

۲۔ تحریک پاکستان

۳۔ نشانِ حیدر

۴۔ کسی تاریخی مقام کی سیر

۵۔ اردو ہماری قومی زبان